جنوری 2026
ماہنامہ
کرن

کرن

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ
03172266944

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

حمد، محمود دراہی 7
نعت، بہزاد لکھنوی 7

بیادِ ابنِ انشاء

انشاء جی کے خطوط، رضیہ فصیح احمد 8

انٹرویو

نئے سال میں ہو نئی بات کوئی، شاہین رشید 10
بہو سے ساس تک، ماہا ملک 16

ناول

کوئے جاناں سے پرے، نگہت سیما 20
طائرِ آشیاں، منعم ملک 142

مکمل ناول

گنوا کر دل و جاں ہم، اُمِ طیفور 170
من دیپ، قرۃ العین خرم ہاشمی 52

ناولٹ

نخلِ وفا، فرح بخاری 104
زیتون بیگم، اُمِ ہانی 128

افسانے

سسرال سے آگے، نازنین فردوس 100
لاتول کے بھوت، شادیہ الطاف ہاشمی 168

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

سالِ نو مبارک

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) —— 1,600 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ —— 50000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

دسمبر کے اکتیس دن، تنزیلہ سعود چھینہ 45

گنجا آتش، نائلہ عبدالرحمن 125

کرن کتاب

بیوٹی باکس، ادارہ 196

کرن کا دسترخوان، ادارہ 197

ٹوٹکے، ادارہ 198

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو، شعاع عمیر 199

یادوں کے دریچے سے، بشریٰ محمود 202

موتی چننے ہیں، ادارہ 203

نامے میرے نام، مدیرہ کرن 204

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2026

جلد 47 شمارہ 10

قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

ایڈیٹر و پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

ایک اور سال ماضی کا حصہ بن گیا۔ ماضی جو کبھی نہیں مرتا...... کیونکہ اس کی بنیادوں پر ہمارا مستقبل استوار ہوتا ہے۔ ماضی ہمیں زندگی کے جو سبق دیتا ہے۔ وہ مستقبل کے لیے روشنی اور رہنمائی کا درجہ رکھتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ماضی کو بھلا کر آگے بڑھو...... جب تک پیچھے مڑ کر دیکھتے رہیں گے۔ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن ماضی کو یکسر بھلانا بھی درست نہیں...... ماضی میں جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کا ادراک کرنا بھی ضروری ہے اگر ہم ان غلطیوں کو جان کر ان سے سبق سیکھ لیں تو اپنا حال اور مستقبل بہتر بنا سکتے ہیں۔

عیسوی سال کے پہلے مہینے کا نام جرمن مائیتھالوجی کے دیوتا جانوس سے لیا گیا ہے۔ یہ دیوتا دو چہروں والا ہے اور دونوں چہرے مختلف سمتوں میں دیکھ رہے ہیں۔ دو مختلف سمتیں ماضی اور مستقبل کا استعارہ ہیں یعنی آپ ماضی اور مستقبل دونوں پر توجہ دیں۔ مستقبل کی پلاننگ کریں لیکن ماضی کے تجربات کو نہ بھولیں۔ ان کی روشنی میں آگے بڑھیں۔

پاکستان کے لیے 2025ء کئی حوالوں سے خوش کن ہے اگر چہ اس سال بھی دہشت گردی اور سیاسی بدامنی کے مسائل رہے لیکن قیمتوں میں استحکام آیا اور سب سے بڑی بات مئی کے مہینے نے ایک ایسی تاریخ رقم کی جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ مودی سرکار کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ بھارت کے طاقت ور ترین طیارے رافیل گرا کر پاک فضائیہ نے اپنی دھاک بٹھا دی اور دنیا نے جان لیا کہ پاکستان کوئی کمزور ملک نہیں ہے۔ پاک فوج کو عزت اور سر بلندی نصیب ہوئی۔

قارئین کو ہماری جانب سے نیا سال مبارک

اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے نیا سال ہم سب کے لیے ایک روشن صبح کی نوید لے کر آئے۔ آمین

اس شمارے میں

☆ ''نئے سال میں ہوئی بات کوئی'' شاہین رشید کا سروے ☆ مشہور مصنفہ ماہا ملک کا ''بہو سے ساس تک کا سفر''

☆ ''کوئے جاناں سے پرے'' نگہت سیما کا سلسلہ وار ناول ☆ منعم ملک کا نیا سلسلہ وار ناول ''طائر آشیاں''

☆ ''من دیپ'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول ☆ ام طیفور کا مکمل ناول ''گنوا کر دل و جاں ہم''

☆ ''زیتون بیگم'' ام ہانی کا ناول

☆ تفشالا سرور جھینہ، نازنین فردوس، شازیہ الطاف ہاشمی، نائلہ عبدالرحمٰن کے افسانے اور مستقل سلسلے

حمد باری تعالیٰ

رخِ ازل کو میسر اجال تجھ سے ہے
نگار خانے کا قائم جمال تجھ سے ہے

گماں کی حد سے گزرنے میں بھی کرم تیرا
مرے یقین کو حاصل کمال تجھ سے ہے

مرا وجود بھی تیری ہی رحمتوں کے تئیں
نفس نفس میں تسلسل بحال تجھ سے ہے

تیری عطا سے میسر نظر کو بیداری
شگفتہ پھول کی صورت خیال تجھ سے ہے

وہ برتری کی ادا ہو کہ کمتری کا سبب
مرا عروج بھی تجھ سے، زوال تجھ سے ہے

قضا و قدر کے مالک، اے منصف محشر!
جواب خود سے ہے لیکن سوال تجھ سے ہے

ترے حکم سے راہی میں بے خودی پیہم
ہر اک اذنِ سفر کا مآل تجھ سے ہے

محمود راہی

☆☆

نعت رسول مقبول ﷺ

تم ہو شہِ دوسرا، شاہِ عرب، شاہِ دیں
تم پہ دو عالم فدا، شاہِ عرب شاہِ دیں

تم پہ فدا ہر نظر، تم ہو شہ بحر و بر
تم ہو حبیبِ خدا، شاہِ عرب شاہِ دیں

تم ہو مری زندگی، تم ہو الم، تم خوشی
تم ہو مرا مدعا، شاہِ عرب شاہِ دیں

کیا میں کروں عرض حال آپ سے ہے کچھ سوال
کیجیے تو عطا شاہِ عرب شاہِ دیں

باعث ارض و سما، صاحب جود و سخا
مظہرِ ذات خدا شاہِ عرب شاہِ دیں

مرکزِ فکرِ فقیر، منبع نور بصیر
مقصدِ ہر اولیا شاہِ عرب شاہِ دیں

اس کی مٹیں مشکلیں، اس کو ملیں راحتیں
جس نے بھی یہ کہہ دیا شاہِ عرب شاہِ دیں

بہزاد لکھنوی

☆☆

انشاء جی کے خطوط

رضیہ فصیح احمد

ایک مرتبہ ہم نے کسی صاحب عقل و فراست سے پوچھا کہ اخبار کے پہلے صفے پر کن لوگوں کی تصویریں چھپتی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ جو کچھ کرتے ہیں یا کچھ بناتے ہیں۔ مثلاً جہاز ہائی جیک کرتے ہیں یا سنچریاں بناتے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔

''اور لکھنے والے۔'' تو انہوں نے کہا۔ ''جو وزیر یا سفیر ہو جائیں، یا مر جائیں۔'' انشاء جی اخبار کے پہلے صفحے پر آنے کے لیے اور تو کچھ نہ کر سکے، بس چپکے سے مر گئے۔ اور تابوت کے شیشے کے پیچھے سے ان کی شبیہ اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر آئی۔ اس بات پر وہ نہایت عمدہ کالم لکھتے کہ جو لوگ ہوائی جہاز ہائی جیک کرتے ہیں وہ ایک کروڑ ڈالر نقد مانگتے ہیں ہم بے چارے عمر کی نقدی مانگتے رہے۔ وہ بھی ادھار اور سو پچاس برس نہیں بلکہ پانچ دس برس۔ سچ ہے! فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ لیکھک تھے۔ ہمارے تخیل کی اڑان میں اتنی تھی۔ انشاء جی میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ اوروں کے ساتھ اپنا بھی مذاق اڑا لیتے تھے بلکہ اوروں کا کم اپنا زیادہ، میرے نام انشاء جی کے خطوط میں بھی ان کے انشائیوں کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ یہ خط دوسرے بہت سے خطوط کے ساتھ ایک بڑے سے لفافے میں ہمارے گھر کی دو چھتی پر ایک سوٹ کیس میں پڑے تھے۔ وہ دو چھتی اتنی اونچی تھی کہ ایک مرتبہ جو چیز اوپر چلی جائے وہ نیچے نہیں آ سکتی تھی۔ اور جو نیچے رہ جائے وہ اوپر نہیں جا سکتی تھی۔ گویا زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔ اس کے علاوہ اس گھر میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں۔ مثلاً پانی نایاب تھا۔ دیمک اور مالکہ مکان بالافراط نظر آتی تھیں۔ چھت ناپختہ اور فرش زمین سے بہت دور تھی۔ گھر کے بارے میں ہر شکایت کو وہ اپنے مرحوم شوہر کے کھاتے میں ڈالتی تھیں۔ یعنی ''میں کیا کروں، بیوہ ہوں۔'' یہ جملہ وہ ہمیشہ بزبان انگریزی ادا کرتی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے نزدیک لفظ ''وڈو'' سے زیادہ بیوگی چھپتی ہو۔ بہر حال اس مکان کی خستہ دو چھتی پر سے ایک مرتبہ جب سامان اتارا گیا تو سوٹ کیس کے سارے سوٹ بھی گل چکے تھے اور کیس بھی، صندوق میں لحاف اور رضائیاں پھولی پھولی ہو چکی تھیں۔ اور ایک سوٹ کیس میں سے جو خطوط نکلے، وہ بس آخری سانس لے رہے تھے۔ اگر چند دن اور نہ نکالا جاتا تو پتا بھی نہ چلتا کہ ''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔''

آکسیجن تو میسر نہ تھی بہر حال خطوط کو ہوا اور دھوپ دی گئی، جو زندہ بچے انہیں دوبارہ داخل صندوق کر دیا گیا۔ انشاء جی کے خطوط چوں کہ نہایت دل چسپ ہیں اس لیے جی چاہا کہ چھپ جائیں تو اچھا ہے کہ روشنائی روز بروز دھندلا رہی ہے۔ مرحوم ایسے خوش خط بھی نہ تھے کہ ان کی تحریر سرد و گرم زمانہ زیادہ عرصہ تک جھیل سکے۔ ظالم وقت نے جس طرح صاحب قلم کو نہ چھوڑا، ان کے خطوط کو بھی ایک نہ ایک دن کھا لے گا۔

۱۹۶۰ء میں ہم نے ''ہم قلم'' کے لیے ایک افسانہ اور ایک مضمون بھیجا۔ انشاء جی نے رسید بھیجی اور کچھ تعریف کی۔ اس طرح ہماری خط و کتابت ''فیڈ ان'' ہوئی جو اشفاق احمد کے ڈراموں کی طرح کچھ کچھ چلتی ۱۹۶۵ء میں ''فیڈ آؤٹ'' ہو گئی۔ اس زمانے میں انشاء جی خود کچھ نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے ان کو خاصی پریشانی تھی۔ وہ اکثر خطوط میں میری زود نویسی پر رشک کرتے نظر آتے تھے۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ کچھ لوگ چھپے رستم ہوتے ہیں، کچھ چھپے انشا ہوتے ہیں۔ جیسے انشاء جی تھے کہ جب ان پر کالم نگاری کا دوسرا دور آیا تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کے کالموں کی کئی کتابیں ترتیب پائیں جو کسی بھی باذوق شخص کے گھٹتے دل کو بڑھاوے کا کام دے سکتی ہیں یا مالیخولیا کے مریض کو مالی پریشانیوں سے تو نہیں البتہ ''خولیا'' یعنی خالی خالی پریشانی سے نجات دلا سکتی ہیں۔

میرا خیال ہے اگر ہم (ہم میں آپ بھی شامل ہیں) میں چکنے گھڑے ہونے کی بے پناہ صلاحیت نہ ہوتی تو انشاء جی کے کالم ہر شخص کے لیے تازیانہ تھے۔ مگر ہم ان کی ہر بات مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ انشاء جی مر گئے مگر ہمارے کان پر جوں نہ رینگی۔ ہم نے اپنی خو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ انشاء جی نے اپنی وضع بدل دی۔ اور وہ جو ہمیں چلو بھر پانی میں ڈوبنے کا اشارہ دیا کرتا تھا خود منوں مٹی کے نیچے جا چھپا۔

انشاء جی سے خط و کتابت کے ذریعے ہماری نصف ملاقات کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو آمنے سامنے کی دو ایک

ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے دفتر میں جو ان دنوں نیشنل بک سینٹر کہلاتا تھا، عالی جی بھی موجود تھے۔ کسی صاحبہ سے ہماری ملاقات کروانا چاہتے تھے۔ دونوں صلاح کرتے رہے کہ بھئی وہ صاحبہ "قیصر" کی بیوی سے ملنا پسند نہیں کریں گی۔ کم از کم "میجر جنرل" تو کہو۔ بہرحال فون ہوا۔ شاید انہوں نے میجر جنرل کی بیوی سے ملنا بھی پسند نہ کیا۔ چناں چہ ان صاحبہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خط میں ہائر انکم گروپ اور فصیح کو میجر جنرل لکھنے کا سبب، یہ واقعہ ہے۔

(کراچی) ۶۳-۴-۱۰

رضیہ بیگم...... آداب!

میں تو ڈھاکے میں پھنس گیا تھا۔ حاجی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم گناہ گاروں کو سیٹ ہی نہیں مل رہی تھی۔ بہ ہزار خرابی اس اتوار کو جیٹ کی بجائے سپر کانسٹلیشن میں آیا۔ جو ڈھائی تین گھنٹے کی جگہ چھ ساڑھے چھ گھنٹے لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے حد کوفت ہوئی۔ ہاں ڈھاکے میں مزے رہے۔ آپ اونچے اکنامک گروپ کا لطیفہ بھول جائیں تو عرض کروں کہ شاہ باغ میں پڑا اینڈتا تھا۔ شہاب صاحب بھی وہیں تھے۔ صبح پانچ بجے اٹھا کے مجھے رمنا کے ریس کورس کی سیر کو لے جاتے تھے۔ میں نے بارہا عذر کیا کہ اس سیر اور صبح کی ورزش اور ٹھنڈی ہوا سے خاکسار کی صحت خراب ہو جائے گی جو مدت العمر سے شہر کی دھواں دھار فضا میں رہنے اور ساڑھے سات آٹھ بجے اٹھنے کا عادی ہے۔ لیکن نہیں...... پھر شاہ باغ والے ہمیشہ سے کھانے میں ٹھوسم ٹھانس کے عادی ہیں اور کراچی اور لاہور کی اونچی دکانوں کے برخلاف یہی بات یہ ہے کہ سستے بھی ہیں اور اچھے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ با اخلاق بھی۔ اگر وہ بعد میں بل لینا بھی چھوڑ دیں تو ساری دنیا ان کی گرویدہ ہو جائے۔

آپ کا ناول میری غیر موجودگی میں آیا تھا۔ ریاض میری ڈاک اس اثناء میں لے گئے تھے۔ ناول اور خط ان کا آدمی آج دے کر گیا ہے۔ ناول تو اب میں ذرا فرصت سے ڈھاکہ کی لنگی اور کرتی پہن کر دیکھوں گا۔

ہاں خط کا جواب دینا واجب ہے۔ آپ سے ملاقات مختصر رہی لیکن جی خوش ہوا۔ آپ ہمارے ڈھب کی آدمی ہیں۔ سادگی اور تکلف اور تملق کے عادی۔ خدا فصیح احمد صاحب کو جلد سچ مچ کا میجر جنرل بنائے۔ امید ہے اس کے بعد بھی آپ یہی رہیں گی۔ البتہ ایک بات ہے۔ آپ کی تحریروں میں جو شرارت بلکہ "فتنہ پردازی" پائی جاتی ہے اس کا گفتگو میں مظاہرہ نہیں ہونے پایا۔ گہرے دریا ہمیشہ دھیما بہتے ہیں۔ لیکن پھر اپنی برائی کرنی ضروری ہو جائے گی کہ اپنی شخصیت کو ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔ خیر اس وقت خاکساری اور خود مذمتی کا موڈ بھی نہیں۔ ہم بھی اچھے، آپ بھی اچھے۔ میں نے جو گفتنی تھا ابیات میں کہہ دیا۔ سچ ہے کہ وہی اصل زندگی ہے۔ بس اس زندگی میں کہ کہنے کو سوز ہی سوز ہے۔ کامران اور بامراد ہونے کی دعا دیجئے۔

دیکھا آپ نے، قلم کو ذرا سی ڈھیل دی اور رقت طاری ہونے لگی۔ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے افسانے کہنے کو جی چاہنے لگا۔ آپ کیا جانیں، اس بستی کے اک کوچے میں کیا کیا نیرنگ ہیں، لیکن اب اے قلم حد ادب۔

آپ کا ایک ایک سنگ میل گنتے جانا اچھے خاصے سفرنامے کو تحریک دے سکتا ہے۔ اور اس میں الحاق کلام شامل کرنے کی بہت کم ضرورت ہوگی۔ "درد کے فاصلے" آپ نے ناول کا بہت اچھا نام سوچا ہے۔ باقی باتیں ناول اور افسانوں کے متعلق آپ کو ریاض خود لکھ دے گا۔ آپ کے شعر بھی دیکھے۔ اگر یہ اشعار بے اختیاری میں سرزد ہوئے ہیں تو۔

کیا جانیں کیا کرے جو خدا اختیار دے

کہیں بھیجنے سے پہلے ایک نظر ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ذاتی طور پر عروضی آزادیوں کی بجائے، صوتی خوب صورتی کو ترجیح دیتا ہوں۔ جاں ہی سے جھٹکا لگتا ہے۔ آپ جان پڑھیے مطلب وہی رہے گا۔ "ناوک و شام" ایک مرکب لفظ، ساری غزل کے مزاج سے بے آہنگ ہو گیا ہے۔ میں تو غم دوراں کا مضمون کم باندھتا ہوں۔ آپ نے باندھا ہے تو ذرا کس کر باندھیے۔ آپ کی میں نے بہت اچھی اچھی غزلیں پڑھی ہیں۔ یہ ان سے نکلتی ہوئی نہیں۔ آپ میجر جنرل صاحب کو ایک اوسط قاری فرض کر کے ان کو اپنی غزلیں پڑھایا کیجئے۔ اور ذرا ان کو آزادی اظہار کا حق بھی دیجئے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن کبھی کسی موقع پر آپ کے گھریلو تعلقات میں کوئی بدمزگی آئی تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ بہت لکھ گیا۔ اس وقت سات بج رہے ہیں۔ ظاہر ہے شام کے، صبح کو تو میں سو رہا ہوتا ہوں۔

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چودیس

نیاز کیش ابن انشا

☆☆

نئے سال پہ ہوتی بات کوئی

شاہین رشید

نیا سال

ایک کام ختم نہیں ہوتا کہ اگلا دن شروع ہو جاتا ہے۔ یا اللہ یہ وقت کو کیا ہو گیا ہے۔ بھاگے جا رہا ہے۔
گزرے زمانے میں تو ایسا نہیں تھا۔ لوگ رشتے داریاں بھی نبھاتے تھے۔ مل جل کر رہتے تھے۔ شام ہوتی تو محفلیں بھی سجاتے تھے۔ ہر موضوع پر بات بھی کرتے تھے اور سیر و تفریح کے لیے پروگرام بھی بناتے تھے۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے تھے۔ ایک آواز میں خوشی غم میں شریک بھی ہوتے تھے......
اور اب......
کس کے دن کیسے گزرے ہیں کوئی احساس نہیں اپنے ہی جھمیلے ختم نہیں ہوتے تو دوسروں کو کیا پوچھیں۔ ایک کام شروع نہیں ہوتا کہ دوسرا سر پر آ جاتا ہے۔
اور ہاں ابھی تو 2025 شروع ہوا تھا ابھی ختم بھی ہو گیا 2025 میں باندھی گئی امیدیں تو پوری ہوئی نہیں 2026ء کے لیے کیا امیدیں باندھ لیں۔
زندگی تو ایک سفر بن کے رہ گئی ہے خواہ وہ انگریزی کا سفر ہو یا اردو کا......ہم اور آپ بس اب سب سفر میں ہی ہیں، دکھ سکھ کے سفر میں، ذمہ داریاں نبھانے کے سفر میں یا پھر تھوڑی عیاشی والے سفر میں......مگر اب عیاشی والا سفر کہاں ہر کسی کو میسر ہوتا ہے۔
زیادہ سوچیں بھی انسان کو پاگل کر دیتی ہیں۔ اس لیے سوچا تھوڑا ذہن کو آرام دیں، 2026ء کو خوش آمدید کہیں اور معروف شخصیات سے پوچھیں کہ 2025 میں کیا کیا اور اب 2026ء میں کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

کل کیا کھویا کیا پایا آؤ حساب لگائیں
آنے والا کل کیا ہوگا آؤ نصاب بنائیں

سوالات:۔

1۔ 2025 کیسا گزرا؟ انگریزی والا سفر کتنا کیا اور اردو والا سفر کتنا کیا؟

2۔ وقت کس تیزی سے گزرا روزمرہ میں منیر
آج کل ہوتا گیا اور دن ہوا ہوتے گئے

2۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے وقت اتنی تیزی سے نہیں گزرتا تھا جتنا اب، کیا واقعی؟ یا سوشل میڈیا نے اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا ہے۔

3۔ نئے اس سال کی آمد پہ ہم کچھ خواب بنتے ہیں
بھلا کر تلخیاں ساری گل شاداب بنتے ہیں
نئے سال کے لیے کیا امیدیں ہیں۔ اپنے حوالے سے اور ملک کے حوالے سے؟

شمائلہ دلعباد: ۔ رائٹر...... سلطنت عمان

1۔ مجھے لگتا ہے کہ 2025 ساری دنیا پر ہی گراں گزرا ہے۔ قدرتی آفات کی وجہ سے بے شمار لوگ "اجل" کا رزق بنے، ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والوں میں ایک ہم سب کی پیاری سائرہ رضا بھی ہیں تو اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگلش والا سفر زیادہ کیا ہے۔ میں اپنی ذات کے حوالے سے بات کروں تو صحت کے مسائل سے خاصی دوچار رہی ہوں۔ اور اس سروے کے جوابات لکھتے وقت بھی میں بخار میں مبتلا ہوں۔ اس سب کے باوجود میں 2025 کے لیے ہی کہوں گی کہ "زہر کی ندی ہے تو پھر بھی قیمتی ہے تو" کیونکہ تو ہمارے بیچ سے گزرا ہے۔

2۔ مجھے تو یہ سچ ہی لگتا ہے اب وقت جلدی گزرتا ہے۔ ادھر مہینہ شروع نہیں ہوتا ادھر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ آپ نے جو لوجک دی ہے کہ سوشل میڈیا کی وجہ سے تو ایسا نہیں لگتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ سوشل میڈیا نے ایسا شکنجہ کس لیا ہے کہ ریلیز، ٹک ٹاک دیکھتے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب کتنا وقت گزر گیا، لمحے جیسے انگلی کی پور کے نیچے بہہ رہے ہیں۔ پہلے یہ سسٹم نہیں تھا، محدود تفریح کے سبب وقت ٹھہرا ہوا تھا بلکہ لگتا تھا کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ مطلب یہ کہ سوشل میڈیا فیکٹر کو اس ضمن میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

3۔ کہتے ہیں کہ امید ہمیشہ اچھی رکھنی چاہیے لیکن تمام معاملات میں میں خوش امید ہوں۔ پاکستان وطن عزیز کے حوالے سے دل میں کوئی خوش امیدی نہیں ہے اور نہ ہی جاگتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان کے لیے وقت ٹھہر گیا ہے۔ بیرونی دنیا پر صدیاں بیت گئی ہیں اور پاکستان...... خیر ہمارے بس میں دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے سو دعا تو کرتے رہیں گے۔

ثمین صداقت......رائٹر

1۔ پہلے تو سب کو نیا سال مبارک، امید ہے کہ نیا سال ہم سب کے لیے خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئے گا۔

خیر 2025 کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ میری آپ سے (شاہین رشید) سے ڈیجیٹلی ہی سہی لیکن ملاقات تو ہوئی۔ دوسری بات کہ میری کہانیاں خواتین ڈائجسٹ کی زینت بنی اور قارئین کو پسند بھی آئیں۔ پڑھائی بھی صفر کی رفتار سے آگے بڑھی باقی انگریزی والا سفر اور اردو والا سفر دونوں پکی سہیلیاں بن کے میرے ساتھ رہیں۔ آنا فانا ڈیرہ اسماعیل خان شادی میں جانا پڑا اور صبح سات بجے ہم ڈیرہ کے لیے روانہ ہوئے اور مزے کرتے ہوئے گئے۔ وہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ اتنا کھلاتے ہیں کہ وہاں سے آنے کے بعد ایک ہفتہ کچھ کھانے کا دل نہیں کیا۔ پھر جولائی میں اسلام آباد، مری اور ایبٹ آباد گئے یہ ٹرپ کا پلان بھی اچانک بنا اور اگلے دن ہم سب کزنز سامان پیک کر کے سفر پر تھے۔ کزنز کے ساتھ جانا بھی ایک یادگار ٹرپ ہوتا ہے۔ اور یہ ٹورز ہماری زندگی کا بہترین ٹورز تھا۔

ابھی ایک کہانی خواتین ڈائجسٹ میں چھپی ہے اس کا پس منظر بھی یہی ٹرپ تھا۔
انگریزی والا سفر بھی خوب رہا، ایک جاب چھوڑ کر دوسری جگہ جوائن کیا۔ گورنمنٹ ادارے تو پیسے دینے کا نام ہی نہیں لیتے۔ باقی سارا سال گھر آئے عجیب و غریب رشتوں کے نہ ہونے کی دعائیں کرتے رہے۔ کافی پالیٹکس بھی برداشت کرنی پڑی۔ لیکن چلیں سب چلتا ہے اور آخر میں سب ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔
2۔ وقت بچ میں تیزی سے گزرتا ہے۔ لیکن اب تو شامیں لمبی ہو گئی ہیں تو شام کا وقت بڑا آہستہ گزرتا ہے۔ جب بھی گھڑی دیکھو وقت رکا ہوا لگ رہا ہوتا ہے اور دوپہر تو آتی ہی نہیں۔ سوشل میڈیا پر تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اس لیے میں یا تو استعمال ہی نہیں کرتی یا کوشش کرتی ہوں کہ ٹائمر لگالوں کہ گھنٹے سے زیادہ نہ ہو۔ میری ماما کہہ رہی ہیں کہ پہلے ہم گھر کے اتنے کام کرلیا کرتے تھے۔ بچوں کے بھی اپنے بھی مل بیٹھ بھی لیا کرتے تھے اور پھر کہیں جا کے دن گزرتا تھا۔ لیکن اب وقت میں برکت نہیں رہی۔
3۔ نئے سال کے شروع میں میری بہن کی شادی ہے۔ اس کے علاوہ کاش کے کوئی معجزہ ہو جائے کہ میری پی ایچ ڈی جادو سے ختم ہو جائے، ورنہ ابھی آثار تو یہی ہیں کہ میری جان اور مال دونوں ہی ختم ہو جائیں گے۔ خدانا خواستہ۔
کاش ملک کے حالات بہتر ہو جائیں۔ سب سے زیادہ دکھ تو جوانوں کو بے کار، بے روزگار دیکھ کر ہوتا ہے۔ ہم اپنی تنخواہوں میں سے بھی ٹیکس دیتے ہیں۔ کوئی چیز خریدیں اس پر الگ ہے۔ ٹیکس کا نظام ٹھیک ہونا چاہیے۔ اور نوجوانوں کو روزگار ملنا چاہیے اگر نوجوانوں کو جاب مل جائیں تو وہ کمانے کے چکر میں ملک سے باہر کیوں جائیں کوئی بھی اپنا گھر۔ اپنا ملک خوشی سے نہیں چھوڑتا صرف مجبوری سے چھوڑتا ہے۔

افشاں آفریدی ...... رائٹر

سب سے پہلے تو تمام قارئین کو میری طرف سے نئے سال کی آمد پر بہت سی دعائیں۔ اللہ کرے یہ سال ہم سب پاکستانیوں اور مسلمانوں کے برکت، رحمت اور امن لے کر آئے۔ آمین
اس کے بعد کرن کے قارئین کو میرا سلام۔ کرن میرا قلمی گھر ہے۔ میں نے اپنا تحریری سفر کرن سے شروع کیا۔ اس لیے کرن اور اس کے قارئین میرے لیے بہت اہم ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے خاص جگہ ہے۔
1۔ 2025 بہت سی نئی داستانیں رقم کر کے گزرا ہے سمجھیں کہ "رولر کوسٹر" سے گزرا پورا سال۔ اس برس اپنے بڑے بھائی جیسے بڑے بہنوئی "سکندر" بھائی کو کھویا۔ یہ صدمہ شدید تھا اس کے علاوہ ایک اور قریبی رشتہ بھی داغ جدائی دے گیا۔ انگریزی والا سفر زیادہ کرنا پڑا۔ البتہ اردو کا سفر بھی کیا۔ الحمدللہ اس بار پاکستان کے علاوہ اپنی بہن سے ملنے کینیڈا جانا ہوا اور ایک ٹور سوئیزرلینڈ کا بھی لگا۔
2۔ یہ تو حالات کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر حالات مشکل ہوں اور دکھوں کا سامنا کرنا پڑے یا پڑ رہا

ہوں تو دن کاٹے نہیں کٹتے۔ دن مہینے کے اور مہینے سال کے لگتے ہیں اور خوشیوں اور آسانیوں کا وقت تو جیسے پر لگا کر گزر جاتا ہے۔ تاہم سوشل میڈیا کی وجہ سے واقعی بہت سا وقت نیٹ پر صرف ہو جاتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔ گو کہ یہ میڈیا اچھے مصرف کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ عموماً لوگ اسے ذاتی تشہیر اور موازنے کی فضا گرم رکھنے کے لیے بروئے کار لا رہے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں حرص اور ریاکاری کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔

3۔ نئے سال بلکہ آنے والے ہر دن کے لیے رب کعبہ سے بہت اچھی امیدیں ہیں۔ وہ کچھ دے کر واپس لیتا ہے تو بہت کچھ نوازتا بھی ہے۔ اپنے اور وطن عزیز کے لیے اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا ہے کہ اگلے سال کا 2026ء سورج ہمارے لیے خوشیوں کی نوید لے کر طلوع ہو۔ خاص طور پر پرنٹ میڈیا اور ڈائجسٹ کی اس چھوٹی سی انڈسٹری کے لیے دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ پبلیکیشن کے ان اداروں کو ترقی دے جن کے ذریعے ہم مصنفین اور قارئین کا یہ خوب صورت رشتہ قائم و دائم ہے۔ سدا خوش رہیں۔

فرح بھٹو......رائٹر

1۔ الحمدللہ 2025 کی شروعات بہت اچھی رہیں۔ میرے میاں صاحب کی پروموشن کی خوشخبری ملی جو کہ بہت سرپرائزنگ تھی۔ میرا چند سالوں سے ٹھہرا ہوا رائٹنگ بلاک بھی ٹوٹا اور پھر سے میں نے قلم تھاما (یعنی سیل فون کا نوٹ پیڈ) اور دوبارہ اپنے پسندیدہ ادارے خواتین ڈائجسٹ سے تعلق جوڑا۔ انگریزی والے سفر سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ اردو والا سفر اچھا چلتا رہا۔ یعنی شاپنگ، آؤٹنگ، ملنا ملانا ۔ زندگی روٹین میں چلتی رہی جس پر میں اپنے پروردگار کی شکر گزار ہوں کہ صحت مند زندگی اور سکون سے گزرتے لمحات کا نعم البدل کوئی نہیں۔ اللہ پاک نے کسی انہونی ناگہانی آفت سے محفوظ رکھا۔ الحمدللہ۔

2۔ وقت کی رفتار واقعی بہت تیز ہو گئی ہے یہ بات نہ صرف کہی جاتی ہے بلکہ دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ دن رات ہاتھوں سے اس طرح پھسل رہے ہیں جیسے ریت ہو۔ دنوں کو پر لگ چکے ہیں۔ دوسرے مہینوں کی بات ہی کیا ماہ جون کی گرم دوپہر جو کاٹے نہیں کٹتی تھی اب چٹکیوں میں گزر جاتی ہے۔ شاید یہ قیامت کے آثار ہیں۔ اور اتنے قلیل وقت میں سوشل میڈیا نے خیر سے وہ لمحے بھی لوگوں سے چھین لیے ہیں جو اپنوں کو دینے تھے۔

نوجوانوں کو ٹک ٹاک، اسنیپ چیٹ اور انسٹا نے دیوانہ بنا دیا ہے تو مڈل ایج والوں کو فیس بک اور یوٹیوب نے مصروف کیا ہوا ہے۔ اب بس ورچوئل دنیا ہی سب کا اوڑھنا بچھونا بن گئی ہے۔ ہر چیز تب تک اچھی ہے جب تک اس کا استعمال با مقصد ہے ورنہ نرا وقت کا ضیاع ہے اور سوشل میڈیا کو اکثریت بہت دلجمعی کے ساتھ وقت کو ضائع کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اور ہم سب اپنے میسر وقت کو اپنوں کے ساتھ یادگار بنانے کے بجائے فضول گنوا رہے ہیں۔

3۔ نئے سال سے یہی امید ہے کہ آنے والا یہ سال رحمت اور برکت والا ہو اور اللہ پاک اسے ہمارے لیے بہترین بنا دے۔ اپنے حوالے سے بھی

ٹاؤن کراچی میں رہ رہی ہوں۔ اس حوالے سے اردو والا سفر اپنے آپ ہی بڑھ گیا ہے کراچی اکثر آنا جانا ہوتا ہے اس حوالے سے طویل سفر معمول کا حصہ بن گیا ہے۔ الحمد للہ انگریزی والے سفر سے اللہ نے محفوظ رکھا۔

2۔ پہلے سننے میں آتا تھا کہ وقت کو پہیے لگے ہوئے ہیں لیکن اس ڈیجیٹل دور میں بات پہیوں سے بہت آگے نکل گئی ہے اب یہ مثال بھی کم لگتی ہے کہ وقت پر لگا کر اڑ گیا وقت تو اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا ہے۔ لیکن اطمینان، سکون ناپید ہے ہر طرف ایک افراتفری اور ہلچل مچی ہوئی ہے۔ آج کی جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں زندگی کی آسائشوں اور سہولیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ جس میں ذرائع ابلاغ کی ترقی یافتہ شکل سوشل میڈیا ہے۔ مگر آج کا انسان سوشل میڈیا کو ضرورتاً یا ایک حد تک استعمال کرنے کی بجائے طبع تفریح کے لیے زیادہ استعمال کر رہا ہے۔ یوں سمجھ لیں سوشل میڈیا پر انحصار حد سے زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ پھر وقت کا حساب وشمار کیسے ممکن ہے۔

3۔ نئے سال کے لیے الحمد للہ اچھی امیدیں ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اللہ سے ہمیشہ نیک گمان نیک امید رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اللہ انسان کے گمانوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے نہ صرف اپنے لیے بلکہ سب کے لیے نیک خواہشات ہیں۔ اور ملک کے لیے بھی دعا ہے کہ اللہ پاک اسے دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ اندرونی اور بیرونی معاملات بہتر رہیں۔
پاکستان کا وقار ہمیشہ بلند رہے۔ آمین

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

دُنیا کی نیچر کی طرف واپسی اور پاکستان کا ہربل مستقبل

حکیم محمد عثمان (چیف ایگزیکٹو مرحبا لیبارٹریز پاکستان)

اس وقت چالیس سے زیادہ ملکوں میں مرحبا لیبارٹریز کی پراڈکٹس جا رہی ہیں۔ دنیا اب بے تیزی سے مصنوعی اور کیمیائی علاج سے ہٹ کر قدرتی، ہربل اور متبادل ادویہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

پاکستان میں کئی ایسی ہربل مصنوعات موجود ہیں جو درست معیار، تحقیق اور برانڈنگ کے ساتھ عالمی منڈی میں نمایاں مقام حاصل کرسکتی ہیں۔ مگر پاکستان میں ان پر سنجیدہ سرمایہ کاری اور ریاستی سرپرستی کا فقدان ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی کئی قیمتی خام جڑی بوٹیاں ریسرچ کے نام پر بیرون ملک لے جائی جا رہی ہیں۔ جہاں ان پر ویلیو ایڈیشن، برانڈنگ اور جدید تحقیق ہوتی ہے اور پھر وہی مصنوعات مہنگے داموں عالمی منڈی میں فروخت کی جاتی ہیں۔ ہم خام مال بیچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، جبکہ اصل منافع، علم اور شناخت دوسروں کے حصے میں چلی جاتی ہے۔

دنیا کے کئی ممالک میں جو جڑی بوٹیاں قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متبادل پاکستان میں بھی موجود ہیں اور با آسانی کاشت بھی کی جاسکتی ہیں۔ مسئلہ وسائل کی کمی نہیں۔ مسئلہ وژن، پالیسی اور سنجیدہ ریاستی توجہ اور لیڈرشپ کا فقدان ہے۔

اگر پاکستان نے ہربل ریسرچ ادارے مضبوط نہ کیے۔ مقامی صنعت کو سہولت نہ دی۔ جڑی بوٹیوں کی بے ضابطہ برآمدات نہ روکیں تو ہم ہمیشہ خام مال فراہم کرنے والا ملک بنے رہیں گے۔ مرحبا جیسے اداروں کے عالمی مشاہدات ایک واضح پیغام دیتے ہیں کہ اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ ہم اس خزانے کو قومی دولت بناتے ہیں یا دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیتے ہیں۔

☆☆

امید ہے کہ یہ سال میری نا تمام خواہشوں کی تکمیل کا سال ثابت ہو۔ ہر طرف سے اچھی خبریں ملتی رہیں۔ دکھ درد اور تکلیفوں سے اللہ ہمیں محفوظ رکھے اور اپنے در کی حاضری نصیب کرے۔

اپنے وطن کے لیے تو میرا ردم ردم دعا گو رہتا ہے۔ نئے سال کے لیے بھی میری یہ دعا ہے کہ وطن عزیز کو اچھے اور دیانت دار حکمران نصیب ہوں۔ جن کے دل مادیت سے پاک اور عوام کا درد رکھنے والے ہوں۔ ہماری عوام جو بے سکون بے یقینی اور مہنگائی سے بے حال ہو رہی ہے اسے سکون نصیب ہو۔

قرۃ العین سکندر......رائٹر

1۔ میرے لیے 2025 کئی سطحوں پر بدلاؤ کا سال رہا۔ انگریزی نے مجھے نئے دنیا کے دریچے دکھائے نئے نظریات نئے مکالمے اور اظہار کے نئے زاویے۔ لیکن دل کی جڑیں ہمیشہ اردو کی مٹی میں پیوست رہیں۔ اردو والا سفر زیادہ گہرا۔ زیادہ روحانی اور زیادہ تخلیقی تھا، جیسے اپنی ہی زمین میں ایک نیا چشمہ پھوٹ پڑے، جس کا پانی دل کو بھی سیراب کرے اور قلم کو بھی...... یوں کہہ لیں انگریزی نے میرے سفر کو وسعت دی اور اردو نے اس سفر کو معنی بخشے۔

2۔ میرا ماننا ہے کہ وقت ہمیشہ اپنی رفتار سے چلتا ہے۔ بدل ہم گئے ہیں۔ پہلے زندگی میں وقفے تھے، ٹھہراؤ تھا۔ ہم لمحوں کو جیتے تھے۔ آج سوشل میڈیا نے ہمیں اپنی گرفت میں ایسا جکڑ لیا ہے کہ لمحے محسوس ہی نہیں ہوتے صرف گزر جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وقت تیز نہیں ہوا ہم خود اپنی رفتار سے پھسلتے جا رہے ہیں۔

3۔ نئے سال سے امیدیں اپنی ذات وطن اور اداروں کے لیے کچھ یوں ہیں کہ نئے سال کے دہانے پر میری سب سے بڑی خواہش رب کریم کے ساتھ تعلق کی گہرائی ہے۔ یہ تعلق لفظوں سے آگے بڑھ کر عمل میں، رویوں میں اور فیصلوں میں جھلکے۔ بندگی سے معرفت اور معرفت سے قرب تک کا سفر بنے۔ میں چاہتی ہوں کہ دل اس کے اتنا قریب ہو جائے جتنا دھڑکن نبض کے۔

وطن کے لیے میری دعا اور امید بہت وسیع ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمارا ملک تنقید کی آگ میں جلتا نہ رہے بلکہ تعمیر کی روشنی میں قدم بڑھائے۔ جہاں تعلیم کو عزت ملے۔ کردار کو مقام اور نوجوانوں کے خواب محض نعرے نہ رہیں بلکہ حقیقت کا روپ دھاریں۔ اگر ہمارے اداروں میں سچائی کی روشنی جاگ اٹھے تو یہ ملک خود بہ خود روشن ہو جائے گا۔

صائمہ نور......رائٹر

1۔ 2025 وہی دن، وہی راتیں، وہی زمین و آسمان کی گردش، اس کے باوجود اپنے دامن میں بہت سی نئی نئی باتیں نئے تجربے، نئی یادیں، نئے انمول انمٹ نقوش دے گیا ہے سفر اردو والا ہو یا انگریزی والا دونوں ہی زندگی کو متحرک رکھنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ میں گزشتہ دو سال سے بحریہ

بہو سے ساس کا سفر

ماہا ملک

شاہین رشید

گزشتہ سے پیوستہ

"اولاد کی خوشی اور وہ بھی پہلی اولاد کی خوشی سب کے کیا تاثرات تھے؟"

"اولاد کی خوشی اور پھر پہلی اولاد کی خوشی، اظہار مشکل ہے۔ اور اولاد میاں بیوی کے رشتے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسے بھی جوڑے ہیں جنہیں اولاد کی رحمت نہیں ملی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے طریقوں سے نوازا ہے۔ اور یقیناً ان نعمتوں کے بجائے دوسری نعمتوں سے نوازا ہوگا۔

میری نظر میں اولاد میاں بیوی کے رشتے میں ایک پل کا کردار ادا کرتی ہے اور آپ کو اندازا ہی نہیں ہوتا کہ اولاد کے آنے کے بعد آپ کے رشتے کی مضبوطی کی کیا کیفیت ہوگی۔ پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد ہمارا رشتہ مضبوط بھی ہوا اور پر خلوص بھی۔ پھر دوسری بیٹی اور پھر جب بیٹا ہوا تو یوں لگا کہ اللہ پاک نے اپنی ہر نعمت عطا فرمادی ہے اور ہر طرح سے زندگی کو مکمل اور پرسکون فرمادیا ہے۔ اور بیٹے کے آنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ میاں بیوی کی محبت میں بھی کئی گناہ اضافہ ہوگیا ہے اور اس کے بعد یوں لگا جیسے ہم نے زندگی میں بھی پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ یعنی ہم پانچ افراد ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھے۔ بیٹا اب یونیورسٹی جانے کی تیاری میں ہے اور بیٹیوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ اور پھر زندگی ایسی گزری اللہ کے فضل و کرم سے کہ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی خلش اور کوئی احساس کمتری رہی ہی نہیں۔ اولاد تو بہت بڑی نعمت ہے جتنا شکر کریں اتنا کم ہے۔ اور اولاد کے آنے کے بعد میاں بیوی کا رشتہ کئی گناہ طاقت ور اور احترام کا ہوتا ہے۔

اور آپ کی اس بات کا جواب بھی دیتی ہوں کہ پہلی اولاد کی خوشی پر کیا تاثرات تھے۔ تو آپ کو بتاؤں کہ میری سارہ ہماری شادی کے دو سال کے بعد ہوئی۔ اس سے پہلے میں نے کنسیو کیا مگر اللہ کا حکم نہیں تھا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اللہ نے پھر خوشخبری سنائی اور اس بارے میرے میاں صاحب بہت ڈرے ہوئے تھے اور پورا وقت انہوں نے میری Care اور ٹینشن میں گزارا۔ تھوڑی سی بھی انیس بیس ہوتی تھی پریشان ہوجاتے تھے۔

اور ددھیال میں سارہ پہلا بچہ نہیں تھی۔ میری بڑی نند کے دو بچے تھے۔ منجھلی نند کی ایک بیٹی تھی اور چھوٹی نند جس کی شادی ہماری شادی کے ساتھ ہی ہوئی تھی اس کی نو ماہ بعد ہی بیٹی ہوگئی تھی۔ تو سارہ ماشاء اللہ پانچویں بچی تھی تو اس لیے کوئی غیر معمولی ردعمل نہیں تھا۔ سوائے میرے میاں صاحب کے کوئی اتنا ایکسائیٹڈ نہیں تھا۔ البتہ میرے سسر بہت زیادہ خوش تھے۔ ساس تو نارمل تھیں کہ انہوں نے بیٹیوں کی اولاد دیکھ لی تھی۔ تو جب میری بیٹی ہوئی تو سب نارمل تھے تو مجھے ایسا احساس ہوا کہ اگر بیٹا ہوتا تو سب زیادہ خوشی کا اظہار کرتے۔ اور صرف ہمارے خاندان میں نہیں ہر خاندان میں ایسا ہوتا ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب دو بیٹیوں کے بعد میرا بیٹا ہوا تھا تو سب کی خوشی دیدنی تھی۔ میاں صاحب بھی بہت خوش تھے اور گھر کے بقیہ لوگ بھی اور سب ایکسٹرا اڈنری مبارک باد دے رہے تھے۔ تو شاید یہ فرق ہوتا ہے اولاد میں۔ سارہ ہمارے ننھیال کی پہلی اولاد

تھی تو میرے میکے سائیڈ سے سب کو بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔

"آپ نے کہا کہ سارہ ددھیال کی پانچویں بیٹی تھی تو نندوں کی اولاد تو ننھیال کی اولاد کہلاتی ہیں۔ ددھیال کی تو یہ پہلی اولاد تھی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ہماری اولاد ددھیال کی پہلی اولاد تھی تو میرے سسر کو "دادا" بننے کی بہت خوشی تھی جبکہ ساس نے اپنی بیٹیوں کے بچوں کو گود میں کھلایا ہوتا ہے تو بیٹے کی اولاد ان کے لیے ایک نارمل بات تھی۔"

"چلیں جی...... بہو سے ساس تک کا سفر میں اب آپ پارٹ ٹو میں آجائیں۔ جب آپ خود "ساس" کے رتبے پر فائز ہونے جارہی تھیں۔ کیا احساسات تھے کہ بیٹیوں کی شادیاں جلدی ہوجائیں یا جلدی نہیں۔ اور کیا اب میں ساس کہلاؤں گی۔ کچھ عرصے کے بعد نانی...... نہیں نہیں...... میں تو ابھی خود بہت چھوٹی ہوں۔"

"ارے نہیں مجھے ایسی کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی کہ میری عمر کم ہے اور بچیوں کی جلدی شادی ہوگئی تو میں ساس بن جاؤں گی اور جب ان کی اولاد ہوگی تو میں نانی بن جاؤں گی۔ ہاں یہ میرے ذہن میں ضرور تھا کہ آمنہ چھوٹی ہے باپ کی لاڈلی ہے اور طبیعت میں بچپنا ہے اور ازدواجی زندگی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ وہ اندیشے تھے اور آج بھی ہیں۔ لیکن میں خوش قسمت ہوں کہ اس کا شوہر عبداللہ جس کی میں جتنی تعریف کروں کم ہے، وہ بہت بہت اچھا ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ آمنہ کی شادی کے تین چار ماہ کے بعد میری کزن مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ آمنہ تو تم سے بہت اٹیچڈ تھی کے بعد کیا صورت حال ہے۔ تم اس کو یاد کرتی ہوگی تو میں نے جواب دیا ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "عبداللہ" تو اس کی دوسری ماں بن گیا ہے وہ تو مجھ سے بھی زیادہ اس

کا خیال رکھتا ہے کہ آمنہ نے کبھی اس طرح سے مس نہیں کیا کہ امی یہ کرتی تھیں۔ وہ کرتی تھیں۔

اس طرح میری "سمدھن" یعنی آمنہ کی ساس بھی آمنہ کے لیے دوسری ماں ہی ثابت ہوئی ہیں۔ انہوں نے آمنہ کو بیٹی کی طرح ہی رکھا ہوا ہے۔ بہو والی کوئی ذمہ داری نہ بوجھ ہے اس پر۔ تو جیسی بے فکری اور بچپنے کی زندگی وہ میکے میں گزار رہی تھی ویسی ہی سسرال میں گزار رہی ہے۔ ماشاءاللہ، شکر الحمدللہ کہ بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔

بڑی بیٹی تو شادی کے دو ماہ بعد ہی یو ایس چلی گئی تھی اور یہاں سے ماسٹرز کا ایڈمیشن لے کر گئی تھی اور وہاں جا کر اس نے اپنی پڑھائی پر بھی فوکس کیا ہوا ہے اور گھر داری بھی کر رہی ہے۔ میرا بڑا داماد "سفیان" بھی بہت زیادہ کوآپریٹو ہے۔ بہت خیال کرنے والا شوہر ہے۔ دونوں بچیوں کو شوہر اور سسرال بہت اچھے ملے ہیں۔ تو بچیوں کی طرف سے آنکھیں ٹھنڈی اور دل مطمئن ہے۔

تو ماں باپ کے لیے تو یہ خوشی کا مقام ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے انہیں جلدی اپنے فرائض سے سبکدوش کر دیا ہے۔

"جب میری شادی ہوئی تو میری عمر چوبیس سال تھی اور یہ بہت مناسب عمر ہوتی ہے لڑکیوں کی شادی کے لیے۔ اس عمر میں ان میں شعور بھی آ چکا ہوتا ہے اور گھر سنبھالنے کا سلیقہ اور ہنر بھی آ چکا ہوتا ہے۔ ورنہ تو سسرال کی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب جاتی ہیں۔"

"شادی کے معاملے میں آپ نے اپنی بیٹیوں کو فری ہینڈ دیا؟"

"جی جی، بچیوں کو ہم نے ہمیشہ اعتماد دیا۔ بھروسا دیا اور ایسا وقت آیا نہیں کہ ہمیں سوچنا پڑا ہو کہ بیٹیوں کا رشتہ ہم نے کرنا ہے یا انہوں نے اپنی پسند سے کرنا ہے۔ چھوٹی آمنہ یونیورسٹی گئی تھی اور اس کا فرسٹ ایئر مکمل ہوا ہی تھا کہ اس کا رشتہ آ گیا تھا اور میرے میاں صاحب کو رشتہ اچھا لگا تو انہوں نے ہاں کر دی۔ اسی دوران بڑی بیٹی کی تعلیم مکمل ہو گئی تو اس کے کلاس فیلو سفیان کا رشتہ آ گیا اور ہم نے یہ بات بھی سوچی ہی نہیں تھی کہ پسند سے ہونی چاہیے یا پسند سے نہیں ہونی چاہیے۔ جس نے پسند کی اس کی پسند سے ہو گئی اور جس کے لیے ہمیں رشتہ اچھا لگا ہم نے وہاں ہاں کر دی۔ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچوں نے والدین کی پسند پر اور والدین نے بچوں کی پسند پر بھروسا کیا۔ اور رشتے ہو گئے۔

بیٹا ہمارا ابھی اے لیول کے سیکنڈ ایئر میں ہے ابھی وہ چھوٹا ہے۔ اور میرا تو یہی ماننا ہے کہ آپ کی پسند سے پہلے اگر بچے نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا ہے تو آپ دیکھ لیں، تسلی کر لیں اور کوئی وجہ اختلاف نظر نہیں آ رہی تو پھر بسم اللہ کریں۔

میری والدہ نے ہمیشہ "شاہد" (شوہر) کو بچوں کا درجہ دیا ہے، بیٹے کا درجہ دیا اور پیار کیا۔ والدہ نے کبھی داماد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ تو جب میرے داماد آئے تو مجھ میں بھی داماد والی کوئی فیلنگ نہیں آئی اور جس طرح اپنے بیٹے کو ٹریٹ کرتی ہوں ان کو بھی کیا۔ اور وہ بھی اس طرح عزت کرتے ہیں جس طرح اپنی ماں کرتے ہیں۔"

"عموماً والدہ بیٹیوں کو بڑی نصیحتیں کرتی ہیں کہ اس طرح رہنا، شوہر کو قابو میں رکھنا۔ وغیرہ وغیرہ...... آپ نے بیٹیوں کیا نصیحتیں کیں؟"

"بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت میں نے کوئی بھی نصیحت نہیں کی کیونکہ میرا ماننا تھا کہ بیٹیوں نے مجھے دیکھا ہے کہ میں کیسی بہو ہوں کیسی بھابھی ہوں اور میرا اپنے ساس سسر کے ساتھ رویہ کیسا رہا۔ نندوں اور دیوروں کے ساتھ رویہ کیسا رہا۔ تو چونکہ میری بچیوں نے بہت مضبوط بیک گراؤنڈ دیکھا ہے۔ ہمارا گھر ایک مرکز رہا کیونکہ شاید گھر کے بڑے تھے تو کوئی بھی ایونٹ ہوتا تھا تو ہمارے ہی گھر میں ہوتا تھا۔ تو میری بیٹیوں نے ایسا ماحول دیکھا ہے۔ تو نصیحت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی میں تو ان کے لیے ایک رول ماڈل تھی۔ اور ہوں اور وہ اسی ڈگر پر چلیں گی جس پر میں چلی تھی۔"

"بیٹیوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ داماد بھی

اچھے مل گئے اب بیٹے کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"جی اب جبکہ میں بیٹیوں کے فرائض سے فارغ ہو گئی ہوں تو مجھے انتظار ہے کہ میرا بیٹا اپنی پڑھائی مکمل کر لے تو میں اس کی شادی کروں، اس کے سہرے کے پھول بھی کھلتے ہوئے دیکھوں اور ہماری بہو بھی تیسری بیٹی بن کے آئے ہمارے گھر میں۔ بیٹے کے فرض سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کروں گی۔

اور مجھے لگتا ہے کہ جس دن ہماری "بہو" آئے گی وہ دن ہمارے لیے بھرپور خوشیوں کا دن ہوگا۔ اور آنے والی کے ساتھ میرا رویہ کیسا ہوگا تو میں نے اپنی زندگی سے ایک سبق سیکھا ہے کہ "ایک لڑکی جو آپ کے گھر میں آرہی ہے وہ اس لیے نہیں آرہی کہ آپ ذمہ داریوں کی ایک پوٹلی بنا ئیں اور اس کو اپنی بچی کے سر پر رکھ دیں کہ آپ جائیں اور آپ کی ذمہ داریاں جائیں۔ ایسا نہیں ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گی کہ تمہیں اپنی زندگی جیسی جینی ہے جیو اور اپنی لائف میں جو تم کرنا چاہتی ہو کرو۔ جس ٹائم پر اٹھنا سونا پسند ہے۔ جہاں آنا جانا پسند ہے اپنی مرضی سے کرو۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ اتنے بجے اٹھنا ہے۔ اتنے بجے کچن میں آنا ہے۔ تو یہ سب پرانی سوچ ہے اور اب تو بہت لوگوں نے اس پرانی سوچ کو خیر باد بھی کہہ دیا ہے۔ آج کے بچے وہ نہیں ہیں کہ وہ آپ کے اشاروں پر اپنی زندگی گزاریں گے۔ آپ نے ان کو فری ہینڈ دینا ہے اور اس میں وہ خوش رہیں گے اور آپ کی خوشی بھی اسی میں ہونی چاہیے۔ انسان اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

اچھا ایک بات آپ کو اور بتاؤں کہ اب تو بچے جوان ہو چکے ہیں اور بیٹیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔ بیٹا بھی ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن جو رویہ میرے شوہر کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ رہا اس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں سے والہانہ محبت کی ہے اور کرتے ہیں۔ بیٹے سے بھی کرتے ہیں مگر اظہار نہیں کرتے بلکہ کم کرتے ہیں اور

یہی چیز میں نے اپنے سسر میں بھی دیکھی تھی۔ میری دوسری بیٹی "آمنہ" سے ان کا بہت ہی زیادہ پیار تھا کچھ غیر معمولی بانڈنگ تھی اس کے ساتھ اور جہاں کہیں جاتے تھے آمنہ کو ساتھ لے جاتے تھے۔

اور چھ بہن بھائیوں میں میری شادی پہلے ہوئی تھی اپنی بڑی بہن سے بھی پہلے۔ تو سارہ ننھیال کی پہلی اولاد تھی تو بہت چاہی گئی اور نانی کی تو آج تک چہیتی ہے۔

تو جناب فی الحال تو اپنا بہو سے ساس تک کا سفر مکمل ہو گیا ہے۔ اور چلتے چلتے یہ کہنا چاہوں گی کہ زندگی کا احوال خدانخواستہ ایسا تلخ بھی نہیں رہا اور کچھ ایسا دھماکہ دار بھی نہیں رہا کہ کچھ لکھوں یا بتاؤں۔ ایک نارمل زندگی گزاری جیسا کہ ہماری بہت سی خواتین گزارتی ہیں۔ ہر پہلو سے مطمئن اور خوش رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے کہ جتنا شکر کروں کم ہے۔ اچھی خوب صورت زندگی گزر رہی ہے۔ یہی زندگی کا نچوڑ ہے خلاصہ ہے اور بچیوں کے لیے میری ایک نصیحت ہے کہ۔

ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آپ کو سب کچھ اچھا بھی لگتا ہے ہموار بھی لگتا ہے اور ماضی کے کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو آپ سوچنا نہیں چاہتے اور کچھ سوچنے پر مجبور بھی ہو جائیں تو طبیعت کچھ اچھا محسوس نہیں کرتی تو بس ان کھڑکیوں کو بند ہی رکھیں ان کو نہ کھولیں یہی خوشحالی کا راز ہے۔

☆☆

نگہت سیما

کبھی جاناں سے بچھڑے

تاجو آپا جان کو فون کر کے غصہ کا اظہار کرتی ہیں کہ جب انہیں گھر نہیں بھیجنا تو آپا جان نے کیوں مجو کو بھیجا۔
آفرین اور عابی کی ہاسپٹل میں اچانک ملاقات ہو جاتی ہے۔ دونوں باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ ہاشم جو شادمان ٹاؤن میں کرائے کے فلیٹ میں اس کے ساتھ رہتا ہے آ کر اس سے کہتا کہ عابی کے والد ڈیڑھ گھنٹے میں گاؤں سے اس سے چلنے کے لیے آ رہے ہیں۔
گڈی ہاجراں کو بتاتی ہے کہ ہاجراں کا بھانجا اسے ہر وقت اس لڑکے کا طعنہ دیتا ہے جس کا بس رشتہ آیا تھا کوئی محبت وحبت کا چکر نہیں تھا۔
ہاجراں اسے دلاسا دیتی کہ وہ اب مہینے دو مہینے میں گڈی کے گھر کا چکر لگایا کرے گی۔ اگر لوگوں کا ڈر نہ ہوتا وہ گڈی کا بیاہ گاؤں میں ہی کرتی۔
ایمن مولانا ضیاء الرحمن سے ملاقات کے بعد سینٹر سے باہر آتی ہے تو علی اور اینڈی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔
اینڈی اسلام کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا اس لیے علی اسے انکل ضیا سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے سینٹر لایا تھا۔
ایمن گھر پہنچ کر سوچوں میں گم ہو جاتی ہے کہ حنان لائبہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوتی ہے۔
لائبہ کا گھر الکبیرہ میں اسرائیلیوں کی بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔
ایمن نے اسے گلے لگا کر دلاسا دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے تب ہی ڈور بیل بجتی ہے۔ ایمن جا کر دروازہ کھولتی ہے تو اینڈی کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔

پانچویں قسط

''بابا جان! آپ اچانک کیسے سب خیریت ہے نا۔''
یونی میں انہوں نے مختصر بات کی تھی اور اپنے لاہور آنے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے اور وہ آفرین کو بتا کر اسی وقت یونی سے نکل آیا تھا۔ حالانکہ ہاشم نے کہا بھی تھا کہ وہ ایک کلاس اٹینڈ کر لے چچا جان ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن وہ پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں اماں جان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا لیکن بابا جان ان کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ ماموں جان کتنی بار کہہ چکے تھے کہ انہیں کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھائیں۔ راولپنڈی لاہور کہیں بھی ایک بار چیک کروالیں لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتے تھے۔
ہاشم نے اسے تسلی دی تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی کہ چچا جان اپنی آواز اور لہجے سے ذرا بھی پریشان نہیں لگ رہے تھے۔ لیکن ہاشم کے یقین دلانے کے باوجود اسے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا تھا جب تک وہ آ

نہیں گئے تھے۔ اماں جان ان کے ساتھ نہیں تھیں، وہ اپنے ذاتی گارڈ اور ڈرائیور کے ساتھ آئے تھے اور اب اس کے فلیٹ کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ضمیر احمد نے فوراً ہی جوس پیش کیا تھا اور جوں ہی انہوں نے جوس کا خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اس نے پوچھ لیا تھا۔

''ہاں سب خیریت ہے بچے، ایک ضروری کام تھا۔ سوچا تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میرا آنا ضروری نہیں تھا۔ امیر کو بھیج دیتا۔ لیکن سوچا اسی بہانے تمہیں دیکھ لوں گا۔''

وہ تنقیدی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے ایک فائیو سیٹر صوفہ اور ایک شیشے کی ٹاپ والی چوکور سنٹر ٹیبل کے ساتھ ٹی وی لاؤنج خالی خالی سا لگ رہا تھا۔

''کافی کشادہ فلیٹ ہے۔'' اس کے لاہور آنے کے بعد وہ پہلی بار آئے تھے۔

''جی بابا جان دو بیڈ ہیں، ڈرائنگ روم اور یہ ٹی وی لاؤنج۔ بیک پہ گیراج ہے۔'' وہ تفصیل بتانے لگا۔

''ہاشم کے بابا نے ہی یہ فلیٹ لیا تھا ورنہ میرا تو خیال تھا کہ ایک بیڈ روم والا چھوٹا سا فلیٹ مناسب رہے گا۔ ایک بیڈ اور ٹی وی لاؤنج ہی ہمارے استعمال میں ہے۔ لیکن وہ ہمارے آنے سے پہلے نہ صرف یہ فلیٹ لے چکے تھے بلکہ ایڈوانس کرایہ اور سیکورٹی وغیرہ بھی دے چکے تھے۔''

''اعظم خان نے بالکل ٹھیک کیا۔ اب کیا تم لوگ کسی ڈربے میں رہتے۔'' وہ جانتے تھے کہ ان کا یہ بیٹا درویشانہ مزاج رکھتا ہے لیکن وہ اسٹیٹس کونشیس تھے۔

''میں کسی کو بھیج دوں گا۔ فرنشڈ کروا دے گا سارا فلیٹ۔''

''کیا ضرورت ہے بابا جان، ہم دو ہی تو ہیں۔'' اسے پورے فلیٹ کو فرنشڈ کروانا فضول ہی لگا تھا۔

''تم دونوں کا ایک اسٹیٹس ہے یہ کیا خانہ بدوشوں کی طرح رہ رہے ہو۔ امید ہے ڈرائنگ روم بھی خالی ہی ہوگا۔ چار سال رہنا تھا تم لوگوں نے یہاں اور لگ رہا ہے جیسے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں۔''

وہ خاموش ہی رہا۔ ان کی اپنی سوچ اور معیار تھا۔ اگر وہ مزید کچھ کہتا تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا وہ بحث پسند نہیں کرتے تھے۔

تب ہی ہاشم خان دو تین شاپنگ بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ضمیر نے فوراً ہی کچن سے برآمد ہو کر بیگ اس کے ہاتھوں سے لیے اور واپس چلا گیا۔

''السلام علیکم چچا جان۔'' اس نے فوراً ہی ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کیسے ہو؟ اعظم خان کا کیا حال ہے؟ جب سے اسلام آباد گیا ہے بہت کم ملاقات ہوتی ہے۔''

''جی اللہ کا شکر ہے بابا بھی ٹھیک ہیں۔'' وہ ابھی تک کھڑا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا!''

''جی ذرا ضمیر کو دیکھ لوں کیا کر رہا ہے۔''

وہ کچن میں چلا گیا تو اس نے بابا جان کی طرف دیکھا۔

''اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ بھائی سے کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی تھی۔ کچھ کام شروع ہوا؟''

''بھائی تمہارا تو ماموں کے گھر ہی ڈیرے ڈال کر بیٹھا ہوا ہے گھر کم ہی آتا ہے۔ دو دن پہلے بات ہوئی تھی کارخانے کے لیے جگہ کا سودا کر لیا ہے اس نے۔''

تب ہی ہاشم کچن سے باہر نکلا اور اس کے پیچھے ٹرالی دھکیلتا ہوا ضمیر تھا۔ اس نے دیکھا ٹرالی لوازمات سے لدی پھندی تھی۔

"واہ بھئی! تم تو کسی گھریلو سگھڑ خاتون کی طرح سمجھ دار ہو گئے ہو۔"
ہاشم نے اسے گھورا۔
"یہ ضمیر اڈ حرام کچھ نہیں کرتا کیا؟" بابا جان نے سوالیہ نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔
ضمیر نے خوف زدہ ہو کر ہاشم کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔
"نہیں چچا جان! ہمارا کھانا، ناشتا سب کچھ یہ ہی کرتا ہے۔ گھر کی صفائی وغیرہ بھی۔ نگلٹس، کباب وغیرہ اسی نے فرائی کیے ہیں۔ میں تو بس ذرا دیکھنے گیا تھا کہ کیا کر رہا ہے؟"
یہ سچ ہی تھا۔ وہ تو فروزن چیزیں لے کر آیا تھا فرائی تو ضمیر نے ہی کیے تھے۔ بس وہ ذرا اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ لیکن یہ عابی مجال ہے کہ جو بھی زبان بند رکھ لے۔ میری تعریف بعد میں بھی کر سکتا تھا اگر کرنی ہی تھی تو۔ وہ اسے ایک بار پھر گھورتا ہوا اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ضمیر متشکر نظروں سے اسے دیکھتا ہوا سرو کرنے لگا۔
"مجھے فروزن چیزیں پسند نہیں ہیں لیکن کبھی کبھار کھا لیتا ہوں۔" بابا جان نے پلیٹ ضمیر کے ہاتھ سے لی۔
"کہا بھی تھا کوئی کک رکھ لو۔ بچہ بے چارہ کیا کیا کرے۔ صفائی کرے، تمہارے کپڑے استری کرے۔ برتن دھوئے اور پھر کھانا ناشتا بھی بنائے۔"
ضمیر نے جتاتی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا اور چائے بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا تھا اس کے والد بھائی چچا، تایا سب ہی شاہ صاحب کی زمینوں پر برسوں سے کام کرتے تھے۔ ہاشم اس کے پیچھے نہیں گیا تھا کیونکہ ایک چائے ہی ایسی تھی جسے وہ بہت اچھی بنا تا تھا۔ ہاشم نے اچھی طرح سے دم کرنا اور بنانا سکھا دیا تھا۔
چائے پی کر بابا جان اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"کچھ دیر آرام کروں گا۔ سفر کافی لمبا تھا۔ تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔ ایک وقت تھا ہر ہفتے لاہور آتا تھا۔ تب موٹر وے بھی نہیں تھی۔"
"آپ نے لاہور میں تعلیم حاصل کی؟" ہاشم نے پوچھا۔
"ہاں جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی یہاں سے ہی کی۔" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے عابی کی طرف دیکھا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"آئیں بابا جان۔" وہ انہیں اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔
"آپ آرام کریں۔"
"اتنا کچھ ابھی کھا لیا ہے تو کھانا اب رات کو ہی کھاؤں گا۔ اگر میں سو گیا تو جگانا مت۔ دو دن سے ٹھیک طرح سے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔"
"سب ٹھیک ہے نا بابا جان!" وہ پھر پریشان ہوا۔
"سب ٹھیک ہے بچے۔ اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی تو بیٹھے بیٹھے نیند آ جاتی ہے اور کبھی کروٹیں بدل بدل کر بھی نیند نہیں آتی۔"
اور وہ مطمئن سا ہو کر باہر آیا تو ضمیر باہر سے آ رہا تھا۔ چھوٹے ٹرے میں چائے کا کپ تھا۔
"یہ چائے واپس کیوں لے آئے ہو؟"
"وہ باہر تو صرف گارڈ تھا۔ گیراج میں بٹھا دیا ہے میں نے، چاچا امیرا تو کسی کام سے چلا گیا ہے۔ شاہ جی نے ہی کسی کام سے بھیجا ہے۔ گارڈ نے بتایا ہے مجھے۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ یہ چائے اب تم پی لو۔"

ہاشم اٹھا۔
"تم کہاں جارہے ہو؟"
"میرا فون خراب ہے کچھ ایک نیا فون خریدنا ہے اور اسے ٹھیک کروانا ہے۔ میرا سارا ڈیٹا اس میں ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک آجاؤں گا۔ ہاں تمہارے بابا جان تو اب دیر سے ہی کھانا کھائیں گے تم کھانے کی فکر نہ کرنا۔ باہر سے ہی آرڈر کریں گے۔ ہمارے ضمیر صاحب کے ہاتھ کا پکا کچھ کھالیا نا انہوں نے تو اسے زندہ نہیں چھوڑنا۔ یہ ہم ہی ہیں جو اس کا پکایا کچا پکا ہضم کر لیتے ہیں۔"
"یہ اب آپ مجھ سے زیادتی کررہے ہیں!" ضمیر نے برا سامنہ بنایا۔ "ایک تو مجھ غریب کے ذمے اتنے کام ڈال رکھے ہیں۔ اوپر سے گلہ بھی کررہے ہیں۔ مجھے تو بی بی جی نے صرف اوپر کے کاموں اور آپ لوگوں کا دھیان رکھنے کے لیے بھیجا تھا، آپ نے ہانڈی روٹی پر بھی لگا دیا ہے۔ دیکھ لیں شاہ جی کو بھی احساس تھا اس کا ......اور ہفتے میں تین دن تو باہر سے کھانا آتا ہے اور دو دن آپ ہوٹلنگ کے لیے چلے جاتے ہیں اور پھر پیچھے رہ گئے باقی دو دن تو......"
"او کے بھائی ضمیر احمد، ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں کہ تم ہمارا دھیان رکھتے ہو اب جا کر چائے پی لو شاباش ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"
ہاشم نے کہا تو وہ گردن اکڑاتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ یہ ہاشم اور عابی کی نرم مزاجی اور دوستانہ رویہ تھا کہ وہ ان سے بے تکلف ہو گیا تھا ورنہ حویلی میں تو شاہوں سے بات کرتے اس کے باپ دادا کی زبان بھی سوکھتی تھی اور یہاں آنے سے پہلے سب نے ہی باری باری سمجھایا تھا اسے کہ "نظریں نیچی رکھنا۔ اونچی آواز میں بات نہ کرنا۔ چھوٹے شاہ کچھ غلط بھی کہہ دیں تو آگے سے بحث یا تردید نہ کرنا۔" لیکن ہاشم خان اور چھوٹے شاہ تو سب سے مختلف تھے۔ دوستوں اور چھوٹے بھائیوں کی طرح ٹریٹ کرتے تھے۔
ہاشم گاڑی کی چابی لے کر چلا گیا تو عابی لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ اسے کافی کام کرنا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا کہ بابا جان کے جاگنے تک وہ کچھ نہ کچھ کرہی لے گا۔ ضمیر کچھ دیر بعد اس سے پوچھ کر گیراج میں چلا گیا تھا۔ گارڈ سے گپ شپ لگانے کہ اس کا تعلق بھی گاؤں سے ہی تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کررہی تھیں کہ پاس پڑا اس کا فون بج اٹھا اس نے فون اٹھایا۔ خیال تھا کہ شاید ہاشم نے کوئی بات پوچھنے کے لیے فون کیا ہو لیکن اسکرین پر چمکتا آفرین کا نام دیکھ کر وہ جیسے حیرت سے ساکت ہو گیا یعنی ...... یعنی کہ اس نے اسے فون کیا تھا...... آفرین گیلانی نے۔
"ہیلو آفرین! تم نے مجھے فون کیا...... یعنی مجھے۔ پہلے تو میں مار ے ت کے فوت ہی ہونے والا تھا۔ ویسے کیسے یاد کیا مجھ غریب کو؟"
آفرین نے تحمل سے اس کی بات سنی تھی۔
"سب خیریت ہے نا تمہارے بابا جان اچانک کیسے آگئے۔ تمہاری اماں جان ٹھیک ہیں نا!"
"ہاں ......لیکن ٹھہرو پہلے میں چٹکی کاٹ کر دیکھ لوں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اف......! یعنی کہ تم نے مجھے فون کیا۔ ہے سچ میں۔ مطلب کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ ہے تم میرے لیے۔ میری اماں جان کے لیے پریشان ہوئیں۔ ان کا حال پوچھا......" اس کی زبان چل پڑی تھی۔ "دل چاہ رہا ہے اٹھ کر بھنگڑا ڈالنے لگوں۔ ہاتھ پھیلا کر گول گول گھوم کر رقص کروں۔"
"تمہارا دماغ ٹھیک ہے عابی......!" آفرین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ "میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تمہارے بابا جان اچانک کیوں آئے ہیں۔ تم کہہ رہے تھے نا کہ کہیں تمہاری اماں جان کی طبیعت زیادہ خراب نہ

ہو۔ہارٹ پیشنٹ ہیں وہ۔"

"اللہ کا شکر ہے۔وہ ٹھیک ہیں بابا جان اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔لیکن مجھے کہنے دو کہ تم نے اس وقت اماں جان کی خیریت پوچھ کر مجھے جو خوشی دی ہے نا اس کے لیے بے حد شکریہ۔"

"اس میں بھلا ایسی خوشی کی کیا بات ہے؟"

"تم کیا جانو تم نے کبھی زندگی کے اس امرت کا مزا چکھا ہو تو تمہیں معلوم ہوتا کہ محبوب کا ذرا سا التفات کیسے چاہنے والے کے دل میں پھول بلکہ پورا گلستان کھلا دیتا ہے۔"

"اف اور عابی! تم سے تو بات کرنا محال ہے۔کیا کوئی رومانٹک ناول پڑھ رہے ہو۔اور تمہارے بابا جان کہاں ہیں؟" اس کا انداز مشکوک سا ہوا۔

"بابا جان سفر کی تکان اتار رہے ہیں یعنی کہ آرام کر رہے ہیں اور مجھے بھلا کوئی رومانی ناول پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔میری زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے دل کی آواز ہے۔تم مجھے بہت محبوب ہو گئی ہو۔بہت محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتے تم؟"

"ہاں کل اگر بابا جان یہاں رکے تو میں شاید یونی نہ آؤں تم پریشان نہ ہونا۔" اسے لگا تھا جیسے وہ فون بند کرنے لگی ہے تو اس نے بتایا۔

"میں بھلا کیوں پریشان ہوں گی؟" وہ جھنجلائی تھی۔

"ہاں تم بھلا کیوں پریشان ہو گی۔یہ میرا ہی پاگل دل ہے جو ایک دن تم یونی میں نظر نہ آؤ تو دیوانہ ہو جاتا ہے۔"

"چلو تم نے تسلیم تو کیا کہ تمہارا دل پاگل ہے تو اس پاگل پن کا علاج کروالو۔"

اس نے فون بند کر دیا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک فون ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا رہا، لبوں پر ایک ایک دلکش سی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔دل میں امید نے سورج کی پہلی کرن کی طرح آنکھ کھولی تھی کہ ایک روز آفرین حسان شاہ گیلانی کا دل بھی اس کی محبت میں دھڑکے گا۔یہ احساس، یہ تصور اس قدر دل نشیں تھا کہ اس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔حالانکہ ابھی تھوڑا سا کام رہتا تھا۔بند آنکھوں میں اس کا سراپا لہرا رہا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔وہ آفرین حسان شاہ گیلانی کیسے چپکے سے اس کے دل میں سند لگا کر قبضہ جما کر بیٹھ گئی تھی۔وہ جو ایک لاابالی سا اپنے آپ میں گم رہنے والا لڑکا تھا اسے اس نازک سی لڑکی نے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر یوں ہی تصور میں اس کے مختلف روپ دیکھتا رہا کبھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور کبھی وہ ہونٹ بھینچ لیتا۔

بابا جان جب بیڈ روم سے باہر آئے تو اس کے لبوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔چند نیے وہ یوں ہی اسے دیکھتے رہے پھر ہولے سے کھنکارے تو وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔

"آپ جاگ گئے بابا جان!"

"ہاں کافی آرام کر لیا۔گہری نیند سو گیا تھا۔" وہ بیٹھ گئے۔

"اور یہ تم کس خوب صورت خیال میں کھوئے مسکرا رہے تھے۔" ان کی نظروں میں تجسس تھا۔

"ارے نہیں بابا جان......!" وہ محتاط ہوا۔اب وہ بابا جان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے دن دھاڑے اس کے دل پر ڈاکہ ڈالا ہے۔سو بات بنائی۔"کام کرتے کرتے تھکا تو کچھ نئی کلپس دیکھنے لگا تھا۔اسی ایک کلپ کا تصور کر کے مسکراہٹ آ گئی تھی۔"

''ضمیر......'' سر ہلاتے ہوئے انہوں نے ضمیر کو آواز دی۔ ''پانی پلاؤ۔''
''جی شاہ جی۔''
ضمیر کچن چیئر پر بیٹھا فون پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ گھر میں کیبل وغیرہ نہیں تھی نہ ہی کوئی ٹی۔ وی وغیرہ تو عابی نے اسے اپنا پرانا موبائل ٹھیک کروا دیا تھا جس پر فارغ ہو کر ڈرامے وغیرہ دیکھتا رہتا تھا۔
ضمیر فوراً ہی پانی لے کر آ گیا۔ ''پانی پی کر انہوں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔
''یہ امیر اکسی کام سے گیا تھا دیکھ، جا کر واپس آ گیا ہے!''
''جی شاہ جی! تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہے چاچا۔ میں پانی دے کر آیا تھا۔''
انہوں نے سر ہلایا۔ ضمیر واپس کچن میں چلا گیا۔
''یہ ہاشم نظر نہیں آ رہا ہے، آرام کر رہا ہے کیا؟'' انہوں نے ہاشم کو وہاں نہ دیکھ کر پوچھا۔
''نہیں بابا جان! کسی کام سے گیا ہے، آتا ہی ہوگا۔''
تب ہی ہاشم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھے۔ سلام کر کے اس نے ضمیر کو آواز دی۔ ضمیر نے آ کر سامان اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
''کھانا لگواؤں بابا جان!'' اس نے پوچھا۔
''ہاں لگوا دو......'' انہوں نے کلاک کی طرف دیکھا جہاں تین بج رہے تھے۔ پانچ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنے جانا ہے۔''
ہاشم فوراً اٹھ کر کچن میں چلا گیا اور ضمیر کو ٹیبل پر برتن لگانے کے لیے کہا۔
''میں ذرا ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں اٹھ کر سیدھا باہر آ گیا۔''
بابا جان اٹھ کر بیڈ روم میں چلے گئے تو ہاشم نے کچن کے دروازے سے جھانکا۔
''میں نے بروسٹ وغیرہ کا آرڈر دیا تھا کیا آ گیا ہے؟''
''نہیں بھائی، ابھی تو نہیں۔''
ضمیر نے جو پھرتی سے ٹیبل پر پلیٹیں اور گلاس لگا رہا تھا مڑ کر اسے دیکھا تب ہی ڈور بیل ہوئی۔ ہاشم دروازے پر گیا۔ اور سامان لے کر واپس کچن میں چلا گیا۔ عابی خاموش بیٹھا اس کی پھرتیاں دیکھ رہا تھا۔ ضمیر بھی ٹیبل سیٹ کر کے کچن میں چلا گیا تھا۔ بابا جان آئے تو کھانا لگ چکا تھا۔
''اس سب کی کیا ضرورت تھی ہاشم۔ یہ تم نے کچھ زیادہ نہیں منگوا لیا۔ کڑاہی بروسٹ ایگ فرائیڈ رائس اور یہ سب۔''
وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تو عابی بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ہاشم نے ٹیبل کا جائزہ لیا اور بروسٹ کی ڈش کی طرف اشارہ کیا۔
''چچا جان! پہلے یہ بروسٹ لیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔''
''تم بھی بیٹھ جاؤ بیٹا۔'' انہیں اپنے چھوٹے لاڈلے بیٹے کا یہ دوست ہمیشہ سے بہت پسند تھا مہذب با ادب۔
''جی چچا جان۔''
بیٹھنے سے پہلے اس نے ضمیر کو ہدایت کی کہ وہ باہر گارڈ اور ڈرائیور کو کھانا دے کر خود بھی کھا لے۔ وہ بیٹھتے بیٹھتے یکدم کچن میں چلا گیا اور سیون اپ کی بوتل اور ایک باؤل میں برف لے کر آیا تو بابا جان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کھانے کے دوران وہ ان سے ان کی پڑھائی اور یونی کے متعلق پوچھتے رہے۔

کھانے کے بعد ہاشم نے خود آئسکریم سرو کی تو بابا جان اب کے کھل کر مسکرائے۔
"اب تو مجھے بھی کہنا پڑے گا کہ تم بہت سگھڑ ہو ایک گھریلو ذمہ دار خاتون کی طرح ہر بات کا دھیان ہے تمہیں۔"
ہاشم شرما سا گیا۔
"آپ کچھ دن رکیں گے نا چچا جان۔"
"ہاں آج رات تو رکنا ہی ہے۔ اگر کام نہ ہوسکا تو شاید کل بھی رک جاؤں۔ دوسرا بیڈ روم بھی ڈرائنگ روم کی طرح خالی ہے یا بیڈ وغیرہ ہے۔ اگر نہیں ہے تو میں نوردین سے کہتا ہوں کسی اچھے ہوٹل میں کمرا بک کروالے۔" انہوں نے گارڈ کا نام لیا۔
"وہ نہیں نہیں بابا جان۔ دوسرے بیڈ روم میں بھی بیڈ وغیرہ ہیں۔"
عابی نے فوراً کہا تھا۔ چند ماہ پہلے ہاشم کے بابا جان اور چھوٹے دونوں بھائی لاہور آئے تھے تو ان کے آنے سے پہلے دوسرا بیڈ روم بھی سیٹ کروا دیا تھا انہوں نے۔ دو ایکسٹرا میٹرس بھی خریدے گئے تھے۔
"ٹھیک ہے......" بابا جان اٹھے۔ "میں ذرا امیر سے بات کرلوں۔"
وہ باہر چلے گئے تو ہاشم ایک بار پھر کچن میں چلا گیا اسے کھانا وغیرہ فریج میں رکھوانا تھا۔ عابی اٹھ کر دوسرے بیڈ روم میں گیا کہ دیکھ لے کہ بیڈ روم میں صفائی وغیرہ ٹھیک ہے۔ بیڈ شیٹس میلی تو نہیں ہیں۔ چونکہ یہ بیڈ استعمال میں نہیں تھا تو ضمیر دو تین دن بعد ہی اس کی صفائی کرتا تھا اس بیڈ روم کا ایک دروازہ لاؤنج میں اور ایک گیراج میں کھلتا تھا۔ ایک کھڑکی بھی گیراج کی طرف کھلتی تھی۔ بیڈ روم کا جائزہ لے کر اس نے گیراج میں جانے کے لیے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسے بابا جان کی آواز سنائی دی جو کھلی کھڑکی سے آرہی تھی بالکل غیر ارادی طور پر وہ رک گیا تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے۔
"ستارہ بیگم کا کچھ اتا پتا چلا کہ نہیں۔"
وہ بابا جان کی بات نہیں سننا چاہتا تھا لیکن ان کے منہ سے ایک اجنبی نام سن کر متجسس ہوا۔
"جی شاہ جی! وہی تو پتا کرنے گیا تھا۔ محلہ تو اجڑ پجڑ گیا ہے۔ تب جو لوگ وہاں تھے اب نہیں۔ ایک پان والا وہاں اب بھی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ پان لینے کے بہانے گپ شپ لگائی وہ بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ پچاس ساٹھ کا تو وہ بھی ہوگا۔ کہہ رہا تھا ستارہ بیگم تو اس کی کم عمری میں ہی مر کھپ گئی تھی ویسے وہ تو چالیس سال پہلے ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور ستارہ بیگم کی لڑکیاں بھی دوسروں کی طرح ادھر ادھر چلی گئیں کوئی ملتان، کوئی فیصل آباد۔"
"میں نے تجھے ستارہ بیگم کا شجرہ نسب معلوم کرنے کے لیے نہیں کہا تھا!۔ اس کے گھر پا کر یہ کرنا تھا کہ وہاں اس کے گھر میں کون ہے اور اس کی سگی بیٹیاں کہاں ہیں؟" وہ جھنجلائے تھے۔
"وہ ہی جی وہ ہی تو بتانے لگا ہوں۔ پان والا کہہ رہا تھا ایک کو ٹی۔ بی ہوگئی تھی مر گئی۔ باقی تین کا پتا نہیں کہاں گئیں۔ بڑی والی تو تب بھی۔ چالیس سال پہلے پینتالیس پچاس کی تو تھی مر کھپ گئی ہوگی وہ بھی۔ زندہ ہوگی تو اسی نوے کی تو ہوگی۔ بیٹھ کر کہیں اللہ اللہ کر رہی ہوگی۔" امیر کو تفصیل سے بات کرنے کی عادت تھی۔
"اوئے کمبخت! ادھر ادھر کی ہانکے جا رہا ہے اپنی یہ رام لیلا بند کر۔ ستارہ بیگم کی نواسیاں نواسے بھی تو تھے۔ کیا وہ سب بھی مر کھپ گئے۔"
"پتا نہیں جی۔ وہ جو اس کی بڑی بیٹی تھی نا...... وہ ہی جی جس نے ایک کپڑے کے دکان دار سے شادی کی تھی اس کی ہی اولاد تھی صرف اور...... گیارہ بارہ سال بعد وہ اپنے بچے لے کر واپس آگئی تھی ستارہ بیگم کے پاس

، باقیوں کا پتا نہیں ان کی اولاد تھی یا نہیں تو خیر میں نے اس پان والے کو نوٹ دکھائے ہیں کہہ رہا تھا ایک دو روز تک ستارہ بیگم کی سب آل اولاد کے متعلق معلومات حاصل کر لے گا۔" امیرے کی لمبی بات انہوں نے تحمل سے سنی تھی۔

"سب آل اولاد نہیں۔ صرف ایک بیٹی کے اور اس کی اولاد کے متعلق سب معلومات اور تم جانتے ہو کس کے متعلق۔"

"جی شاہ جی...... بالکل جانتا ہوں۔"

"اور اس کے پرانے دوستوں کو ڈھونڈا۔ کوئی سنگی یار ملا اس کا۔"

"نہ جی کوئی نہیں ملا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان کے سارے دوستوں کو نہیں جانتا۔ بس ایک ہی یار کا پتا تھا۔ جس کے گھر میں جاتے رہتے تھے وہ۔ اس کے محلے سے پتا چلا کہ وہ تو عرصہ ہوا کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔"

"ٹھیک ہے تم یہاں دو تین روز کسی ہوٹل میں رک جانا...... اور ساری معلومات لے کر آنا۔ اور ہاں وہاں اس علاقے میں بھی گئے تھے جہاں نورین نے اسے دیکھا تھا۔ ارد گرد سے پوچھا۔" ان کے لہجے میں اضطراب سا تھا۔

"جی شاہ جی! ادھر تو پہلے گیا تھا۔ اسلامیہ پارک میں میانی والے قبرستان کے باہر دیکھا تھا نوردین نے...... "نوردین ان کے گارڈ کا نام تھا۔" پر شاہ جی، اسے غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ پھر اگر غلط فہمی نہ بھی ہوئی ہو تو ایک ایک گھر کا دروازہ تو نہیں کھٹکھٹایا جا سکتا پھر کیا پتا وہ کہیں اور کسی اور علاقے میں وہاں کسی کام سے آیا ہو۔ پھر بھی شاہ جی، میں جب تک یہاں ہوں ادھر کا چکر لگاتا رہوں گا۔ کیا پتا اللہ کو منظور ہوا تو نظر پڑ جائے۔"

وہ عمر میں چند سال ان سے بڑا اور ان کا منہ چڑھا راز دار ملازم تھا اس لیے بحث بھی کر لیتا تھا ورنہ ان کے بچے بھی یہ جرأت نہیں کرتے تھے۔

"ہوں ٹھیک ہے لیکن دھیان رکھنا کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں ایک صورت کے نہ جانے کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ......"

اور وہ الجھا الجھا سا باہر آ کر لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ پتا نہیں یہ ستارہ بیگم کون تھی اور بابا جان کسے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات بابا جان سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا سو پھر اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا تاکہ اپنا ادھورا اسائنمنٹ مکمل کر سکے۔ لیکن دھیان بار بار بابا جان کی باتوں کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اماں جان کو علم ہو چھٹیوں میں جاؤں گا تو ان سے پوچھوں گا۔ اس نے فیصلہ کیا اور لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا تب ہی ہاشم کچن سے باہر آیا۔ اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیا کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟" ہاشم کی تیز نظر تھی اس کی۔

"نہیں تو بس دل نہیں لگ رہا کام میں۔" عابی نے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا۔

"ہاں تو جب دل لگے تب کر لینا۔"

ہاشم کے مشورہ دینے سے پہلے ہی وہ لیپ ٹاپ بند کر چکا تھا۔

"کل یونی جاؤ گے کیا پروگرام ہے؟"

"بابا جان کا ارادہ اگر کل ٹھہرنے کا ہوا تو پھر نہیں جاؤں گا بلکہ اگر وہ کل گئے بھی تو ظاہر ہے دس گیارہ بجے کے بعد ہی جائیں گے تو میں نہیں جاؤں گا تم چلے جانا۔"

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یونی نہیں جائے گا لیکن صبح ناشتے کے بعد جب اس نے یونی نہ جانے کا بابا جان کو

بتایا تو انہوں نے صاف منع کر دیا۔
"کوئی ضرورت نہیں میرے لیے چھٹی کرنے کی۔ اپنی پڑھائی کا حرج مت کرو اور میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں کہ اکیلا گھر پر نہیں رہ سکتا اور یہ ضمیرا کس مرض کی دوا ہے؟ کوئی کام ہوا تو اس سے کہہ دوں گا۔"
اور یوں وہ ہاشم کے ساتھ ہی بابا جان کو خدا حافظ کہہ کر یونی کے لیے نکلا تھا۔
آفرین اپنے دھیان میں مگن ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جب وہ پیچھے سے چکر کاٹ کر یکدم اس کے سامنے آیا تھا وہ ٹھٹک کر رک گئی۔
"تم نے تو کہا تھا کہ شاید نہیں آؤ گے۔"
"ہاں تو بابا جان نے تو ایسے سلوک کیا میرے ساتھ جیسے مائیں پرائمری کے بچوں کے ساتھ کرتی ہیں کہ بچے لاکھ کہیں آج اسکول نہیں جانا وہ زبردستی بھیج دیتی ہیں۔" وہ اب اس کے ہم قدم ہوا تھا۔
"تو تم نہیں آنا چاہتے تھے۔" وہ مسکرائی۔
"میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تمہیں دیکھے بغیر میرا دن کیسے گزرے گا۔ کیا تمہیں میرے آنے سے خوشی نہیں ہوئی؟ کیا تم بھی سوچ رہی تھیں کہ آج تمہارا دن بہت بور اور بہت اداس گزرے گا؟" اس کی نظروں نے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیا۔
"نہیں بھلا میں کیوں ایسا سوچوں گی؟" اس نے نظریں چرائیں لیکن اسے یکدم اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی جگمگاہٹیں عابی کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی تھیں۔ وہ ایک خوش گوار سے احساس میں گھرا متبسم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"لیکن جس روز تم نہیں آتی ہو تو میں تو بہت اداس ہوتا ہوں۔ زمین آسمان سورج چاند ستارے پھول سب مجھے اداس لگتے ہیں۔ بے رنگ اور پھیکے سے۔"
"دن کو چاند ستارے نہیں ہوتے۔" اس کے لبوں کے کونے پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"ہاں تو میں بھی محاورتاً کہہ رہا ہوں۔" تب ہی ہاشم جو پیچھے ہی رک کر کسی دوست سے بات کرنے لگا تھا تیز تیز چلتا ہوا ان کے ہم قدم ہوا تھا۔
"سنا ہے ہماری پوائنٹ نے کل اسلامیہ کالج کے کسی لڑکے کو ہٹ کیا ہے۔ تھینک گاڈ کہ اس کی زندگی بچ گئی۔ زخمی ہوا ہے۔ شاید فریکچر ہوا ہے۔ پھر بھی لڑکے کہہ رہے ہیں کہ اسلامیہ کالج کے لڑکے ہماری بسوں پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔"
"تو مطلب واپسی پر پوائنٹ نہیں ملے گی۔" وہ پریشان ہو گئی تھی صبح وہ لیٹ ہو گئی تھی تو حسان شاہ کے ساتھ رکشے پر آ گئی تھی۔ وہ اسے ڈراپ کر کے اپنے بینک گئے تھے۔
"میرا خیال ہے تب تک ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ آج ہماری تین کلاسز ہیں۔"
ہاشم نے خیال ظاہر کیا لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ آخری کلاس لے کر باہر نکلے تو لڑکے لڑکیاں گروپوں کی شکل میں کھڑے تھے لیکن پوائنٹ کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔
"میرا خیال ہے یہاں کھڑے ہونے کا فائدہ نہیں ہے۔ اگلے کسی اسٹاپ سے وین یا رکشا مل جائے گا۔"
آفرین نے کئی دوسرے طالب علموں کی تقلید میں قدم آگے بڑھائے تو عابی بھی اس کے ساتھ تھا۔
"اسٹاپ تک میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ جانے کب وین یا رکشا ملے۔" اس نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر نہیں کی تھی جانتا تھا کہ وہ نہیں مانے گی۔
دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوسرے اسٹاپ پر آئے تھے وہ روڈ کی طرف دیکھ رہی تھی جب کہ عابی

بڑے دھیان سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ بابا جان کی گاڑی بہت قریب سے گزر گئی تھی اور انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا لیکن رکے نہیں تھے جب کہ ایک رکشا پھڑ پھڑ کرتا بالکل فٹ پاتھ کے قریب آ کر رکا تھا اور اس میں سے بختاور بیگم نے جھانکتے ہوئے اسے آواز دی۔

"اے ہے سنو! تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔"

آفرین نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "وین کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ادھر آ جا۔ میں چھوڑ دیتی ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔" اس کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑی تھیں۔

"تیری مرضی کھڑی رہ۔" انہوں نے رکشے والے کو چلنے کے لیے کہا۔

"تم انہیں کیسے جانتی ہو۔"

وہ اس کی کلاس فیلو سعدیہ تھی جو ابھی دو منٹ پہلے ہی اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ ایک بار نانو کو ہاسپٹل میں ملی تھیں تو ان سے جان پہچان ہو گئی تھی نانو کی۔"

سعدیہ کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ وہ سچ نہ بتا سکی حالانکہ اس سے پہلے شاید ہی کبھی اس نے جھوٹ بولا ہو۔

"میری خالہ کے سسرالی گھر کے قریب ہی ان کا گھر ہے۔ ایک بار میں خالہ کے ساتھ ادھر گئی ہوئی تھی تو یہ خاتون اپنے گھر سے نکل رہی تھیں خالہ بتا رہی تھیں کہ یہ......"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی کہ وین آ گئی۔ وہ تیزی سے وین کی طرف بڑھ گئی اس نے مڑ کر عالی کی طرف دیکھا جو اسے سعدیہ سے بات کرتے دیکھ کر ذرا آگے چلا گیا تھا اور اس نے ایک رکشا روک لیا تھا کہ وہ اس کے روٹ کی وین نہیں تھی۔ عالی نے اشارے سے اسے بلایا تو وہ سر جھٹک کر رکشے کی طرف بڑھ گئی۔ اور رکشا میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے تھینک یو کہا۔

عالی مسکرا دیا اور اس وقت تک وہاں ہی کھڑا رہا جب تک رکشا نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

☆☆☆

"ماسی......"

عادت کے مطابق قمرن اپنے گھر کی منڈیر پھلانگ کر ان کی چھت پر آئی تھی اور اب منڈیر سے نیچے جھانک رہی تھی۔ ہاجراں صحن میں گھڑے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اس نے مڑ کر اوپر منڈیر کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے آج صبح صبح ہی چھت کی سیر کرنے آ گئی ہو۔"

"صبح کہاں ماسی، میں تو سارے کام مکا کے ختم کر کے آئی ہوں۔ میری بھرجائی (بھابھی) تو آج چائے پانی کر کے بھرا کے گھر چلی گئی تھی۔ آج اس نے آنا ہے کراچی سے۔"

"اچھا یہ تو اچھی بات بتائی تم نے۔ اس کی ماں بے چاری بہت یاد کرتی تھی اسے، دو سال ہونے والے ہیں اسے کراچی گئے۔ کل میں بھی جاؤں گی اس سے ملنے۔" ہاجراں مڑ کر پھر دیگچی مانجھنے لگی۔

"ماسی! سن تیرا نواسا چلا گیا کیا۔" وہ منڈیر پر خطرناک حد تک جھکی نیچے چاروں طرف نظریں گھما رہی تھی۔

"نہیں۔"

ہاجراں نے مڑے بغیر ہی جواب دیا تو وہ دھپ دھپ کرتی ہوئی سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی اور صحن، برآمدے ہر طرف کھوجتی نظروں سے دیکھتی ہاجراں کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

"نظر تو نہیں آ رہا۔"
"کمرے میں ہے شاید سو گیا ہے۔" ہاجراں نے حمام کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کھنگال کر ٹوکرے میں رکھی۔
"چل ہٹ ماسی، میں دھو دیتی ہوں برتن۔"
"رہنے دے اب تو دھل ہی گئے ہیں۔ یہ دو چار ہی تو رہ گئے ہیں۔"
"چل دو چار ہی دھو دیتی ہوں۔" قمرن نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
"اچھا دھو دے پھر۔ کھرا بھی دھو دینا اور برتنوں کا ٹوکرا چبوترے پر رکھ دینا اور اوپر یہ جالی والا دوپٹا دے دینا۔ مکھیاں نہ بیٹھیں برتنوں پر۔"
وہ اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ تھکن سے وجود نڈھال سا ہو رہا تھا۔ ایک رتجگا اور دوسری گڈی کی پریشانی کہ کس ناقدرے کے پلے باندھ دیا تھا اسے۔
"یہ اتنے سارے برتن کیا تیرے نواسے نے تین تین پیالیوں میں چائے پی ہے اور......"
قمرن پیڑھی پر بیٹھ گئی تھی اور اب ٹوکرے میں دھلے پڑے برتنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔
"نہ میرا نواسا کوئی پاگل، جھلا ہے! وہ تو رات کو ہمت نہیں تھی برتن دھونے کی تو ایسے ہی رکھ دیے تھے۔" ہاجراں ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔
"تو مجھے بلا لیتیں ماسی، میں آ کر دھو دیتی!"
"ہاجراں جانتی تھی کہ وہ سالک کی موجودگی میں اپنے نمبر بنانے کی کوشش کرتی تھی۔ عام حالات میں ہاجراں کو خود ہی اپنا کام کرنے کی عادت تھی۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ قمرن نے اسے برتن دھونے یا جھاڑو دینے کا کہا ہو۔ بلکہ وہ جب بھی آتی تھی اگر وہ کوئی کام کر رہی ہوتی تو کہتی تھی "چل ہٹ ماسی میں کر دیتی ہوں تیرا کام۔" لیکن ہاجراں منع کر دیتی تھی جانتی تھی کہ اپنے گھر میں کم ہی کام کو ہاتھ لگاتی تھی لیکن آج وہ بے حد تھکی ہوئی اور نڈھال سی تھی۔ دل تھا کہ جیسے اس پر منوں بوجھ آ پڑا ہو۔ ایسا بوجھ جو اذیت دیتا تھا۔ ایسی اذیت، ایسا درد جو پورے وجود میں پھیلا ہوا تھا۔
وہ پاؤں نیچے زمین پر لٹکائے چارپائی پر بیٹھی کچھ دیر قمرن کو دیکھتی رہی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گاؤں کی نا سمجھ عورتوں کی طرح بال کھول کر پورے صحن میں چکراتی ہوئی بین کرے، اونچا اونچا روئے۔ عادی کو پکارے، اس کے ابا کو یاد کر کے روئے۔ وہ سارے بین جو اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے تھے آج کچے صحن میں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر انہیں ہونٹوں تک لے آئے دل جیسے پھٹنے کو تھا۔ وہ کبھی کھل کر نہیں رو سکی تھی عادی نے کہا تھا۔
"ماں رونا نہیں بالکل بھی آج تیرے حوصلے اور صبر کا امتحان۔"
اور وہ اٹھائیس سالوں سے اس امتحان گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔ سارے بین اس کے اندر ہی مر گئے تھے اور آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہر خسارے پر چیخ چیخ کر روئے۔ سب گاؤں والے عزیز و اقارب اس کے گھر میں جمع ہوں، باری باری سب اسے گلے لگا کر تسلی دیں۔ وہ ان کے گلے لگ کر روئے، ماتم کرے شاید دل پر دھرا بوجھ کم ہو جائے۔
اس نے اپنی سسکی دبانے کے لیے ہونٹ بھینچ لیے اور پاؤں اوپر کر کے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس طرح کے قمرن کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ ضبط کے باوجود چند آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ قمرن نے برتن دھو کر برتنوں والا ٹوکرا چبوترے پر رکھا اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی چارپائی کے قریب آئی۔
"لے ماسی! میں نے برتن تو دھو دیے ہیں اور کوئی کام ہو تو بتا دے کر دیتی ہوں۔"

"نہیں کوئی کام نہیں۔" ہاجراں نے کروٹ بدل کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"ہائے ماسی! یاد آیا رات کو ہمارے گاؤں میں چور گھس آئے تھے۔ بھائیا عزیز رات کو کھیتوں میں پانی لگانے گیا ہوا تھا وہ گھر آیا تو اس نے بتایا اپنے چودھری فضل دین کے باڑے میں آئے تھے جانور کھول رہے تھے تو ان کے بندوں نے دیکھ لیا اور پکڑ کر بند کر دیا ذخیرے والی کوٹھری میں پر وہ رات میں ہی کوٹھری کی کھڑکی توڑ کر بھاگ گئے۔ فجر ویلے جب سب لوگ اکٹھے ہوئے کہ انہیں پکڑ کر تھانے میں لے جائیں اور دروازہ کھولا تو کھڑکی کے پٹ ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ غائب۔ یاد ہے نا ماسی پچھلے سال بھی یہ رسہ گیر دو تین بار جانور لے کر چلے گئے تھے اور پھر پکڑے بھی نہیں گئے تھے۔"

"ہاں۔" ہاجراں نے جیسے ایک اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ رات سے جو دھڑکا سا لگا ہوا تھا وہ دور ہو گیا تھا۔

"بھائیا کہہ رہا تھا دو تین اور وارداتیں بھی کر چکے ہیں۔ پندرہ بیس دن پہلے ساتھ والی ڈھوک سے بھی ایک گائے اور بھینس کھول کر لے گئے تھے۔

ارے ہاں مجھے بھل (بھول) ہی گیا جو بات پوچھنے آئی تھی وہ پوچھی ہی نہیں۔ بھائیا کہہ رہا تھا کہ جب وہ فجر ویلے گھر آ رہا تھا تو تمہارے گھر کے باہر دو عورتیں اور ایک پتلون والا لڑکا کھڑا تھا۔ کون تھے چلے بھی گئے یہاں تو کوئی نظر ہی نہیں آ رہا۔ میں سمجھی شاید گڈی آپا اور مانو آئی ہیں کسی کے ساتھ۔"

ہاجراں یکدم کروٹ لے کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"سالک کا دوست اور اس کی ماں، بہن تھی۔ یہ ساتھ والے گاؤں میں آئے تھے۔ سالک سے بات ہوئی تو سالک نے بتایا کہ میں بھی ادھر نانی کے گھر آیا ہوا ہوں تو واپسی پر مجھے بھی لے جانا۔ گاڑی میں آرام سے چلا جاؤں گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک دو روز ٹھہریں گے لیکن وہ تو آج ہی آ گئے، جلدی واپس جانا پڑ گیا تھا انہیں تو میں نے نہیں جانے دیا اس کو۔ ابھی کل ہی تو آیا ہے وہ تو بس کھڑے کھڑے ہی آئے تھے اور چلے گئے گڈی (کار) ادھر باہر سڑک پر ہی چھوڑ آئے تھے۔"

ہاجراں کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ تھی سو ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ لیکن قمرن کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"یہ تو تم نے بڑا اچھا کیا ماسی۔ ابھی رج کے (جی بھر کے) تو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اپنے نواسے کو اور وہ چلا بھی جاتا..." اور میں نے بھی کہاں رج کے دیکھا اگلا جملہ اس نے دل میں کہا تھا۔

ویسے جب بھائیے نے بتایا نا کہ تیرے گھر پروہنے (مہمان) آئے ہیں تو میں خوش ہو گئی تھی کہ اتنے سالوں بعد مانو اور گڈی آپا سے ملوا دی اور......" بات کرتے کرتے اس کی نظر ہاجراں کی بھیگی پلکوں پر پڑی تھی شاید آنسو پلکوں پہ اٹکے ہوئے تھے۔

"تم رو رہی تھیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں بس یوں ہی گڈی اور عادی یاد آ رہے تھے۔" اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگی پلکیں پونچھیں۔

"تیرے عادی کا تو پتا نہیں ماسی، کہ اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں پر گڈی آپا تو ہیں نا وہ کیوں نہیں آتیں یہاں تمہیں ملنے۔ میری پھوپھی جب بھی آتی ہے گڈی آپا کے متعلق پوچھتی ہے۔ کہتی ہے جب بھی گڈی آئے مجھے اطلاع بھجوا دینا۔ میں آؤں گی اس سے ملنے۔ میں نے بتایا کہ وہ تو اتنے سالوں سے آئی ہی نہیں۔ مانو اور سالک ہی کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ لگتا ہے گڈی آپا کی ساس انہیں آنے نہیں دیتی۔ قسے (قسم سے) ماسی، گڈی آپا آئیں نا ایک بار تو میں انہیں اپنی ساس کو قابو میں رکھنے کے گر بتاؤں گی، میری سہیلیاں جب اکٹھی ہوتی ہیں نا تو ایک دوسرے کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے کیسے اپنے میاں اور ساس کو قابو میں کر رکھا ہے۔ میں بھی ساری باتیں

کانوں میں ڈالتی رہتی ہوں۔" اس نے فخر سے اس کی طرف دیکھا۔
"ناساجدہ تو منع نہیں کرتی اسے آنے سے۔" ہاجراں کے لبوں سے بے اختیار لکلا تھا۔
"تو کیا تیرا جوائی (داماد) منع کرتا ہے۔ ہوتے ہیں کچھ مرد ایسے خواہ مخواہ رعب ڈالنے کے لیے بیوی پر پابندیاں لگادیتے ہیں......" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے بڑی مدبر سی بنی کہہ رہی تھی۔ "تو بھی تو کچھ نہیں کہتی ایک بار جا کر اچھی طرح اپنے بھانجے کے کان کھینچ۔ سمجھا اسے کہ وہ کوئی لاوارث نہیں ہے۔ باپ بھائی نہیں ہے نا تو اس لیے وہ شیر بنا ہوا ہے گاؤں کی دھی ہے۔ چاچا، ماموں، بھائی سارے رشتے ہیں اس کے۔"
ہاجراں خاموشی سے اسے بولتے سن رہی تھی۔
"بس ایک بار ہمت کر کے چلی جا اس کے سسرال اور اچھی طرح سنا کے آنا۔ میری پھوپھی کہتی ہے پیچھے میکے سے کوئی خیر خبر لینے نہ آئے تو کڑی (لڑکی) لکھ سے بھی ہولی (ہلکی) ہو جاتی ہے۔"
"ہاں جاؤں گی۔ سالک کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ دس بارہ دن رہوں گی ادھر۔"
"سچ ماسی، تو پھر واپس پر گڈی آپا اور مانو کو ساتھ ہی لے کر آنا۔ لگ پتا جائے گا مانو کے ابے (ابا) کو......" وہ خوش ہو گئی تھی۔ اسے بتانا کہ پھوپھی بھی اسے بہت یاد کرتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ گڈی آپا اور اس نے پنجویں (پانچویں) تک ساتھ ہی پڑھا تھا۔ پھر گڈی تو پڑھنے چلی گئی شہر اور میری پھوپھی گھر ہی بیٹھ گئی۔ لیکن گھر ساتھ ساتھ تھے نا تو جب گڈی آپا اسکول سے آتیں تو وہ گھنٹوں چھت پر بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں۔"
ہاجراں نے سر ہلایا اور اس کی نظریں ایک بار پھر سالک کے کمرے کے بند دروازے کی طرف اٹھیں۔
"یہ تیرا نواسا کیا گھوڑے گدھے بیچ کر سوتا ہے۔"
"کئی راتوں کا جگ راتا (رتجگا) ہے۔ ڈاکٹری کی پڑھائی بڑی اوکھی ہوتی ہے، ساری ساری رات جاگ کر پڑھتا تھا تو اب نیندیں تو پوری کرنی ہیں نا!" ہاجراں کے لہجے میں اس کے لیے ماں تا کی شفقت اور محبت تھی۔
"چلو اب تو پڑھائی ختم ہو گئی ہے، آرام سے کرسی پر بیٹھ کر مریضوں کو نسخے لکھ لکھ کر دے گا۔" تصور میں گاؤں کی ڈسپنسری میں بیٹھنے والا ڈاکٹر آیا تو لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"نہ جھلیے (پاگل) ابھی کہاں اس کی پڑھائی ختم ہوئی ہے۔ ابھی پہلے تو ہاؤس جاب کرنا ہے۔ پھر دو اور امتحان دے گا اور پھر باہر جائے گا چھ سات سال۔ ہاں پڑھ کر بڑا ماہر ڈاکٹر بن کر آئے گا۔" ہاجراں نے سوچا اسے بتا دے کہ وہ آس نہ لگا کر بیٹھی رہے۔
"ہیں تو کیا ساری زندگی پڑھتا ہی رہے گا۔ شادی وادی نہیں کرنی کیا؟" اسے دھچکا لگا تھا جیسے۔
"ہاں وہ تو ایسا ہی کہتا ہے کہ آٹھ نو سال تک اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"
"نہ تو کیا بڈھا ہو کر شادی کرے گا۔ گڈی آپا کو بھی تو شوق ہو گا نا اس کے سر پر سہرا سجانے کا ماسی، تو جائے گی نا تو آپا کو سمجھانا کہ اسے ادھر ہی روک لے جتنا پڑھنا ہے نا یہاں ہی پڑھ لے ادھر سے کوئی چٹی چمڑی والی میم لے آیا نا تو سر پکڑ کر رو دے گی۔"
گڈی آپا تو روتی یا نہ روتی اصل رونا تو اسے آ رہا تھا ابھی سے۔ اس کے اماں ابا نے کہاں آٹھ سال تک اسے بٹھا کر رکھنا تھا۔
"اس نے کیا سمجھانا اسے قمرن...... وہ تو مانو کو بھی بھیج رہی ہے باہر پڑھنے۔ اور سالک تو کہتا ہے۔ پڑھ کر وہ وہاں ہی نوکری کرنے گا اور اپنے اماں ابا کو بھی بلا لے گا۔" ہاجراں اسے مایوس کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے جیسے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی۔
"نہ ماسی...... یہ کیا کہہ رہی ہے تو......؟" اس کی آنکھیں جیسے پھٹنے والی ہو گئی تھیں۔ "اپنی جوان جہان

لڑکی کو دوسرے ملک بھیجنے کے لیے آپا کا دل کیسے راضی ہوا۔"
"اولاد کی خوشی اور مستقبل کے لیے دل کو راضی کرنا ہی پڑتا ہے قمرن۔" ہاجراں کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"نی قمری...... "تب ہی منڈیر پر سے جھانکتے ہوئے قمرن کی ماں نے آواز دی۔" تجھے اوپر چھت پر ٹب لینے بھیجا تھا اور تو ادھر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ ڈھیر پڑا ہے کپڑوں کا مجھ اکیلی سے نہ دھلیں گے، آ کر دھلوا۔ بھرجائی تو تیری اب کل ہی آئے گی۔"
"اچھا آ رہی ہوں۔"
قمرن نے اوپر منڈیر کی طرف دیکھا لیکن اس کی اماں بات کر کے واپس جا چکی تھی۔ دید کی حسرت لیے نظریں سالک کے کمرے کے بند دروازے کی طرف اٹھیں اور پھر وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ہاجراں نے اس کی آنکھوں کی حسرت کو تاسف سے دیکھا اور دل ہی دل میں دعا کی۔" یا اللہ اس کے دل سے سالک کا خیال نکال دے کہ اس کے دل اور زندگی میں کہیں بھی قمرن کی جگہ نہیں ہے۔ جھلی ہے ربا تو ہی اسے عقل دے۔"
وہ ایک بار پھر چارپائی پر لیٹ گئی اور آنکھوں کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ روشنی جیسے آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اور دل تھا کہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا۔
"مجھ جیسی سیدھی سادی عورت کے لیے اتنی آزمائشیں کیوں میرے مولا! اگر وہ زندہ ہے تو آ جائے اگر نہیں تو میرے دل کو صبر عطا فرما۔"
آنکھوں میں پھر سے پانی اکٹھا ہونے لگا تھا۔ جسے اس نے شعوری کوشش سے پیچھے کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گڈی اور عادی کا دکھ آج جیسے سینہ چیرتا تھا۔
"سالک کو دیکھوں جاگ گیا ہوگا۔ اسی سے بیٹھ کر باتیں کروں تو دھیان بٹ جائے گا۔"
زیر لب کہتی ہوئی وہ سالک کے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ ابھی اس نے برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سالک دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ کھدر کے کلف لگے اسکن کلر کے سوٹ میں بال اچھی طرح سے سیٹ کیے خوشبو میں مہکتا وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔
اس نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔ اسے دیکھتی تو اسے عادی یاد آ جاتا، وہ بھی تو ایسا ہی بانکا سجیلا تھا۔ وہ تو گڈی اور عادی کی نظر ہی اتارتی رہتی تھی پھر بھی نظر لگ گئی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہیں۔" سالک اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔
"اللہ نظر بد سے بچائے، کہیں جا رہے ہو کیا؟ تمہیں دیکھ کر عادی یاد آ گیا۔" یہ کہتے کہتے اس نے بات بدل دی تھی۔
"ہاں دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ میرا بچپن کا یار سیف علی بھی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ کل فون پر اس سے بات ہوئی تھی تو میں نے بتایا تھا نانو کی طرف جا رہا ہوں تو اس نے کہا وہ بھی چھٹی لے کر آ جاتا ہے۔ عرصہ ہو گیا ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ بھی رات آ گیا تھا۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔
سیف علی نے ایف ایس سی کے بعد اپنے والد کی اچانک وفات کی وجہ سے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور واہ کینٹ میں کسی گورنمنٹ کے ادارے میں نوکری کر لی تھی۔ فون پر دونوں کا رابطہ تھا۔
"کب تک آ جاؤ گے؟" ہاجراں نے پوچھا۔
"تھوڑی دیر تو ہو ہی جائے گی۔ ایک دو دوسرے دوستوں کی طرف بھی جائیں گے، آپ پریشان نہ

ہونا۔'' کل کے واقعے کی وجہ سے اسے خیال آیا کہ کہیں اس کے دیر ہو جانے سے ہاجراں پریشان نہ ہو جائے۔
ہاجراں نے سر ہلایا۔
''ویسے یہ صبح صبح کون آیا ہوا تھا۔ باتوں کی آواز آرہی تھی۔'' وہ اب صحن کی طرف جا رہا تھا ہاجراں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
''اور کس نے آنا تھا اتنے سویرے۔ قمرن تھی۔ ہمیشہ کی طرح اپنی دیوار سے ہمارے چھت پہ کود کر آئی تھی۔'' ہاجراں صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔
''اسے اپنے گھر میں چین نہیں ہے جو صبح صبح اٹھ کر ادھر آگئی۔'' وہ چارپائی کے سامنے کھڑا ہاجراں کو دیکھ رہا تھا۔
''چین ہی تو نہیں ہے۔ تجھے دیکھنے کی چاہ میں چلی آئی جھلی۔'' ہاجراں کو بلا وجہ جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی۔
''تو سمجھا میں اسے ناں۔ میرے اور اس کے راستے الگ ہیں۔ اپنی منزل کھوٹی نہ کرے۔'' سنجیدگی سے کہتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
سمجھانے سے اگر محبت کرنے والا محبت سے باز آجاتا تو پھر سیاپا ہی کس بات کا تھا۔ سمجھنے سمجھانے سے تو دور تک واسطہ نہ تھا اس کمبخت محبت کا۔ ورنہ کیا ہاجراں نے سمجھایا نہیں تھا قمرن کو لیکن قمرن تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔ اور اب جب سے گھر آئی تھی ہاجراں کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔'' وہ آٹھ نو سال تک شادی کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ باہر ہی رہے گا مڑ کر نہیں آئے گا۔ وہ نہیں آئے گا قمرن اسے نہیں دیکھے گی تو مر ہی جائے گی۔ محبت کی آگ جیسے اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔
کپڑے دھوتے ہوئے وہ مسلسل سوچتی رہی کہ کیسے کس طرح سالک کو اپنی محبت اور وفا کا یقین دلائے؟ کیسے اس کے دل میں اپنی محبت کی آبیاری کرے؟ کیسے وہ بھی اس کے لیے اتنا ہی تڑپے جتنا وہ اس کے لیے تڑپتی ہے؟ وہ کیا کر سکتی ہے۔ ہاں دعا...... وہ اللہ سے دعا کرے گی۔ ماسی ہاجراں سے بھی کہے گی کہ وہ اس کے لیے دعا کریں۔ اس کا دل مطمئن سا ہوا تھا۔ بے بے کہتی تھی۔ دعا کیا کر۔ دعا سے بھی بیڑے پار ہو جاتے ہیں۔ اسے اپنی دادی کی بات یاد آئی تو دل اور بھی مطمئن ہوا۔ کل سے پانچوں وقت نماز پڑھوں گی۔ دل ہی دل میں عہد کرتے ہوئے وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے چھت پر آئی اور تار پر کپڑے لٹکانے لگی کہ گلی میں سے فقیرے کی آواز آئی۔

غلام فریدا دل اتھے دیے
جتھے اگلا قدر پچھانے

وہ بھاگ کر منڈیر تک آئی اور جھانک کر نیچے دیکھا فقیرا ہی تھا۔ اس کی عادت تھی جب بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں آتا تو کچھ نہ کچھ گاتا رہتا تھا۔ کبھی ہیر کے بول اس کی زبان پر ہوتے کبھی کسی اور پنجابی شاعر کا کلام۔ یہ لوگ پیشہ ور بھکاری تھے۔ سال ڈیڑھ سال میں ایک بار آتے گاؤں سے باہر اپنی جھگیاں لگاتے چند ماہ رہتے اور پھر کہیں اور چلے جاتے۔ ان کے مرد بھیک مانگتے تھے اور عورتیں کھجور کے پتوں سے چنگیریں، ہاتھ سے جھلنے والے پنکھے ٹوکریاں وغیرہ بناتی تھیں۔ وہ گلی کے وسط میں کھڑا گا رہا تھا۔
''رکنا چاچا۔'' اس نے جھک کر کہا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ باورچی خانے سے آٹے والی بھڑولی سے آٹے کا سلور کا بڑا کٹورا بھرا اور صحن کا دروازہ کھولا۔
فقیرا اب ان کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح لمبا سا پیوند لگا چغہ جس میں کئی جیبیں تھیں گلے

میں سبز اور سرخ منکوں کی مالا۔ ایک کندھے پر بڑا سا تھیلا اور گلے میں زنجیر سے بندھا کشکول۔ ان کے قبیلے کے سب مردوں کا یہ حلیہ نہیں تھا۔ وہ اطراف کے مختلف علاقوں میں جاتے تھے جب کہ فقیرا کئی سالوں سے ان کے گاؤں میں آ رہا تھا۔ گاؤں والے اس سے کافی مانوس ہو گئے تھے۔

"یہ آٹا لے لو۔" قمرن نے پیالہ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے لے کر اپنے تھیلے میں الٹ لیا۔

"تمہاری بیٹی نہیں آئی آج تمہارے ساتھ۔" پچھلے بار جب یہ لوگ آئے تھے تو فقیرا اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لاتا تھا۔

"وہ اب جوان ہو گئی ہے اس کی شادی کر دی ہے۔" فقیرا کشکول میں رکھے سکے ہاتھ سے ادھر ادھر کر رہا تھا۔

"کس سے۔" قمرن کی فطرت میں تجسس بہت تھا۔

"اپنے قبیلے میں ہی کی ہے۔"

"اس کا خاوند بھی بھیک مانگتا ہے!"

"ہاں تو اور کیا کرتا ہے!" اس نے جیسے فخر سے گردن اکڑائی تھی۔ "ہمارا پیشہ ہے۔ ہمارے باپ دادا نے جو کیا۔ ہم نے بھی وہ ہی کرنا ہے۔"

ضروری تو نہیں کہ جو باپ دادا نے کیا ہے وہی اس کی اولاد بھی کرے۔ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ کس مقصد کے لیے آئی تھی تو دل کی بات دل میں ہی رہنے دی۔ اور جلدی سے بولی۔

"چاچا! میرے لیے دعا کرنا کہ میں جو چاہتی ہوں وہ ہو جائے۔"

"نہ میں کوئی سائیں نہیں ہوں کا کی، جو تم مجھ سے دعا کے لیے کہہ رہی ہو......" فقیرے کی سرمہ بھری آنکھوں میں حیرت تھی۔ "یہ چولا۔ یہ منکے تو بہروپ ہیں۔" اس نے گلے میں لٹکی مالا کو چھوا۔

"پھر بھی میرے لیے دعا کرنا......" وہ بضد ہوئی۔ "میرا دل کہتا ہے تم دعا کرو گے تو ضرور قبول ہو جائے گی۔"

"دل کے آکھے نہ لگ کڑیئے۔ صرف دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تب ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اور فقیرا نا فرمان۔ اللہ محنت کر کے کمانے کو کہتا ہے اور وہ گلے میں کشکول لٹکائے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اس کی دعا سنے گا اللہ۔"

اس کی سرمہ بھری آنکھوں میں ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ چمکی تھی اور وہ گاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ دروازے کا پٹ پکڑے اس کی بات پر غور کر رہی تھی کہ اس کی ماں کی تیز چیختی ہوئی آواز آئی۔

"نی قمریئے! دروازے کے ساتھ ہی چپک گئی ہے۔ ابھی دھونے کو ڈھیر کپڑوں کا پڑا ہے۔ تیر۔ ۔ کے بھرا نے شہر بھی جانا ہے۔ لگتا ہے سریش ساتھ ہی لے کر گئی ہے۔"

اس نے چونک کر دروازہ بند کیا۔

آ رہی ہوں اماں...... تو تو بولنے پر آئے تو شروع ہی ہو جاتی ہے۔ فقیرے سے بات کر رہی تھی۔ کوئی سریش لے کر ساتھ نہیں گئی ہوئی تھی۔" وہ دھپ کر کے پیڑھی پر بیٹھی اور کپڑے کھنگالنے لگی۔

"کیا تیرا سگا لگتا ہے وہ جو اس سے باتیں کر رہی تھی۔" اسے آج کپڑے دھونے پڑ گئے تھے تو غصے میں تھی۔

"اس سے اپنے لیے دعا کرنے کو کہہ رہی تھی۔" غیر ارادی طور پر لبوں سے نکلا تھا۔

عزیز حصہ اٹھائے کمرے سے نکلا تھا۔ "اماں! میری لاڈو کو کچھ نہ کہا کر، چار دن کی تو مزمان (مہمان)

ہوتی ہیں بیٹیاں بہنیں۔" وہ صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔
"میں کب کچھ کہتی ہوں اسے۔ آج تیری بھرجائی بھی گھر پہ نہیں ہے۔ اور سارا کام پڑا ہے اور یہ جا کر دروازے پر کھڑی ہوگئی اس فقیرے سے دعا کروانے جیسے وہ کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہو۔ گاؤں گاؤں پھر کر بھیک مانگنے والا۔"
"تو کیا دعا کروائی میری لاڈو نے؟" عزیز مسکرایا۔
"یہ تم پیو پتروں کے لاڈوں نے ہی اسے بگاڑ دیا ہے۔ تیری بھرجائی بے چاری سارا دن لگی رہتی ہے اور کبھی جو اس نے اس کا ہاتھ بٹایا ہو۔ نخرے ہی نہیں مکتے (ختم ہوتے) اس شہزادی کے۔ دعا منگوا رہی ہوگی کہ بھرجائی منٹوں میں گھر آجائے اور اسے کام نہ کرنا پڑے۔"
ماں کی بات سن کر عزیز کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے قمرن کو دیکھا۔
"تو دعا مانگی فقیرے نے اور کیا دعا کروائی ہے تم نے۔"
"نہیں......" اس نے مڑ کر صحن میں بیٹھے عزیز کو دیکھا۔ "اور اس نے دعا کب کی بولا خالی خولی دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ کوشش کرنی پڑتی ہے۔"
"تو صحیح تو کہہ رہا تھا وہ خالی خولی دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔ یاد ہے بے بے کہتی تھی دعا اور دوا دونوں ہی ضروری ہیں۔ اب اگر میں یہاں صحن میں جانماز بچھا کر بیٹھ جاؤں اور دن رات دعا کرتا رہوں کہ میرے کھیتوں میں بہت اچھی فصل ہو وا ہی گاہی نہ کروں۔ زمین میں ہل نہ چلاؤں، بیج نہ ڈالوں تو کھیتوں میں تو دھول اڑے گی فصل نہیں اگے گی۔ ہر بندے کو اپنے اپنے حصے کا کام تو کرنا ہی پڑتا ہے اب یہ فقیرے کو ہی دیکھ لو۔ کل کسی وقت یہ لوگ آئے تھے میں نے دیکھا تھا انہیں جھگیاں لگاتے، چولہے بناتے۔ تو محنت تو کرنی پڑتی ہے شہزادی قمرن، کام چاہے کوئی بھی ہو۔ ویسے تم نے بتایا نہیں فقیرے سے کیا دعا کرنے کو کہا تھا؟"
"بس یہ ہی جو اماں نے کہا۔" اس نے رخ موڑا اور ٹب میں پڑے کپڑے نچوڑ کر بالٹی میں رکھنے لگی۔
عزیز کا قہقہہ بے ساختہ تھا وہ یوں ہی ہنستے ہوئے اٹھا۔
"تو نے شہر کب جانا ہے یہ قمرن تیرا جوڑا استری کر دیتی ہے۔" ماں اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
"کپڑے تو یہ ہی ٹھیک ہیں اماں۔ اور یہ حقہ ابا کو دے کر ادھر سے ہی لاری اڈے چلا جاؤں گا۔"
رات اس کی پانی کی باری تھی اس لیے وہ آج صبح باپ اور بھائی کے ساتھ سویرے کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا اور پھر ابا نے کہا تھا ناشتا کر کے شہر بیج لینے چلے جانا۔"
اس نے جھک کر حقہ اٹھایا قمرن کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔
"ویسے فقیرے نے بات تو بڑی پتے کی کی ہے، سولہ آنے سچ پلو سے باندھ لے۔"
وہ پھر ہنسا اور یوں ہی ہنستا ہوا صحن کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
"ہاں بات تو سولہ آنے سچ ہے۔ مجھے خود ہی ہاتھ پیر چلانے ہوں گے اور سالک کے دل میں اپنی جگہ بنانی ہوگی۔"
کپڑے نچوڑ نچوڑ کر بالٹی میں رکھتے ہوئے قمرن کے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی کہ کیسے، کیونکر، کس طرح۔

☆☆☆

وہ دروازہ کھولے حیرت سے اینڈی کو دیکھ رہی تھی جس کے ہاتھ میں پھولوں کا خوب صورت بکے تھا۔
"وہ میں ایوا سے ملنے آیا تھا۔" اس کی آنکھوں کی حیرت نے جیسے اینڈی کو نادم کیا تھا۔

''وہ تو گھر پر نہیں ہے۔'' ایمن کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔
''میں انتظار کر لیتا ہوں۔'' اس نے نظریں ایمن کے چہرے سے ہٹالی تھیں۔
''لیکن وہ آج رات واپس نہیں آئے گی......'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ''شاید کل یا شاید پرسوں آئے اپنی گرینڈ ما کی طرف جانے کا پروگرام تھا اس کا۔''
''اوہ......!''

''وہ مایوس سا ہوا تھا۔ لیکن کیوں وہ خود نہیں جانتا تھا کہ یہاں تک کیوں چلا آیا تھا۔ کیا وہ ایوا سے ملنے آیا تھا۔ شاید نہیں اگر نہیں تو پھر یہ مایوسی سی کیوں اس کے اندر چھا گئی تھی شاید وہ ایوا کے بہانے کچھ دیر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ کھوجنا چاہتا تھا۔ تو یہ مایوسی اس لیے تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ایوا کی عدم موجودگی میں وہ اسے اندر آنے کے لیے نہیں کہے گی۔ پھر بھی اس نے ایک کوشش کی۔''
''تو کیا تم مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی۔ ایوا کے مہمان کو ایک کپ کافی کی آفر کرنا تو بنتا ہے نا......!''
''کچھ دیر پہلے وہ علی کے ساتھ تھا تو اب وہ کہاں تھا۔ اس نے اس کے کندھوں کے اوپر سے دیکھا دور تک کوئی نہیں تھا۔ لیکن نہیں کچھ دیر نہیں کافی دیر ہو گئی تھی اپنے آپ میں گم اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔''
''علی کو ضروری کام تھا وہ مولانا صاحب کے پاس مجھے پہنچا کر خود چلا گیا تھا۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی نظریں علی کو کھوج رہی ہیں۔
''اوکے۔ میں ایوا کو بتا دوں گی تمہارے آنے کا۔'' اس نے دروازے پر رکھا ہاتھ ہٹایا۔
''تو کیا مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟'' اس نے اپنی بات دہرائی تو ایمن نے نفی میں سر ہلایا۔
اس کی نیلگوں آنکھوں کی چمک ماند سی پڑی۔ کیسی ظالم لڑکی ہے یہ جسے دل رکھنا بھی نہیں آتا کیا تھا جو اگر یہ مجھے ایک کپ کافی کی آفر کر دیتی۔ لیکن شاید اس کی روایات اور خاندانی پابندیاں اسے ایسا کرنے سے روکتی تھیں۔ ایک بار علی نے مختصراً بتایا تھا اپنے گھرانے کی روایات اور پابندیوں کے متعلق کہ وہاں پاکستان میں وہ اپنی روایات کی پابندی کرتے ہیں لیکن یہاں صورت حال کچھ مختلف ہے۔ ہم لوگ ادھر آ کر کچھ آزاد ہو گئے ہیں۔
وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کو تھوڑا سا خم کرتے ہوئے بکے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کی طرف بڑھایا۔
''تم مجھے ایک کپ کافی آفر نہیں کر سکتیں لیکن یہ پھول تو قبول کر سکتی ہو۔ انہیں قبول کر لو۔''
''میں......لیکن کیوں؟''
وہ دروازے کا پٹ چھوڑ کر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح ایک قدم پیچھے ہٹی۔
اینڈی کا جی چاہا وہ اسے کہے۔ تمہارے اس بے داغ اور معصوم حسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے۔ لیکن وہ ڈرتا تھا کہ ایسا کچھ کہہ کر وہ اس اداس آنکھوں والی لڑکی کو خفا نہ کر دے۔ وہ اسی طرح ہاتھوں میں پھول تھامے خاموش کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں نفی تھی انکار تھا۔ وہ سیدھا ہوا۔
''خیر سگالی کے اظہار کے لیے۔'' بالآخر اسے ایک جملہ سوجھ ہی گیا۔ اس کے خیال میں کم از کم یہ بات اسے خفا نہیں کر سکتی تھی۔
اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔
''میں اس طرح بلاوجہ کسی اجنبی سے پھول نہیں لے سکتی۔''
''اجنبی۔'' اسے جیسے تکلیف ہوئی تھی۔

"کیا ہم اب بھی اجنبی ہیں۔ میں تمہارے بھائی کا دوست ہوں۔"
"ہاں یا شاید نہیں۔ لیکن تم یہ پھول ایولین کے لیے لائے تھے اور میں کسی کی چیز نہیں لے سکتی۔"
اس کا جی چاہا وہ اس سے کہے تم کیا جانو پیاری لڑکی، یہ پھول تو میں تمہارے لیے ہی لے کر آیا تھا لیکن پھر ڈر گیا کہ کہیں میری یہ جرات نا قابل معافی نہ ہو۔
پھولوں کی شاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ بلا ارادہ ہی اندر چلا گیا تھا اور پھولوں کو دیکھنے لگا تھا۔ گل فروش لڑکی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
اگر وہ اسے بتائے کہ وہ کس کے پھول خریدنا چاہتا ہے تو وہ انتخاب میں اس کی مدد کر سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایمن کا سراپا لہرایا۔
"ہوسٹن کی سب سے خوب صورت لڑکی کے لیے جس کے حسن میں فرشتوں کی سی پاکیزگی ہے۔"
لڑکی کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی اور پھر ایک جگہ وہ رکی تو اس کی نظروں نے بھی اس خوب صورت بکے کو منتخب کیا جس کی طرف لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان پھولوں کو اس خوب صورت لڑکی کی نذر کرے جو ہوسٹن کی ساری لڑکیوں سے مختلف اور منفرد ہے جس میں کچھ ایسا ہے جو دوسروں میں نہیں اور وہ سرشار سا بے خودی میں جیسے جھومتا ہوا سا اس کے اپارٹمنٹ تک آیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات اس سے نہیں کہہ سکتا تھا سو مسکرا کر اسے دیکھا۔
"یہ پھول ابھی تک میری ملکیت ہیں اور میں اسے کسی کو بھی پیش کر سکتا ہوں۔ چاہے میں نے کسی کے لیے بھی خریدے ہوں۔"
اس نے معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پھر نفی میں سر ہلایا۔
اینڈی کی آنکھوں میں تاسف سا ابھرا اس نے جھک کر پھول دروازے کے باہر رکھ دیے اور جانے کے لیے مڑا۔
"سنو۔" اس نے بے اختیار آواز دی۔
"میں یہ پھول ایولین کے واپس آنے پر اسے دے دوں گی اور کوشش کروں گی کہ اس کے آنے تک یہ فریش رہیں۔"
وہ واپس پلٹا اس لڑکی کے پتھر دل میں کہیں کوئی نرم گوشہ ہے جس سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ وہ جھکا اور بکے اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔
"شکریہ۔ لیکن اگر تم اسے خود کے لیے قبول کرتیں تو زیادہ خوشی ہوتی مجھے۔" لمحہ بھر کے لیے اس کی نظریں ایمن کی نظروں سے ٹکرائیں منجمد جھیلوں کے نیچے بہتے پانیوں میں ہلچل سی تھی۔
اگر میں بھی تمہارے صرف تمہارے لیے پھول خریدوں تو کیا تم انہیں قبول کر لو گی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا لیکن بنا کچھ کہے تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دروازہ بند کر کے کتنی ہی دیر دروازے سے پشت لگائے کھڑی دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی جو بے ہنگم انداز میں شور مچا رہی تھیں۔
یہ اینڈی پہلے تو کبھی ایولین سے ملنے نہیں آیا۔ ایک بار بھی نہیں۔ وہ کبھی اپنے بوائے فرینڈز کو گھر میں نہیں لاتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی دوست آتا بھی تو باہر سے ہی اس کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ بغیر کہے ہی وہ حنان اور اس کی روایات کا احترام کرتی تھی۔ نہ ہی حنان کا کوئی مرد رشتہ دار گھر کے اندر آتا تھا۔ تو پھر آج اینڈی کیوں یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ اسے گھر کے اندر بلا کر کافی پلائے گی۔ ایولین بھی ہوتی تو اسے اندر آنے کو نہ کہتی۔

ایک لمبا سانس لے کر وہ سیدھی ہوئی۔ کچن کاؤنٹر پر سے گلاس اٹھا کر اس میں پانی ڈالا اور پھولوں کا ریپر اتار کر انہیں اس میں سجا کر گلاس اٹھا کر کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرمی سے انہیں چھوا اور جھک کر ان کی بھینی بھینی سی خوشبو اپنے اندر اتاری اور پہلے کی طرح صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔"

"اگر تم اسے اپنے خود کے لیے قبول کرتیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

اینڈی نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے آنکھیں کھول کر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن بھلا اینڈی وہاں کہاں تھا وہ تو کب کا جا چکا تھا۔ پھر میں کیوں ایک اجنبی لڑکے کی بات یاد کر رہی ہوں۔ ٹھیک ہے ان کے معاشرے میں ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن میں تو اس معاشرے کا حصہ نہیں ہوں۔ میری دنیا اور ہے ایک بالکل مختلف دنیا۔ اور مجھے یہاں کی دنیا اور معاشرے سے اٹریکٹ نہیں ہونا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے یہاں سے چلے جانا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آنا۔ میں ایمن شاہ گیلانی میں پابند ہوں۔ مجھے چن پیر شاہ کے گھر جانا ہے اور میں ولایت شاہ کی امانت ہوں۔ وہ ولائیت شاہ جو اس کے کالج جانے پر تنتنا تا ہوا اس کے گھر چلا آیا تھا۔

"نہ چاچا جی! یہ غلطی نہ کریں۔ مجھے پڑھی لکھی استانی نہیں چاہیے۔ بس سیدھی سادی گھریلو لڑکی۔ دس جماعتیں پڑھ لی ہیں نا، بہت ہیں۔"

"لیکن مجھے سیدہ ایمن کو پڑھانا ہے۔ تمہیں اگر پڑھی لکھی استانی نہیں چاہیے تو لالہ جی سے کہو تمہارے لیے کہیں اور رشتہ دیکھ لیں۔" سید فرمان شاہ چن پیر شاہ کو ادب سے لالہ جی کہتے تھے۔

اور وہ جو اکڑتا ہوا آیا تھا اور بلند آواز سے بول رہا تھا ایک دم ٹھنڈا ٹھار ہو گیا تھا اور چپ چاپ سر جھکائے واپس چلا گیا تھا۔ اور اندر اپنے کمرے میں بیٹھی مومنہ نے اپنے مخمل کی چادر اٹھا کر کمرے میں موجود عائشہ سے کہا تھا۔

"بھابھی! بھائی صاحب کو سمجھائیں خاندان بھر کی لڑکیوں میں سے واحد ایمن ہی ایسی ہے جس کا جوڑ مل گیا ہے۔ کہیں وہ بھی۔"

ولایت شاہ اس سے عمر میں سات آٹھ سال ہی بڑا تھا۔ گیلانی خاندان کے دوسرے افراد کی طرح خوبرو اور وجیہہ تھا لیکن بے حد اکھڑ اور سخت، وہ تو بچپن سے ہی اس سے ڈرتی تھی۔ خوف زدہ رہتی تھی اور عمر بھر کا بندھن اس سے بندھ گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے میڈیکل کالج میں داخلے کا سن کر وہ بھڑک اٹھا تھا اور چن پیر شاہ کو مجبور کیا تھا کہ وہ فرمان شاہ سے بات کریں۔ اب پتا نہیں چن پیر شاہ اور فرمان شاہ کے درمیان کیا بات ہوئی تھی لیکن سید فرمان شاہ اسے خود راولپنڈی میڈیکل کالج میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اور ولایت شاہ اکثر اس کے کالج چلا آتا اور گیٹ سے فاصلے پر کھڑا وہاں سے آتے جاتے طالب علموں کو دیکھتا رہتا۔ اور ایک روز وہ پھر فرمان شاہ کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ نے ایمن کو میڈیکل کالج میں داخل کروا کر اچھا نہیں کیا۔ میں کئی بار وہاں گیا ہوں۔ میں نے لڑکوں اور لڑکیوں کو بے تکلفی سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ میرا خون کھولتا ہے کہ ایمن بھی ان لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہے۔ پھر یہ ہوسٹل میں رہتی ہے کیا خبر وہاں کیسی لڑکیوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہو؟"

فرمان شاہ نے بہت تحمل سے اس کی بات سنی تھی۔

"تو تم اتنا لمبا سفر کر کے اتنی دور مت جایا کرو تمہارا خون نہیں کھولے گا۔"

"چاچا جی......!" غصے سے اس کی آنکھیں خون رنگ ہو گئی تھیں۔ "اسے کالج سے اٹھوا لیں بس اگر کسی روز میں نے اسے کسی لڑکے کے ساتھ بات کرتے دیکھ لیا تو گولی مار دوں گا۔" وہ ان کا جواب سنے بغیر واپس چلا

گیا تھا۔

''وہ بہت جذباتی ہے فرمان شاہ......'' فوراً ہی چمن پیر شاہ چلے آئے تھے۔ ''کہیں کوئی تماشا نہ کھڑا کر دے۔ بہتر ہے کہ تم ایمن کا کالج جانا بند کردو۔''

''ٹھیک ہے وہ کل سے نہیں جائے گی۔''

اور چمن پیر شاہ مطمئن ہو کر چلے گئے تھے لیکن فرمان شاہ جب کوئی فیصلہ کر لیتے تھے تو اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ سو انہوں نے عبداللہ اور حیدر شاہ سے بات کر کے اسے بوسٹن بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے دو سال ضائع ہو گئے تھے ایک سال تو اس نے میڈیکل کالج میں پڑھا تھا اور دوسرا سال سارا پراسس مکمل ہونے میں لگ گیا تھا۔ اس کے جانے کا سن کر وہ پھر غصے میں لال پیلا ہوتا ہوا آیا تھا۔

''یہ کیا چاچا جی! آپ اسے غیر مسلموں کے امریکیوں کے ملک میں بھیج رہے ہیں۔ جہاں عورت......''

''بس ولایت شاہ۔ ابھی وہ میرے گھر میں ہی اور ابھی اس کی زندگی کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس نہیں ہے۔ وہ میری بیٹی ہے اور ابھی اس کی زندگی کا ہر فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے۔ یہاں تمہارا خون کھولتا تھا۔ میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب تمہارا خون نہیں کھولے گا کہ اب ہر دس بارہ دن بعد تم اس کے کالج کے باہر جا کر کھڑے نہیں ہو سکو گے۔ پھر بھی تمہیں اعتراض ہے تو میں اپنی بات دہراتا ہوں۔ تم اس رشتے کو ختم کرنے کا اختیار رکھتے ہو۔''

اور اس وقت تو وہ خاموشی سے چلا گیا تھا لیکن اگلے چند دنوں میں چمن پیر شاہ اور بڑی پھوپھو حلیمہ شاہ نے کتنے ہی چکر لگائے تھے کہ جانے سے پہلے ولایت شاہ اور ایمن کا نکاح ہو جائے۔ اور وہ اماں جان کی گود میں منہ چھپائے کانپتی رہتی۔ لیکن فرمان شاہ سمجھتے تھے کہ ولایت شاہ نکاح کی ضد کیوں کر رہا ہے۔ وہ ایمن کی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ نکاح کے بعد وہ بے بس ہو جاتے سو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''ایمن ولایت شاہ کی منگ ہے اور اس کی شادی ولایت شاہ سے ہی ہو گی۔ میں نے زبان دی ہے۔ لیکن جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے گی تب......'' اور یوں وہ یہاں بوسٹن میں موجود تھی۔

کہیں اس کا فون بج رہا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور پھر اپنا ہینڈ بیگ کھول کر جلدی سے ادھر ادھر ہاتھ مار کر فون باہر نکالا۔ عبداللہ کا فون تھا۔ وہ کبھی کبھار فون کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا۔''

''جی عبداللہ بھائی! السلام علیکم۔'' اس نے فون کان سے لگایا۔

''کیسی ہو ایمی؟'' وہ ہمیشہ شفقت اور نرمی سے بات کرتے تھے۔

''جی بھائی، ٹھیک ہوں۔''

''یہ اماں جان سے بات کرو۔'' انہوں نے فون اماں جان پکڑایا تھا۔

''ایمن کیسی ہو بیٹی؟''

''جی میں ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟'' کتنے دنوں بعد وہ ان کی آواز سن رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں میری جان۔ تم اپنا بہت خیال رکھا کرو۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں کچھ دنوں سے تمہیں خواب میں پریشان دیکھ رہی ہوں۔ آج عبداللہ آیا تو میں نے اس سے کہا ایمی سے میری بات کروا دو۔ مجھے اس سے دیر تک بات کرنی ہے۔ تمہارے بابا جان تو بس ایک منٹ بھی بات نہیں کرنے دیتے۔'' لہجے میں شکوہ تھا۔

"نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے سب ٹھیک ہے۔آپ پریشان نہ ہوا کریں بس دعا کیا کریں کہ میں ثابت قدم رہوں اور میں بابا جان کو مایوس نہ کروں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"تمہاری پڑھائی کب ختم ہوگی ایمن؟" ان کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

"ابھی تو صرف دو سال اور چند ماہ ہوئے ہیں۔اماں جان۔" اس نے جیسے سسکی لی تھی۔

"ابھی تو بہت لمبا سفر باقی ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں۔بس دیوانی ہوں یونہی پوچھ لیا کہ جیسے تم کہہ دو گی کہ بس تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔"

وہ ذرا سا ہنسی تھیں۔کیسی کرب ناک ہنسی تھی وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔

"ایمن......!" انہوں نے کہا تو وہ چونکی۔

"بابا جان عبدالصمد مومنہ پھوپھو اور بنین سب کیسے ہیں۔بنین سے بات کروا دیں۔ترس گئی ہوں اس کی آواز سننے کے لیے اب تو وہ پہلے سے کچھ بہتر ہے نا۔"

"بنین......" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔"وہ بہتر ہو رہی تھی میرے پاس آ کر بیٹھتی تھی بات کرتی تھی۔لیکن صرف تھوڑے سے عرصہ کے لیے اس کی حالت میں یہ بہتر آئی تھی۔اب پھر ویسی ہی چپ سادھ لی ہے اس نے۔دورے بھی ایسے ہی پڑتے ہیں دو دو گھنٹے بے ہوش رہتی ہے۔" وہ یکدم خاموش ہوگئی تھیں۔اسے محسوس ہوا وہ رو رہی ہیں۔

"ماں جان! پلیز روئیں نہیں۔میری بات کروائیں اس سے۔"

"وہ سو رہی ہے۔عبداللہ نے کچھ دیر پہلے ہی اسے دوا دی تھی۔اب تین چار گھنٹے تک سوتی رہے گی۔عبداللہ کہہ رہا ہے کہ بابا جان واپس آ جائیں تو وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے بنین کا علاج کروائیں۔" ان کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"کیا بابا جان مان جائیں گے؟" وہ بے چین ہوگئی تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔وہ جانتی تھی۔فرمان شاہ نے کب انہیں اتنا یقین اور اعتماد دیا تھا کہ وہ کہہ سکتیں کہ ہاں وہ مان جائیں گے۔

"ایمی! تم دعا کرنا......وہ مان جائیں۔میری بنین گھل رہی ہے۔ختم ہو رہی ہے۔" وہ پھر رونے لگی تھیں اور اس کا اپنا دل جیسے پگھل کر پانی ہوا جاتا تھا۔اسے لگا جیسے وہ بھی رونے لگے گی۔لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔اور ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

"بابا جان کہاں گئے ہیں؟"

"لالہ جی کے ساتھ شہر گئے ہیں، وکیل سے ملنے۔ولایت شاہ کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا......اور ولایت شاہ نے اسے......" وہ پھر خاموش ہوگئی تھیں۔

"کیا مار دیا اسے۔" لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ابھی زندہ ہے۔دو گولیاں لگی ہیں اسے۔دعا کرو وہ بچ جائے نہیں تو پھانسی ہو جائے گی ولایت شاہ کو۔اکلوتا بیٹا ہے وہ لالہ جی کا اور تمہارا......"

جسے گولیاں لگی ہیں اگر وہ مر گیا تو؟ اسے لگا کہ جیسے اس کے پاؤں میں پڑی بیڑیاں خود بخود کٹ کر گرنے لگی ہیں۔وہ اس کی زندگی کی دعا کرے یا موت کی......اور اس سوال کا جواب اس کے اندر ہی چکرا تارہ گیا اور یکایک اس کے اندر سناٹے چھا گئے۔اماں جان کہہ رہی تھیں۔

"مومنہ نے بھی آج کل چپ اوڑھ لی ہے اپنے محمل میں ہی زیادہ وقت گزارتی ہے۔" مومنہ شاہ نے

اپنے بیڈ کے گرد چادریں تان رکھی تھیں اور اسے اپنا محل کہتی تھی۔ ''اور میرا وقت گزرتا ہی نہیں۔ ہاں اب تک خط تمہیں مل گیا ہوگا۔ اور......''

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں لیکن وہ سن نہیں رہی تھی جیسے سماعتیں گونگی ہوگئی تھیں۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے ساکت کھڑی تھی۔ یہاں تک کہ دوسری طرف سے ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی تو اس نے فون صوفے پر رکھ دیا۔ شاید بیلنس ختم ہوگیا ہوگا۔ شاید وہ لینڈ لائن پر بات کریں۔ وہ ٹیلی فون ریک کی طرف دیکھنے لگی لیکن بیل نہیں ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ یوں جیسے تیز آندھی اور طوفان میں چیزیں ادھر ادھر اڑتی پھرتی ہیں اس کے دماغ میں بھی ہلچل مچی تھی۔ وہ ہاں اور نہیں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اگر وہ شخص جسے گولی لگی ہے وہ مر گیا تو وہ بھی ان زنجیروں سے آزاد ہو جائے گی جو اسے کسی طرف بڑھنے نہیں دیتیں اور وہ اینڈی ......لیکن یہاں بھلا اینڈی کا کیا ذکر۔ ایک غیر ملک غیر مذہب کا لڑکا بس وہ تو آزاد ہونا چاہتی ہے ان زنجیروں سے جو اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ کھل کر سانس لینا چاہتی ہے اور چمن پیر شاہ کی حویلی میں بہت گھٹن ہے تو اللہ کرے وہ شخص......

اور لفظ ہونٹوں پر آنے سے پہلے اندر ہی کہیں منجمد ہو گئے تھے۔ ولایت شاہ جو چار بہنوں کے بعد دنیا میں آنے والا چمن پیر شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس کی پیدائش پر مہینوں حویلی میں شادیانے بجتے رہے تھے۔ اور مہینوں تک شکرانے کے طور پر یتیم خانوں میں کھانا بھجوایا جاتا رہا تھا۔ تائی جان بتاتی تھیں ان دنوں کوئی سائل حویلی کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ اور اگر وہ آدمی مر گیا تو اماں جان نے کہا تھا شاید اسے پھانسی ہو جائے شاید وہ ساری عمر جیل میں۔ اس کے کانوں میں بین کی آوازیں آنے لگیں۔ تائی جان اور ان کی بیٹیوں کے بین۔ چمن پیر شاہ کا جھکا ہوا سر اور جھکے ہوئے کندھے۔ ''نہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''نہیں۔''

''اللہ کرے وہ شخص......'' اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''اللہ کرے وہ...... یا اللہ اسے کچھ نہ ہو۔ وہ بچ جائے۔''

سسکی کی طرح اس کے لبوں سے نکلا۔ اسے لگا جیسے اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر بہت بوجھ آ گرا ہو۔ اور وہ سیڑھیاں جو چند لمحے پہلے اسے ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھیں انہوں نے پھر اسے جکڑ لیا ہو۔

بے بسی سے اس نے فون کی طرف دیکھا۔ اماں جان نے پھر فون نہیں کیا تھا تو وہ کر لے اس نے پاس پڑا فون اٹھایا۔ اور پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ شاید مومنہ پھپھو۔ نہیں شاید ''خط ہاں کسی خط کا ذکر کر رہی تھیں۔ کیا انہوں نے مجھے خط لکھا۔ لیکن انہوں نے تو مجھے کبھی خط نہیں لکھا تو کیا بابا جان کا خط...... وہ یکدم اٹھی۔ کی ہولڈر سے لیٹر بکس کی چابی اٹھائی اور فلور کشن سے الجھتی ہوئی مین ڈور تک آئی۔ دروازہ کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو موسم ٹھیک تھا۔ اس نے لیٹر بکس کھولا۔ کچھ بل تھے اور خط...... یہ خط اس کا ہی تھا...... اور کس کے خط نہیں آتے تھے۔ وہ خط لے کر واپس لاؤنج میں آ گئی۔ خط یقیناً بابا جان کا ہی تھا لیکن کیا اس بار انہوں نے کچھ نیا لکھا ہو گا۔ کوئی اور بات اماں جان نے آخر خط کا ذکر کیوں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی خط کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر پاس ہی رکھ دیا۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ اور چند لمحوں بعد حنان نے اندر قدم رکھا۔ اس نے لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا سر پر سیاہ اسکارف تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ وہ یکدم کھڑی ہوگئی۔

''حنان! سب ٹھیک ہے نا!''

حنان نے پلکیں اٹھائیں۔ بھیگی پلکوں کی نوکوں پر کہیں کہیں کوئی آنسو اٹکا ہوا تھا۔ جیسے خم دار کانٹوں کی نوک پر شبنم کا کوئی قطرہ ٹھہرا ہو۔ کیا وہ راستے میں روتی ہوئی آئی ہے۔

''حنان......'' اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''وہ لائیلا...... اس کا بھائی ابراہیم وہ ٹھیک ہے نا......''

ابراہیم جس نے ایک دوست کے ساتھ جا کر دشمن کی چوکی پر پتھر پھینکے تھے۔
"ایمن......" اور حنان یکدم اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔
حنان تو بہت حوصلے والی تھی وہ تو کبھی اس طرح نہیں روئی تھی تو کیا ابراہیم یا......
وہ ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی اور اس کا دل جو اپنے غم سے نکل کر دوسروں کے غم سے آشنا ہونا سیکھ رہا تھا وہ حنان کے اس دکھ پر تڑپنے لگا جس نے اسے رلا دیا کمزور کر دیا تھا۔
وہ اس کے گرد بازو حمائل کیے کیے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اسے عراق کی وہ آٹھ سالہ بچی حنان صلاح یاد آ گئی۔ جسے ایک برطانوی فوجی نے مار دیا تھا۔ پاکستان میں چند سال پہلے اس نے اخبار میں وہ نظم پڑھی تھی۔

لوگ کہتے ہیں۔
ابھی ابھی سب نے دیکھا
یہاں آٹھ برس کی
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
اس کے بال نوک دار چوٹیوں میں گندھے تھے
اس نے پولیس کو معصومیت سے احتجاجاً مکا دکھایا۔
اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا سرخی ہی سرخی پھیل گئی۔
کچھ گوشت کے لوتھڑے۔
کچھ پھڑ پھڑاتے رنگین چیتھڑے
زمین پر بکھرے پڑے تھے
ابھی ابھی یہاں پھولدار سرخ کپڑوں میں
ایک گڑیا جیسی بچی تھی۔
ابھی ابھی
لوگ کہتے ہیں

(احمد فراز)

حنان صلاح جس نے پولیس کو مکا دکھایا تھا اور ابراہیم جس نے دشمن کی چوکی پر پتھر پھینکے تھے۔ دونوں میں کہیں نہ کہیں کوئی قدر مشترک تھی۔ حنان صلاح اور ابراہیم خلیل جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے رو رہی تھی۔ حنان کے کندھے پر سر رکھے۔ وہ جو اپنے آنسو اپنے اندر اتار لیتی تھی۔ آج اس کے آنسو حنان کا کندھا بھگو رہے تھے۔ اور آنکھوں کے سامنے اخبار کا وہ صفحہ تھا۔

ابھی ابھی یہاں پھولدار سرخ کپڑوں میں
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
لوگ کہتے ہیں۔
ابھی ابھی

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

نفشالا سرور چینا

دسمبر کے اکتیس دن

وہ مدھر گنگناہٹ، وہ سات سروں سی ہنسی، وہ مسکراتا چہرہ اور وہ زندگی سے بھرپور لڑکی۔ مجھے اس وقت صرف وہی یاد آ رہی ہے۔ ذہن کے پردوں پر کوئی اور تصویر نہیں ابھر رہی۔ ہاں وہ تصاویر بنانے والی مصورہ میرے لیے اہم ہو چکی ہے۔ اتنی اہم کہ میں آنکھیں کھولنے کے بعد اپنے سامنے سب سے پہلے اسے دیکھنا چاہوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آئے گی۔ اور پھر میں اس سے کہوں گا کہ "رنگوں سے کھیلنے والی اس مصورہ کو میں پورے دل سے اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے منتخب کرتا ہوں۔۔۔ میں ایہان حمزہ اپنی ذات کو تمہارے لیے کینوس کرتا ہوں کہ تم ان میں ہر وہ رنگ بھرو جو تمہیں پسند ہو۔"

وہ کہتی ہے وہ وعدوں کی پابند ہے، وہ جھوٹ نہیں بولتی کہ رنگوں نے اسے یہی سکھایا ہے۔ ذرا سا آگے پیچھے ہوں تو آرٹ پیس کچرا ہو جاتا ہے۔ تو وہ باتوں کو آگے پیچھے نہیں کرتی، سچ کی پینسل چن کر اسی کے ساتھ آڑھی ترچھی لکیریں لگاتی رہتی ہے اور بنانے والے نے اسے مصوری کے فن سے نواز دیا ہے۔

ایلا جارج...... میں آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں مگر ابھی نہیں کہ مجھے تمہارا انتظار ہے۔ وہ ہی انتظار جو منزل مراد کا ہوتا ہے۔ میرے ارد گرد میرے اپنوں کی آوازیں موجود ہیں۔ میری ماں مجھ پر دم پڑھ کر پھونک رہی ہے، ویڈیو کال میں موجود میری بہن بار بار فون میرے چہرے کی جانب کروا رہی ہے، میرا باپ ہر تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سے پوچھ رہا ہے کہ میں آنکھیں کب کھولوں گا؟ مگر میں چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پا رہا کہ آنکھیں کھولوں تو تم سامنے نہ ہو۔ میرے اپنوں میں تمہارا شمار بھی تو ہونے لگا ہے ناں ایلا۔ میں زندگی کی اس نئی شروعات میں اپنے سب پیاروں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایلا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی ہے۔ اور میرا وجدان کہہ رہا ہے یہ تم ہی ہو۔ تو بالآخر تم آ ہی گئی۔ تمہیں آنا ہی تھا۔ وعدہ جو کیا تھا۔

"اس سے کہو ایلا آئی ہے۔"

میرے بابا نے شاید ماں کو کہا ہے۔ اور ماں میرے کان کے نزدیک جھک گئی ہے میں اس کی گرم سانسوں کو محسوس کر رہا ہوں۔

"ایلا آئی ہے ایہان آنکھیں کھولو۔"

ہاں اب میں آنکھیں کھولوں گا، تم جو موجود ہو...... میری نئی زندگی مکمل ہے۔ از حد کامل ہے۔ اب مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ اب کوئی شکوہ نہیں، کوئی شکایت اور درد نہیں۔ سب خوب صورت ہے، سب پیارا ہے، دلکش ہے۔ اسکائی لائن نائٹ ویو جیسا، نیاگرا فالز جیسا، ہاربر فرنٹ سینٹر جیسا، فیری ڈوک جیسا، اونٹاریو جھیل جیسا اور اور ان سب سے بڑھ کر تمہاری ہنسی جیسا۔

☆☆☆

وہ یکم دسمبر کی ایک شام تھی۔ ہاربر فرنٹ سینٹر پر رش معمول کے مطابق تھا۔ لائٹس جگمگا رہی تھیں۔ لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گردن کے گرد مفلر لپیٹے قدم قدم چلتا میں ٹھنڈی ہوا کو پوری ٹکر دے رہا تھا۔ آج مجھے یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ بے زاری سی بے زاری تھی تو سوچا کیوں ناں ٹورونٹو کی سیر ہی کر لی جائے جو میری اکتاہٹ، اداسی اور تھکن بانٹ لے۔

کاؤنٹر سے ٹکٹ خریدنے کے بعد میں نے فیری ڈوک کا رخ کیا۔ برف باری کے ساتھ دل لبھاتے مناظر کو دیکھنا، ہوسکتا ہے دل کو فرحت بخشے۔ ایک ٹکٹ اڑتا ہوا میرے پاس آیا اور میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔

"مائی ٹکٹ"

میرے مکمل سیدھا ہونے سے پہلے ہی وہ پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ سفید ٹاپ اور جینز پر بلیو جیکٹ پہنے، اونی ٹوپی اور دستانے چڑھائے چھوٹی سی سرخ ناک والی وہ لڑکی ہاتھ آگے کیے ہوئے تھی۔ میں نے ٹکٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے، سر جھکا کر

مجھے شکریہ کہا تھا۔ آنکھوں میں ہیروں جیسی چمک تھی۔

فیری ڈوک پر ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی چل رہے تھے۔ وہ ایک بڑی سی بک کو سینے سے لگائے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ میں کبھی کبھار نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا۔ مجھے اس بک کے متعلق تجسس ہوا کہ ایسی کیا قیمتی متاع تھی جسے سینے سے لگا کر رکھا ہوا تھا۔ فیری میں بیٹھنے پر جب وہ چل پڑی تو کچھ دیر بعد میں اوپر چھت پہ آ گیا۔ ٹورنٹو کا اسکائی لائن نائٹ ویو واقعی خوب صورت تھا۔ سی این ٹاور سے پھوٹنے والی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ میں بہت خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا، سب کچھ قابل دید تھا، بلکہ قابل رشک تھا۔ مگر میں دوسرے پیسنجرز کی طرح پرجوش نہیں تھا۔

''میں نے سنا ہے، جو ہنستے نہیں ہیں ان کے سامنے والے دانت ٹوٹے ہوتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے میرے پاس آتے کمال معصومیت سے سوال کیا تھا۔۔۔ پہلے پہل تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر میں مسکرا دیا۔

''آپ واقعی اپنے دانت نہیں دکھانا چاہتے۔ اب تو میرا شک یقین میں بدل گیا ہے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ بے ساختہ میرا قہقہہ بلند ہوا۔ میں کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ اور وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔

ایلا جارج سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یکم دسمبر کی یخ بستہ رات میں جکڑ دینے والا سحر تھا۔ جس نے مجھے یعنی ایہان حمزہ کو عرصہ بعد ہنسنے پر مجبور کیا تھا۔

میں باتونی نہیں ہوں، مجھے بولنا نہیں آتا، گفتگو کے ہنر سے نا آشنا ہوں۔ مگر اس رات میں نے بہت باتیں کیں کہ وہ مجھے سن رہی تھی ایسے جیسے کوئی سادھو سنیاس لیے بیٹھا ہو اور بھگت اس سے من کا ہر بھید بانٹ لے۔ میں نے پہلی بار بوجھ بانٹے تھے وہ بھی اس سے جس سے مجھے ملے کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو۔ یہ عجیب تھا مگر عجیب کام بھی تو اسی دنیا میں ہی ہوا کرتے ہیں۔

اس نے مجھے سنا تھا مگر اپنے بارے کچھ نہیں کہا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ مسافر تھی، آرٹسٹ تھی، سفر اس کی سرشت میں تھا اور آرٹ اس کا جنون۔ اونٹاریو کی خوبصورتی کے جو چرچے تھے وہ غلط نہیں تھے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے واپسی پر اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''واٹس یور نیکسٹ پلان؟''

میں نے کندھے جھٹک دیے۔ منصوبے بنانا مجھے کہاں آتا تھا۔

''ہم، دین گو می یور HM نمبر۔''

میں نے بنا کسی پس و پیش کے اپنا نمبر اسے دے دیا۔

☆☆☆

اگلے دن ایک بجے مجھے اس کی کال آئی تھی۔ اس وقت میں بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔

وہ ہوٹل کے باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اور مجھے دس منٹ میں باہر آنے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا۔ ہر طرح سے پھرتی دکھاتے بھی اس تک پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

مگر اس نے چپ چاپ مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی وہ بک ابھی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں سوال کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کیوں پاس رکھتی ہے مگر نہیں پوچھ سکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم لوگ ڈسٹلری ڈسٹرکٹ پہنچ چکے تھے۔ بڑی بڑی بیسویں صدی کی سرخ اینٹوں اور چمنیوں والی عمارتیں، بوتیکس، آرٹ گیلریاں اور بیکریاں۔ وہ مجھے ایک بیکری میں لے آئی ہم نے کافی کے ساتھ کچھ پیسٹریز آرڈر کیں کہ یہی ہمارا ناشتا تھا۔

''تمہیں ہارٹ پرابلم کب سے ہے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''آج سے تقریباً تین سال پہلے ہوا تھا۔''

"ہمم۔ سواب تم یہاں ٹرانسپلانٹ کے لیے آئے ہو؟"

"ہاں آیا تو ہوں۔ بس انتظار ہے ڈونر کے ملنے کا۔ ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ جیسے ہی ڈونر ملے گا ٹرانسپلانٹ ہو جائے گا۔" میں نے یاسیت سے اس کی جانب دیکھا۔

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" اتنا پریشان اور اداس کیوں رہتے ہو؟

"یونہی بس۔ سمجھ لو یہ اداسیاں میرے مزاج کا حصہ ہیں۔ کل رات میں ایک طویل مدت بعد ہنسا ہوں۔ ورنہ میں تو ہنسی کا مطلب ہی بھول گیا۔

"سنو ایہان! زندگی نعمت ہے اور نعمت کو زحمت نہیں بنایا کرتے۔ اسے جیتے ہیں کیا معلوم جو پل آج میسر ہیں کل وہ ہوں یا نہیں؟؟ تو جو موجود ہے ہر اس پل کو جیا کرو ستواں ناک والے مشرقی لڑکے۔" انگلش لب و لہجے میں مسکرا کر کہتے اس کامنی سی مصورہ نے بزرگ بننا چاہا۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں ایلا میری حالت کو۔ میں کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ کتنا جنون تھا مجھے کرکٹ کھیلنے کا مگر میں نہیں کھیل سکا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب اس بیماری نے مجھ سے چھین لیا۔ مگر تم نہیں سمجھو گی کہ نصیحت کرنا تو سب سے آسان کام ہے۔"

"ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں واقعی نہیں سمجھ سکتی۔" بھاپ اڑاتی کافی کا کپ لبوں سے لگاتے وہ خاموش ہو گئی۔

اس دن ہم نے پیدل پورا ڈسٹلری ڈسٹرکٹ گھوما تھا۔ مل اسٹریٹ بریوری، آرٹ گیلریز، پبلک آرٹ انسٹالیشنز اور پھر شام میں کرسمس ونٹر ولیج مارکیٹ۔ جہاں برقی قمقموں کا جہاں آباد تھا۔ دسمبر کے دنوں میں یہاں ٹورسٹ کا رش بڑھ جاتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے اسٹالز، کرسمس ٹری اور فیری لائٹس، لائیو پرفارمینس کے لیے وائلن بجاتے آرٹسٹ اور برف کے مجسمے۔۔۔ سب کچھ کسی فینٹسی ورلڈ جیسا تھا۔

جب ہم نے ایک اسٹال سے ہاٹ چاکلیٹ خریدی۔ اس وقت پہلی بار میں نے ایلا کو سر پکڑ کر، بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ پیچھے ہٹتے دیکھا۔

اس نے اسٹال کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر سہارا دینا چاہا مگر وہ یکدم ہشاش بشاش سی مسکرانے لگی۔

"یہ کیا تھا ایلا؟"

"تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں بالکل۔" اور بھول گئے، میں نے تمہیں کیا کہا ہے؟ پریشان مت ہوا کرو مشرقی لڑکے۔"

"ہاں میں مشرقی مرد ہوں مگر تم مجھے کشمیری کہو گی تو اچھا لگے گا ایلا۔ میں وادی نیلم کا بیٹا ہوں۔" میں نے اس کی تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

وہ مسکرا دی نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ وہ آنکھیں بار بار جھپک رہی ہے۔ جیسے آنسو روک رہی ہو۔

☆☆☆

اس دن کے بعد ہم نے طے کر لیا کہ ہم اکٹھے پورا ٹورونٹو گھومیں گے۔ سو ہم نے ہر ایک جگہ دیکھی، ہر ایک شے میں چھپی خوب صورتی کو محسوس کرنا میں نے اسی سے سیکھا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والوں میں سے تھی۔

آخری دن اکتیس دسمبر کو ہم نیاگرا فالز دیکھنے گئے تھے۔ قدرت کا حسین کرشمہ۔ روانی سے گرتا خوب صورت پانی جس کے اوپر بھاپ بے تحاشہ دھند کی صورت موجود تھی۔

ٹرانسپلانٹ کے لیے ڈونر مل گیا تھا۔ ماں بابا بھی میرے پاس آ چکے تھے۔ جیسے ہی اس ڈونر کی ڈیتھ کنفرم ہوتی مجھے اسی لمحے ہسپتال موجود ہونا تھا۔ مگر پھر بھی میں اس بات کا خیال رکھے بغیر شہر سے اتنی دور آیا ہوا تھا۔ اور اسے کہہ رہا تھا کہ "وہ میرے ساتھ موجود ہو گی۔ اگر میں نئی زندگی پانے میں

کامیاب ٹھہرا تو اسے اپنے سامنے دیکھنا چاہوں گا۔"

اس نے پہلی بار میری کسی بات پر حیل وحجت سے کام لیا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہ رہی تھی، بہانے تلاش رہی تھی۔ مگر مجھے کچھ نہیں سننا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب وہ نئی زندگی میں میرے سامنے کھڑی ہو گی۔ تو اس سے اس کو مانگ لوں گا کہ مجھے ہنسنا سیکھنا تھا۔ اور میرے ازحد اصرار پر اس نے ہامی بھر لی۔

موسم عجیب سوگوار تھا کہ آنے والے وقت کے ہزار خدشے تھے۔ جب وہ مجھے وہیں چھوڑ کر اچانک غائب ہو گئی۔ اور جب لوٹی تو اس کی لمبی پنک سکرٹ پر کافی کے نشان تھے، سنہری بال بکھرے ہوئے تھے اور چاکلیٹ چہرے اور بالوں پر گری ہوئی تھی۔ اس کی وہ حالت دیکھتے مجھے شدید ہنسی کا دورہ پڑا تھا کہ وہ واقعتاً مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ پہلے پہل مجھے گھور کر دیکھتی رہی مگر پھر وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگی بہت زیادہ، بے تحاشا۔ ہاں لیکن اتنا ہنسنے کے باوجود بھی میرا دل کسی انہونی کے زیر اثر تھا مگر میں نے سر جھٹک دیا۔ شاید میں زیادہ سوچ رہا تھا۔

کرسمس کے جشن اپنے عروج پر تھے مگر اسے ان سب میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں سیلیبریٹ نہیں کر رہی؟ تو اس نے کہا تھا کہ روشنیاں اور تیز آوازیں اسے راس نہیں آتیں۔ میں ہنس دیا تھا شاید وہ میری وجہ سے کہہ رہی تھی، شاید اسے لگتا تھا میں مسلمان ہوں اور اس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ لیکن اگر ایسا لگتا بھی تھا تو ٹھیک ہی تھا۔

اس دن ایلا بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ نقاہت چہرے سے صاف عیاں تھی۔ ہم جلدی لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے مجھے ڈاکٹر کی جانب سے کال آ گئی تھی کہ ڈونر بس چند سانسوں کا مہمان تھا۔ ہوٹل ہسپتال کے نزدیک ہی تھا تو مجھے پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

اور بس آج وہ دن آ ہی گیا۔ جب میں ایک نئے دل کے ساتھ مکمل زندگی پا چکا ہوں۔ ماں کہہ رہی تھیں ایلا آئی ہے۔

اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے اردگرد تین چہرے نظر آئے، دو اپنے ایک انجانا۔ شاید وہ نرس تھی مگر ان میں ایلا نہیں تھی۔ ماں صدقے واری جانے لگی، بابا خوشی سے نڈھال ہو گئے کہ جیسے ان کو جوانی لوٹا دی گئی ہو۔

"مگر ایلا؟" میں نے بابا کو مخاطب کیا۔

بابا نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کر ایک جانب پڑی وہ اسکیچ بک میری جانب بڑھا دی۔

ہاں یہ تو وہی تھی جو ایلا سینے سے لگائے رکھتی۔ لیکن یہ یہاں کیسے؟ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا بابا نے ایک مڑا ہوا ورق مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کھولا شروعات میں ہی کافی بڑا کر کے لکھا ہوا تھا۔

"کیسے ہو لمبی ناک والے مشرقی مرد؟ نہیں نہیں تم تو کشمیری ہو۔

تم نے کہا تھا ناں کہ نئی زندگی میں، میں تمہیں اپنے سامنے چاہیے ہوں۔ تو دیکھ لو میں نے وعدہ وفا کیا ہے۔ میں تمہارے سامنے موجود ہوں، تم سے بات کر رہی ہوں۔ اور قہقہے بھی لگا رہی ہوں۔ تمہیں تو پسند ہے ناں میرا ہنسنا۔ مگر تمہیں ایک بات بتاؤں تم سے کہیں زیادہ مجھے تمہارا ہنسنا پسند ہے۔ ہاربر فرنٹ سینٹر پر جب میں نے پہلی بار ٹکٹ پکڑاتے ہوئے ویران آنکھوں والے شخص کو دیکھا تو نجانے کیوں دل نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میرے اندر کے آرٹسٹ نے مجھے تمہاری آنکھوں میں رنگ بھرنے کی درخواست کی تھی اور میں فن کی رسیا، بھلا کیسے جھٹلا سکتی تھی؟ جب تم پہلی بار ہنسے مجھے لگا دنیا بھر میں اس سے خوب صورت نظارہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ مسافر صفت لڑکی کی سفر پر لگائی ساری دولت پچھتاوا ہوئی تھی کہ اگر مجھے معلوم ہوتا تمہیں دیکھنے کے بعد مزید کچھ دیکھنے کی چاہ نہیں رہے گی تو میں

تمہاری وادی نیلم پہنچ جاتی۔

تم حیران تھے کہ تم نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے متعلق مجھ سے سب کچھ کیسے کہہ دیا؟ مگر میں جانتی تھی کہ دلوں کے جوڑ تو بنانے والا جوڑتا ہے وہاں کیوں کیسے کا سوال نہیں ہوتا۔

میں نے تمہیں اپنے بارے کچھ نہیں بتایا تھا۔

بتاتی بھی تو کیا؟؟ یہی کہ میں ایک عام اسکاٹش تھی۔ جس کے باپ کو اس کی ماں نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر مار دیا۔۔۔اور دس سالہ بچی کو یونہی بھیڑیوں کے معاشرے میں لاوارثوں کی طرح پھینک دیا۔ جو ماں کے عزیز از جان دوسرے شوہر سے بھی بچ نہ سکی۔

پندرہ سال کی عمر میں میں وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ اور پھر ٹرین میں کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی۔ ہاں مگر میں نے پتھر مار کر اس شخص کو لہولہان کر دیا تھا۔ پتا نہیں جہنم واصل ہوا یا نہیں؟

یہاں پہنچنے پر میں نے ایک یتیم خانے میں پناہ لی۔ ڈیڈ کے جانے کے بعد یتیم خانے میں گزرے وہ تین سال میری زندگی کے بہترین سال تھے کہ یہاں سسٹر کیتھی کے ذریعے میں نے رنگوں سے دوستی کی تھی۔ اور اٹھارہ کی ہونے کے بعد مختلف جگہوں پر مختلف نوکریاں۔ مجھے دنیا گھومنی تھی۔ تو بس جو پیسے جمع ہوتے کہیں نہ کہیں نکل جاتی اور پھر جب وہ ختم ہوتے تو لوٹ آتی۔ اور لگ جاتی نئی نوکری نئے کام کی تلاش میں۔

''زندگی پرسکون ہی رہتی اگر جو سر کے درد سے تنگ آ کر میں ہسپتال کا رخ نہ کرتی تو۔ جہاں مجھے بتایا گیا کہ برین ٹیومر لاسٹ اسٹیج تک پہنچ چکا ہے۔''

اور اس جملے پر وہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑے میرا ہاتھ کانپ گیا ہے۔ مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ سچ کہتی تھی اسے روشنیاں اور تیز آوازیں راس نہیں آتا تھیں۔

''میں جانتی ہوں یہ تمہارے لیے شاکنگ ہے۔ مگر یہی تو حقیقت ہے اچھے لڑکے۔ تم نے کہا تھا میں تمہاری حالت کو نہیں سمجھ سکتی۔ ہاں شاید میں واقعی نہیں سمجھ سکتی تھی مگر میں سر کے اس شدید درد کو سمجھتی تھی۔ جو مجھے تمہارے ساتھ ہاٹ چاکلیٹ کھاتے ہوئے گرانے والا تھا۔ لیکن میں کیسے گر سکتی تھی؟

میں گرتی تو تم پریشان ہو جاتے۔ اور تمہیں پریشان کرنے کی خطا کون کرے؟

مجھے مرد نام سے خوف آتا تھا، اس سے چڑ تھی، نفرت تھی لیکن تم سے ملتے وقت کی ان پاکیزہ گھڑیوں کی میں مقروض ہو گئی اور قرض اتارنا تو فرض ہوتے ہیں۔

ڈیڈ کے بعد میری زندگی میں آنے والے تم پہلے مرد تھے جس کے چہرے پر ہنسی بکھیرنے کی میرے دل نے تمنا کی تھی۔ اور زندگی کے آخری دنوں میں اس کی یہ تمنا یقیناً پوری کی جا سکتی تھی۔ مجھے جینے کو وجہ چاہیے تھی اور تمہیں ہنسنے کو ساتھ تو ہمارا ملنا خدا کا بہترین فیصلہ تھا۔ اور اسی خدا نے میرے اندر یہ صفت رکھی ہے کہ لوگوں کو وہی تحفہ دیا جائے جس کی ان کے پاس کمی ہو اور تمہارے پاس تو مسکراہٹوں کا کال پڑا ہوا تھا۔ تو تمہارے لیے جوکر بننا خسارے کا سودا تو نہیں تھا۔''

مجھے اس کا چاکلیٹ سے بھرا چہرہ اور سنہری بال یاد آ رہے ہیں۔ یا میرے خدایا یعنی وہ سب سوچا سمجھا پلان تھا؟

''تمہیں معلوم ہے ایہان، اب میں تمہارا نام صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر رہی ہوں۔ مگر دیکھو تم سن نہیں سکتے آہ! یہ افسوس۔ تمہاری مسکراہٹ تو لوٹ آئی تھی۔ مگر ابھی بھی کچھ تھا جس کی تمہارے پاس کمی تھی، ایک اچھے صحت مند دل کی کمی۔ اور ایلا جارج کو تم اتنے عزیز ہو چکے ہو کہ تمہاری ضرورت میری اولین ترجیح ہے۔ میں نے ڈاکٹرز سے بات کر لی ہے۔ میرے پاس تو گنتی کے دن ہی ہیں لیکن اگر میرا دل تمہارے سینے میں دھڑکے تو اس سے اچھا کیا ہو سکتا ہے؟

''میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا تو کیا یہ ایلا

کا دل ہے؟"

"تم نے مجھے دیکھنے کا اصرار کیا تھا مگر میں کیسے وعدہ کرتی کہ جھوٹے وعدے نہیں ہوتے مجھ سے۔ لیکن دیکھو تو میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔ یہ جس کو سینے پر ہاتھ رکھتے محسوس کرنا چاہا ہے، وہ میں ہی تو ہوں۔ تو مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ اداس مت ہوا کرو کہ تمہارے اداس ہونے سے ہوائیں تک پر سوز ہو جاتی ہیں۔ جو نہیں ہے اس پر مت سوچو، جو موجود ہے اسے دیکھو۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے تمہارے دین میں مسکرانے کو صدقہ کہا گیا ہے۔ تو مسکراؤ کشمیری لڑکے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ بہت پیاری لگتی ہے۔"

کشمیری لڑکے کے سامنے اگلے لفظ دھندلا گئے تھے۔ کب سے حلق میں پھنسے آنسوؤں کے گولے آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ جنہیں صاف کرتے میں نے پھر سے پڑھنا شروع کیا۔

"روؤ مت بلکہ رشک کرو ایلا جارج کی قسمت پر کہ جس پر یہ دل ہارا اسی کے سینے میں دھڑکتے رہنے کا اعزاز پالیا۔ کیا کوئی ہے روئے زمین پر مجھ سے زیادہ خوش قسمت؟ تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتی ہوں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ میری یہ بک جس کو تم اکثر تجسس سے دیکھا کرتے تھے وہ بھی میں تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ تمہارے بابا سے مل کر یہ میں انہیں پکڑا دوں گی۔"

میں کور پر ہاتھ پھیر کر اسے محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔

"میں جانتی ہوں اس میں موجود ہر پینٹنگ جو ہمارے ایک ساتھ بتائے لمحوں کو مقید کیے ہوئے ہے۔ آرٹ کی دنیا کا شاہکار ہے۔ مگر میں اسے کسی میوزیم میں نہیں دیکھنا چاہتی کہ یہ میری رت جگے کی کمائی ہے۔ میں نے درد سے پھٹتے سر کے ساتھ کھڑکی کے پار چاند کو دیکھتے بنائی ہیں۔ اس وقت جب تم اپنے ہوٹل جا کر سو جاتے تھے میں تمہیں کینوس پر اتار رہی ہوتی تھی۔ تو میری ریکوئسٹ ہے تم اسے اپنے ساتھ لے جانا۔ اسٹور روم کے کسی پرانے ٹرنک میں پھینک دینا۔ بھلے بیتے وقت کی گرد اس پر جم جائے مگر اتنا تو ہوگا کہ وہ وادی نیلم میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں میں نہیں جا سکی۔ اور ہاں بس میرے دل کی حفاظت کرنا، اسے الجھنوں میں الجھا کر تھکا مت دینا۔ یہ تمہاری ہنسی سننا چاہتا ہے کہ یہ ایلا کا دل ہے۔

تمہارے ساتھ گزارے دسمبر کے اکتیس دن ایلا جارج کی بائیس سالہ مکمل زندگی پر بھاری ہیں اور اس کے لیے ایلا جارج تمہاری شکر گزار ہے۔۔۔"

پیغام ختم ہوا تھا میرا دل چاہا میں چیخ چیخ کر روؤں مگر میں ایسا نہیں کر سکا۔ میری ماں نے میرے سر پر بوسہ دیا تھا اور میں دل پر ہاتھ رکھتے، کہہ رہا ہوں۔

"دسمبر کے اکتیس دن میرے لیے بھی خوب صورت تھے ایلا جارج۔ مگر تم نے ان کی بھاری قیمت وصول کی ہے کہ میں جس کے ساتھ ہنسنا چاہتا تھا اسے چھین لیا۔ اور اس پر تم ظریفی یہ حکم بھی سنا دیا کہ میں رو نہیں سکتا؟ مجھے ہنسنا ہوگا۔

آہ ایلا آ تم اتنی سنگدل تو نہ تھیں۔

نئی زندگی بھلے شروع ہو چکی مگر جینے کی جو خواہش تم سے پائی تھی اس کا کیا؟

جب شکر کا کلمہ سیکھ گیا تو صبر کے دائرے میں آ کھڑا ہوا ہوں۔ تم تو خود کو خوش بخت کہہ گئیں مگر ایہان حمزہ کی قسمت کے بارے کیا خیال ہے تمہارا؟ کس پیمانے پر جانچنا چاہو گی اسے؟؟ مجھے تو بد قسمتی کا پلڑا بھاری لگ رہا ہے۔ اس قیمتی متاع پر جو آنکھیں تم نے پینٹ کی ہیں ان کے کرب کو اب دیکھو ایلا۔ تمہارا خسارہ ان کی ویرانیوں کو بڑھا گیا ہے۔ ورق پلٹتے مسکراتی آنکھوں والے کے دو سے زیادہ اسکیچ دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی مجھ میں کہ جو چمک تمہارے ساتھ کی بدولت ملی تھی وہ اسی کے ساتھ ختم ہو گئی ہے۔

تین جنوری کا یہ دن بڑا وزنی ہے۔ بہت وزنی۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

من دیپ

مکمل ناول

پُر آرائش کمرے کے وسط میں کھڑے، اس نے بے چین ہو کر آس پاس دیکھا مگر ذہن نے کسی چیز پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ تھک ہار کر نڈھال قدموں کے ساتھ اپنے بیڈ کی طرف بڑھی۔ ہواؤں کا شور، اس کے اندر چھائی خاموشی پر حاوی ہونے لگا تھا۔ خراب موسم کی وجہ سے بجلی کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ جیسے ہی وہ اپنے بستر تک پہنچی، ایک دم لائٹ چلی گئی۔ اس نے کچھ لمحے انتظار کیا۔ جنریٹر آن ہوتے ہی ہلکی روشنی پھیل گئی کیونکہ کمرے کی روشنیاں تو وہ پہلے ہی بجھا چکی تھی۔ بستر پر نیم دراز ہو کر چند گہری سانسیں لیں۔ عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ اس کے دل کو گھیر رہی تھی۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور سائیڈ میز پر رکھی ڈائری اٹھا لی۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ ڈائری ہی واحد ہمراز تھی اور جس کی ضرورت آج کل شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بادل کی گرج، چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش برسنے کی آوازیں سنتے ہوئے، وہ رک رک کر کچھ لکھ رہی تھی۔

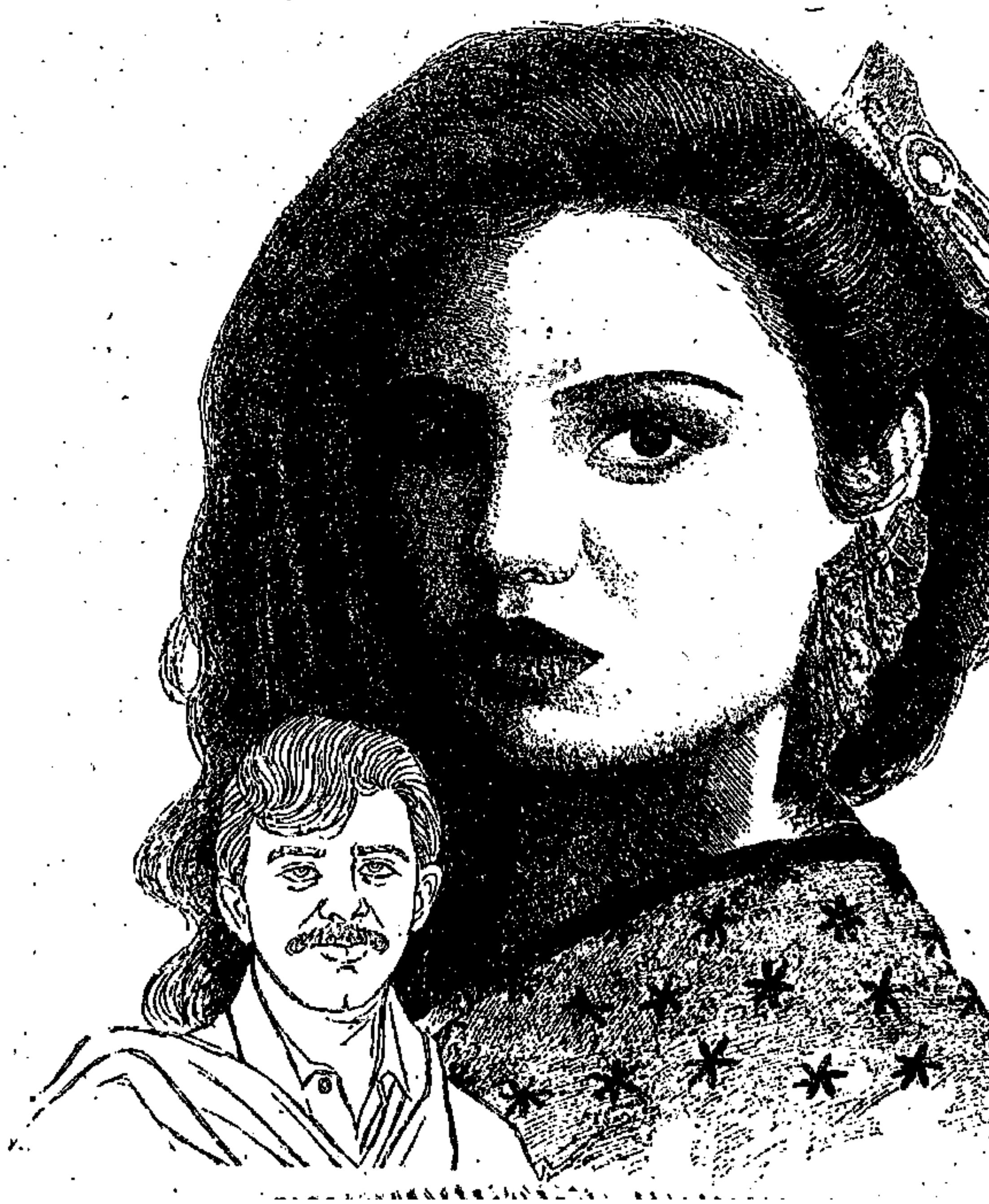

کئی لمحے بارش کی ننھی بوندوں کی طرح تیزی سے سرک گئے۔

''پتا نہیں! سب کہاں رہ گئے؟''

اس نے ہاتھ موبائل کی طرف بڑھایا جب ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سینے پر کوئی بھاری چیز رکھ دی ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بستر پر نیم دراز، نور بہتی آنکھوں کے ساتھ اس نے سینے پر دھری ڈائری کو محسوس کیا تھا۔ ایسے جیسے اس میں مقید ماضی کا شفیق لمس اسے سہلا رہا ہو۔

''دادو جان۔!'' بے اختیار اس کے لبوں سے ادا ہوا۔ سفید لبادے میں ملبوس پر شفیق چہرہ مسکرایا مگر آنکھوں میں واضح نمی تھی۔ وہ کچھ لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ پچھلے سات سالوں میں کئی بار، اس چہرے کو قریب دیکھنے کی خواہش کی مگر زندگی اور موت کی سرحد کے بیچ، وقت کے شیشے کی باریک مگر آسمان تک بلند دیوار کھڑی تھی۔ جسے پار کرنے کی خواہش بھی اس نے شدت سے کی تھی۔

اچانک اس نے مدھم ہوتی روشنی میں، شیشے کی دیوار پر چھوٹے چھوٹے، مختلف رنگوں کے لاتعداد پھول کھلتے دیکھے۔ جیسے یہ پھول، شیشے کی دیوار کو ڈھانپ رہے ہوں۔ وہ خاموشی سے خوش رنگ پھولوں کو تیزی سے پھیلتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کی روح ان پھولوں کی خوشبو کو پہچانتی تھی۔ یہ پھول محبت کی زمین پر کھلے تھے۔ اس میں سے سب سے پیارا وہ پھول تھا جسے کبھی کسی نے چھوا تھا۔

''کاسنی پھول!'' بے اختیار لب تھرتھرائے۔

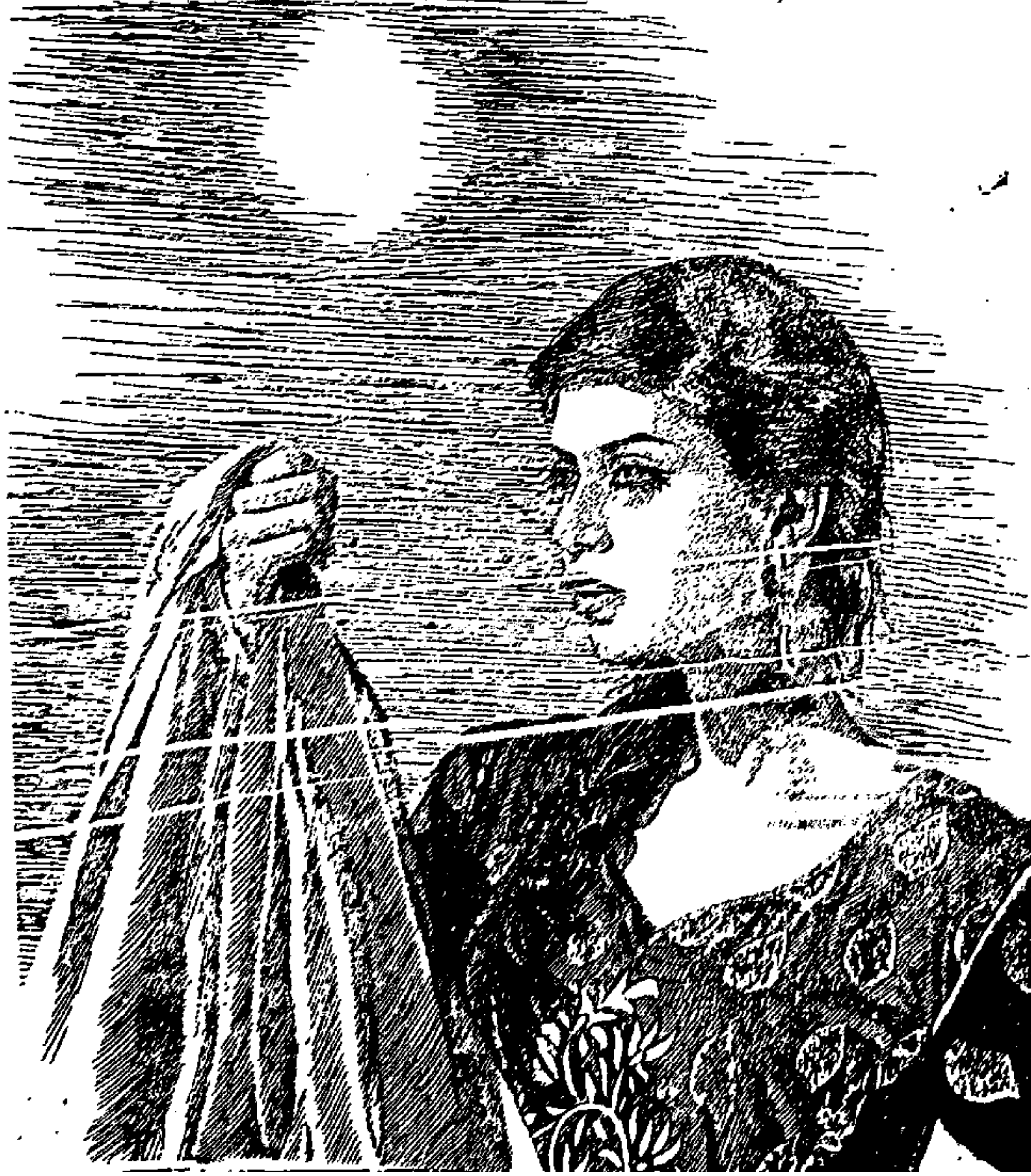

"تم وہ لمحہ ہو کہ جس لمحے، پھول کو خوشبو عطا ہوتی ہے۔!!" کسی نے کہتے ہوئے کاسنی پھولوں سے اس کی جھولی بھر دی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرائی۔ کاسنی پھول محبت کا چہرہ بن کر اس کی آنکھ کی پتلی پر ثبت تھا۔ شاید اسی لیے سب منظر، کاسنی رنگ کے ہی نظر آتے تھے۔ سینے پر رکھا بوجھ ہٹنے لگا۔ محبت اس کی روح پر آسمان سے اتری تھی۔ اس کا جسم روئی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ انسان جو ساری زندگی محبت کی چھاؤں میں گزرنے کی دعا کرتا ہے اگر آخر دم بھی یہ محبت ساتھ ہو تو اس سے خوب صورت اور مکمل حاصل کیا ہو سکتا ہے؟

اس سے پہلے کہ محبت کے پھول، وقت کے شیشے کو پوری طرح ڈھانپ لیتے، ایک چھناکے سے شیشے کی دیوار گر گئی۔ زندگی اور موت کی سرحد آپس میں جڑیں اور سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگی!

اندھیرے میں ڈوبتے ذہن پر آخری تصویر جو حاوی ہوئی، وہ محبت کے کاسنی پھولوں کی تھی مگر مرجھائے ہوئے اور بوسیدہ کاسنی پھول۔!!

☆☆☆

مرجھائے پھولوں کی سوگوار خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی خوب صورت بولتی آنکھوں میں ضبط کی سرخی واضح تھی۔ کچھ لمحے لگے، یاد کے کسی لمحے سے، واپس حال میں آنے میں۔ رائٹنگ میز پر کھلی ڈائری کے صفحے ہوا کی وجہ سے لہرا رہے تھے۔ اس نے کمرے میں پھیلی بوسیدہ خوشبو کا مرکز ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ محبت کا مدفن کہاں ہے؟ اسے تو بس آخری سانس تک محبت کے مزار پر مجاور بن کر زندگی گزارنی تھی۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھا، ڈائری کے اڑتے صفحے دیکھتا رہا۔ بادلوں کی گرج بھی اس کے ارتکاز کو نہیں توڑ سکی تھی۔ کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ تو اس کی اداس نگاہ نے کھڑکی کے شیشے تک سفر کیا۔ ناز دکھاتی بارش کی بوندوں کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ کسی کا چہرہ تلاش کر رہا تھا۔

کبھی یہ بارشیں اس کے جیسی لگتی تھیں۔ ہنستی، بولتی، گنگناتی، خود میں ہی دور لیش اور متلاشی سی!

بارشیں اس کا لب و لہجہ پہن لیتی تھیں۔۔

شور کرتی تھی وہ برسات میں، جھانجر کی طرح۔

اب یہ بارشیں صرف اداسی کی کسی کتھا سے بہتی ہیں اور ہر طرف آنسو دے جاتی ہیں۔

بارش نے جب سامنے بیٹھے مرد کی آنکھوں سے سچے موتی جیسے آنسو، بوندوں کی طرح ٹپکتے دیکھے تو بے چین ہو کر موسلا دھار برسنے لگی جیسے آنکھوں سے بہتے انگاروں کو اپنے نرم لمس سے بجھانا چاہتی ہو مگر ہجر کی آگ میں جلتے دل اور جسم، ازل تک بجھتے نہیں ہیں۔!!

جو بات گنتی کے کچھ دنوں،
سے شروع ہوئی تھی۔
وہ سالہا سال تک چلی ہے،
کئی زمانوں میں بٹ گئی ہے
میں ان زمانوں میں لمحہ لمحہ۔
تمہاری نظروں کے بن رہا ہوں!
میں اب تلک بھی تمہارے جانے کا۔
باقی نقصان گن رہا ہوں!!

☆☆☆

ٹیکسی بوگین ویلیا کی بیل سے سجے گیٹ کے پاس رکی تو وہ گاڑی سے اتری اور سامنے بنے خوب صورت مگر کئی سال پرانے بنگلے کی طرف دیکھا۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھی اور بیل بجائی۔ اسی وقت بیرونی گیٹ میں لگی چھوٹی کھڑکی کھلی اور خان بابا نے جھانکا۔

"زویا بیٹی!" خان بابا نے خوشی سے پکارا اور جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خان بابا! آپ نے پورا گیٹ کھول دیا ہے جیسے میں گاڑی اندر لا رہی ہوں۔" اس نے شرارت سے کہا اور آگے بڑھی تو خان بابا نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

"بی بی گل کہاں ہیں؟" زویا نے دوستانہ انداز میں خان بابا کی بیوی کے بارے میں پوچھا۔

"اندر چلو بٹی! سب یہاں ہی ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اتنی دور اکیلی کیسے آ گئی ہو؟ صاحب نے روکا نہیں؟" خان بابا نے حیرت سے اس کے باپ کے بارے میں پوچھا تو زویا نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"مما کہتی ہیں کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں مجھے دنیا کا اکیلے سامنا کرنا آنا چاہیے۔" ایک لمحے کے لیے اس کا لہجہ مدھم ہوا تھا مگر پھر سے سنبھل گیا۔

"کیا تمہارا باپ بھی یہ ہی کہتا ہے؟" خان بابا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ زویا کوئی جواب دیتی، سامنے سے بی بی گل دونوں ہاتھ وا کیے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ چلی آئیں۔

زویا، بی بی گل کے گلے لگ کر اپنے بچپن کے اس لمس کو محسوس کرنے لگی، جو ماں کے بعد اس کی دوسری جائے پناہ تھا۔ بی بی گل بھی کافی دیر اسے گلے سے لگائے کھڑی رہیں۔

"بس کرو! بچی تھکی آئی ہے۔ روٹی پانی کا بندوبست کرو۔" خان بابا نے پاس آ کر نرمی سے کہا تو دونوں چونک کر الگ ہوئیں۔

"خان بابا! لاہور سے اسلام آباد اتنا بھی دور نہیں ہے۔" زویا نے مسکرا کر کہا۔

"سب پتا ہے مجھ کو! بچی کی پسند کا یخنی پلاؤ بنایا ہے۔ چلو بچی۔" بی بی گل نے جلدی سے کہا اور زویا کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

پرانی طرز کے بنے، آرٹسٹک انداز کے ہال میں قدم رکھتے ہی، زویا نے ستائشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

"سویا ہوا محل یا کسی جادوگر کے جادو سے ساکت ہوئی دنیا یا!"

زویا کی چلتی زبان ایک دم رکی تھی۔ اس نے اپنی جلد بازی میں دیکھا ہی نہیں تھا کہ سامنے اپنی مخصوص جگہ پر وہ خاموشی سے بیٹھے، اسے سن رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر بی بی گل کی طرف دیکھا جو کندھے اچکاتے، فوراً کچن کی طرف چلی گئیں۔ زویا نے تھوک نگل کر سامنے بیٹھے بت کی طرف دیکھا۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ وہ آگے بڑھی۔

"سلام بابا!" اس نے جلدی سے کہا۔

"السلام علیکم!" بت میں حرکت ہوئی اور سرد لہجے میں کہا۔ وہ بوکھلا گئی۔

"جی جی یہ ہی کہنے والی تھی۔ السلام علیکم بڑے بابا، اور وعلیکم السلام بڑے بابا! میں ٹھیک ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی ٹھیک ہوں گے۔ اب میں فریش ہونے کمرے میں چلی جاؤں؟"

اس نے بغیر رکے، ایک سانس میں ساری فارمیلیٹی نباہ کر، وہاں سے جانے کی اجازت مانگی تو سامنے بیٹھے بت کے ہونٹوں پر ایک چھوٹے سے لمحے میں، بھولی بھٹکی مسکراہٹ کا جگنو چمکا۔ زویا کے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ اس نے ان لبوں کو کبھی کھل کر ہنستے بھی دیکھا تھا مگر کب؟؟ وہ الجھ گئی۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور فوراً سر ہلا کر جانے کی اجازت دی۔ وہ دل میں شکر کرتی تیزی سے، کونے میں بنے کمرے کی طرف بڑھی جب ایک سرد آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"سنو لڑکی! پورے گھر میں آزادانہ گھوم پھر سکتی ہو مگر کبھی بھول کر بھی اوپر بنے کمرے کی طرف مت جانا۔ امید ہے کہ تمہیں دوبارہ یاد نہیں کروانا پڑے گا۔"

لہجے میں واضح تنبیہ تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی آنکھیں ملیں۔

وہ ایک دم ٹھٹکے اور انہیں شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ زویا نے سعادت مندی سے فوراً سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑی، جہاں وہ چند مہینے پہلے بھی کچھ دن رہ کر جا چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے گہری سانس لی اور سر جھٹکا۔

"تمہیں تنبیہہ کرتے ہوئے میں کیسے بھول گیا کہ تم میرا ہی خون ہو۔ جس چیز سے ہمیں منع کیا جائے، ہم وہ کام ہی ضرور کرتے ہیں۔" انہوں نے فکرمندی سے سوچا۔ زویا کی آنکھوں میں ابھرتے چیلنج کے رنگ کو بخوبی پہچان گئے تھے۔

☆☆☆

یہاں کی صبحیں ہمیشہ کی طرح پرسکون اور فرحت بخش تھیں۔ اپنی کھڑکی سے دور تک نظر آتے سبزے کو دیکھتے ہوئے، وہ کچھ دیر اردگرد سے بے خبر رہی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد، چائے کی طلب ہوئی تو وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے، کھڑکی کے پاس رک کر بے ارادہ ہی باہر جھانکنے لگی۔ صبح کے اسرار کھوجتی، اس کا ذہن بھٹک کر اوپر والے کمرے کی طرف چل گیا۔

آخر وہاں کون سا راز دفن ہے؟ شاید پرانی فلموں کی طرح کوئی پراسرار آتما، مطلب روح وہاں قید ہے جسے میں اپنی معصومیت میں آزاد کردوں اور وہ روح ساری زندگی میرا پیچھا نہ چھوڑے اور نہ روح کا رکھوالا یعنی بابا!

اس نے منہ بنا کر سوچا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ سارے گھر پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے، جیسے ہی وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پاس سے گزری تو بے خیالی میں رک گئی۔ نظر بلا ارادہ ہی سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچ گئی تھیں۔

"کہیں اوپر جانے کا ارادہ تو نہیں؟" بھاری مگر سنجیدہ آواز پر وہ گھبرا کر مڑی۔ بیرونی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو رہے تھے۔

"السلام علیکم بابا! صبح بخیر! کیا آپ چائے پئیں گے؟ میں چائے ہمیشہ سے اچھی بناتی ہوں مگر کوئی مانتا نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"پھر میں کیسے مان لوں؟ تم نے جواب نہیں دیا۔ کیا اوپر جانے کا سوچ رہی تھیں؟" انہوں نے گھورتے ہوئے سوال دہرایا۔

"آپ ساری رات یہاں کا پہرا دیتے رہے ہیں؟" وہ بھی ان کی بھتیجی تھی فوراً منہ بنا کر پوچھا۔

"میری تو ساری زندگی گزر گئی، اس پہرا داری میں۔!" اداس لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

زویا نے غور سے دیکھا۔ اداس چہروں کے اسرار اپنی طرف کھینچتے ہیں جیسے قدیم عمارت پر لکھے اجنبی حروف ہوں جس کی کھوج بے چین کر دیتی ہے۔ اس بے چینی کا اندازہ اسے آج ہوا تھا۔

"چائے اسٹرونگ ہو اور چینی کم۔!" بارعب انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی سر ہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"بابا اتنے امیر اور اس پراسرار بنگلے کے مالک بھی ہیں۔ پھر ان کے پاس گاڑی کیوں نہیں ہے؟"

وہ جو کافی دیر سے آن لائن ٹیکسی سروس کو بلانے کی کوشش کر رہی تھی، جھنجلا گئی۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے اس وقت کوئی ٹیکسی نہیں مل رہی تھی اور اسے کالج سے دیر ہو رہی تھی۔

"گاڑی تو ہے مگر ڈرائیور چھٹی پر ہے۔" خان بابا نے اطمینان سے کہا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

"گاڑی نظر کیوں نہیں آ رہی؟" حیرت سے سوال کیا۔

"اس [illegible] کہ گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ کل تک آ جائے گی۔" خان بابا نے مسکرائے۔

"چلو شکر ہے۔ پھر تو آسانی ہو جائے گی۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"زویا بیٹی نے گاڑی چلانا کب سیکھی؟" خان بابا نے حیران ہو گئے۔

"مجھے گاڑی چلانا تو نہیں آتی ہے۔" اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا بیٹے، سمجھا کہ۔!" انہوں نے گہری سانس لی۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

"اب کالج کیسے جاؤں گی؟" انہوں نے زیر

پریشانی سے کہا۔
"کچھ دیر میں عبدالہادی تمہیں پک کرنے آ رہا ہے۔ کالج چھوڑ دے گا۔ واپس تم ٹیکسی سے آ جانا۔"
برآمدے میں کھڑے شخص کی مخصوص بارعب آواز پر زویا نے پلٹ کر دیکھا۔ جو اس کی مشکل کا حل لے کر آئے تھے۔ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد، خان بابا نے عبدالہادی کے آنے کی اطلاع دی تو وہ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی تیزی سے کالی گاڑی کی طرف بڑھی۔ پچھلا دروازہ کھول کر پہلے بیگ اور فائل سیٹ پر پھینکی اور پھر خود بھی تقریباً چھلانگ لگا کر بیٹھ گئی۔ بیک مرر سے جھانکتی گہری کالی آنکھوں میں ناگواری اتری تھی۔
"لگتا ہے کہ محترمہ اس گاڑی میں بیٹھنے کو اولمپک کے کھیل کا حصہ سمجھ رہی ہیں۔"
وہ بڑبڑایا۔ زویا نے کے تیز کانوں نے سن لیا اور اس کی چوڑی پشت کو گھورنے لگی جس پر براؤن رنگ کی چادر تھی۔
"کیا گاڑی میرے دھکا دینے سے چلے گی؟ مجھے پہلے ہی کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے بھی گاڑی کو رکا دیکھ کر تپ کر طنز کیا۔ بیک مرر سے جھانکتی آنکھوں میں حیرت اتری تھی۔
"بات یہ ہے محترمہ، کہ کھلے دروازے کے ساتھ، پہاڑی راستے پر گاڑی چلانے کا تجربہ کچھ اچھا ثابت نہیں ہوگا۔"
اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا تو زویا نے گردن گھما کر گاڑی کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور سر پر ہاتھ مارا۔ اور ہاتھ بڑھا کر پوری طاقت سے دروازہ بند کیا۔
ایک لمحے کے لیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
"اتنا ظالمانہ طریقہ۔!" وہ بڑبڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، اس نے زن سے گاڑی بھگا دی۔
"سنو ڈرائیور! میں کالج سے جلد فارغ ہو جاؤں گی اگر آپ کے پاس وقت ہے تو۔!" وہ کہتے ہوئے ایک دم چپ ہو گئی کیونکہ اس کی طرف گہری کھائی تھی۔
"توبہ کریں بی بی! میں ایسا ویسا بندہ ہرگز نہیں ہوں جو نامحرم لڑکیوں کے ساتھ ڈیٹ پر جائے۔ ہاں چائے پینے پر غور کر سکتا ہوں۔" شرارت سے کہتے ہوئے اس نے بیک مرر سے دیکھا تو وہ اسے گھور رہی تھی۔
"اس علاقے کے ٹیکسی ڈرائیور کافی شوخ مزاج لگتے ہیں۔ ویسے پڑھے لکھے ہیں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔
"کیوں؟ آپ نے نوکری دینی ہے؟" سڑے لہجے میں پوچھا گیا۔
وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کسی آس میں خاموش موبائل کو آن کر کے دیکھا مگر اس کی خیر خبر دریافت کرنے کے لیے کسی نے میسج کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا روشن چہرہ تاریک ہوا جو مسلسل گھورتی نگاہوں سے چھپا نہیں رہا تھا۔
"آپ کو بیک مرر سے مسلسل دیکھنے میں مشکل ہو رہی ہے تو میں فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔" اس نے منہ بنا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔
"معذرت مگر میں آپ کو نہیں، پیچھے سے آتی گاڑیوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نظر آپ پر پڑ جاتی۔ بہر حال کالج آ گیا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے اونچے پہاڑی راستے پر گاڑی دوڑائی اور کچھ دیر کے بعد وہ گاؤں کے پاس بنے ایک گورنمنٹ کالج کے باہر پہنچ گئے تھے۔
زویا نے حیرانی سے دور دور تک پھیلی ویرانی کو دیکھا۔ ہر طرف ہریالی تو تھی مگر پہاڑی علاقے کی وجہ سے سنگلاخ چٹانیں بھی موجود تھیں۔
"یہاں کالج بنانا تو سزا دینے کے مترادف

ہے۔" وہ بڑبڑائی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ ناگواری کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"آپ شہر والوں کو کیوں لگتا ہے کہ چھوٹے علاقوں، گاؤں والوں کا بنیادی سہولتوں سے محروم رہنا، ان کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے؟ محترمہ، تعلیم، روزگار، سہولتیں، ان پر گاؤں والوں کا بھی پورا حق ہے۔"

اس نے پہلی بار پیچھے مڑ کر گاڑی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے، منہ کھولے بیٹھی زویا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونق چہرے پر پڑنے والی سنہری شعاعیں، اس کی آنکھوں کے سنہرے پن سے مل رہی تھیں۔ ایسا ہی سنہرا سا ہالہ اچانک اس کے دل کے گرد بنا تھا۔ اس نے نگاہیں چرائیں جبکہ زویا بھی غور سے خوش کل نوجوان کو دیکھنے لگی، جس کی بڑھی شیو اور ملگجے کپڑے اس کی تھکن کو ظاہر کر رہے تھے۔

"ہونہہ! اتنی باتیں سنانے سے بہتر تھا کہ کچھ پڑھ لکھ جاتے اور یہاں کے لوگوں کے لیے کچھ کر لیتے۔ بڑے آئے غریبوں کے مسیحا!" وہ بڑبڑاتی نیچے اتری اور کچھ یاد آنے پر شیشے پر جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا۔ "کتنے پیسے؟" اس نے بارعب انداز میں پوچھا۔

وہ جو گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا، گردن گھما کر اس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ "آپ سچ میں پیسے دیں گی؟؟"

"تو آپ مجھے کیا مفت ماری سمجھ رہے ہیں؟ ایسا ہے کہ ابھی تو میرے پاس کچھ زیادہ پیسے نہیں ہیں۔ آپ مجھے واپسی میں بھی پک کر لیتا۔ بلکہ ایسا کریں کہ آپ ہر روز مجھے پک اینڈ ڈراپ دے دیا کریں۔ جیسے ہی اگلے مہینے سیلری ملے گی سب سے پہلے آپ کا قرض اتاروں گی۔"

زویا نے تیز لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو روکا تھا۔

"یعنی کہ آپ یہاں ٹیچر ہیں؟" اس نے چہرہ دوسری طرف کر کے کالج کے کھلے گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ زویا نے فخریہ انداز میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ سامنے ہی میرا گھر ہے۔ میں آپ کو پک اینڈ ڈراپ دے دوں گا مگر آپ پہلے میجر صاحب سے پوچھ لیجیے۔"

اس نے مسکرا کر کہا اور زویا کی بات سنے بغیر گاڑی زن سے لے گیا۔ زویا نے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

"بابا سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اپنی کمائی سے پیسے دوں گی۔ میں سیلف میڈ بنوں گی۔ میں!"

اپنی دھن میں بولتی، تیز تیز قدم اٹھاتی وہ لمبی گھاس پر پاؤں رکھتی، کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب اچانک اس کا پاؤں، گیلی چیز کے اندر تک دھنس گیا۔ اس نے گھبرا کر زمین کی طرف دیکھا۔ کچھ دور کھڑی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ زویا نے گوبر میں بھرے پیر کی طرف دیکھا اور بے ساختہ رو پڑی۔ اسی وقت ایک لڑکی تیزی سے بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"آپ شاید یہاں نئی ہیں۔ اس طرف آئیں۔ وہاں نلکا لگا ہوا ہے۔"

سفید دوپٹے کے کنارے پر لگی نیلی پٹی لگی ہوئی تھی۔ لڑکی خوب صورت تھی مگر اس کے حسن کو چہرے کی معصومیت نے بڑھا دیا تھا۔

"میرا نام ثمرہ ہے اور میں میرا گھر یہاں سے پاس ہی ہے۔ اس لیے پیدل آ جاتی ہوں۔ ویسے تو ہمارا علاقہ قدرتی حسن سے مالا مال ہے مگر یہاں کا اصل مسئلہ!"

ثمرہ نان اسٹاپ بولنے میں زویا کی بھی استاد نکلی تھی۔ زویا خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ اپنا پاؤں اچھی طرح دھونے کے بعد، اسے اپنی برانڈڈ جوتی کے خراب ہونے کا صدمہ کھائے جا رہا تھا۔

"اس ٹیکسی والے کو وقت پر کرایہ نہ دینے کی سزا ملی ہے۔" کلاس سے اپنا تعارف کروانے کے

بعد، جب اسے کچھ دیر سکون سے بیٹھنے کا موقع ملا تو پہلا خیال یہ ہی آیا تھا۔

☆☆☆

سبزے سے سجے، خوب صورت پارک میں معمول کے مطابق لوگوں کا رش تھا اس نے جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے پہلا چکر مکمل کیا اور دوسرے چکر کے لیے مڑا، کچھ دور پارک کے ویران حصے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے غیرارادی طور پر خالی بینچ کی طرف دیکھا۔ سر جھٹک کر آگے بڑھا مگر اس کے دل میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔

تیسرے چکر میں جب وہ مطلوبہ مقام تک پہنچا تو اس کے قدم بے ساختہ مدھم ہوئے۔ وہ اپنی جگہ پر موجود تھی! میرون رنگ کی شال اوڑھے، سر جھکائے گود میں رکھی ڈائری میں رک رک کر کچھ لکھ رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں، جب بھی شام کے دہلیز پر اس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تو ایسے ہی رنگ میں دیکھا جیسے یہ دونوں چیزیں اس کے موجود کا حصہ ہوں۔ یعنی ڈائری اور تنہائی۔ !شام ڈھلنے سے کچھ پہلے وہ اسی خاموشی سے اٹھی اور ہمیشہ کی طرح اپنی تنہائی کے ساتھ چلتی کسی راستے پر گم ہوگئی۔ اس نے گہری سانس لی اور گھر جانے والے راستے کی طرف مڑ گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ کیپٹن داؤد شجاع کوئی نظر باز قسم کا لڑکا تھا مگر پچھلے پندرہ دنوں سے وہ لڑکی کو سب سے الگ تھلگ دیکھ کر لاشعوری طور پر متوجہ ہوا اور پھر شعوری طور پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ داؤد کو یاد تھا جب پہلی بار اس کی بے ارادہ نگاہ، اس لڑکی پر پڑی تو وہ چونک گیا تھا کیونکہ اردگرد سے یکسر بے نیاز وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ داؤد حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ پارک میں بیٹھی کیوں رو رہی ہے؟ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا کہ جن کے لیے گھر جائے پناہ نہیں بنتے، وہ اسی طرح پارک کے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر اپنا دکھ بہاتے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی اس کا دل انجان لڑکی کے دکھ سے بوجھل ہوگیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ ایسا ہی احساس ہوگیا تھا۔

دیکھ میری الجھنوں کو روشنی کی آنکھ سے
گہرے نیلے پانیوں میں ڈوبتا سایہ ہوں میں!!

اگلے دن بھی وہ ملگجے حلیے میں گم صم سی بیٹھی ملی۔ اس کی گود میں ڈائری پڑی ہوئی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز تھی۔ اسے دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا کہ جیسے کسی شدید تکلیف کا شکار ہے۔ ایک ہفتے اس حالت میں رہنے کے بعد، وہ کچھ نارمل نظر آئی۔ اس دن پہلی بار داؤد نے اسے گود میں رکھی ڈائری میں کچھ لکھتے دیکھا۔ آنے والے دنوں میں وہ مزید بہتر لگتی مگر بہت خاموش اور گم صم۔! کبھی کبھی داؤد کو لگتا کہ وہ ایک انجان لڑکی کے پراسرار طلسم کا شکار ہوگیا ہے۔ یہ اس کے لیے بہت حیران کن امر تھا کیونکہ اس کے سرکل میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور طرح دار لڑکی موجود تھی۔

پچھلے کچھ عرصے سے جس طرح گھر والے اس کے لیے رشتے دیکھ رہے تھے، اس سے اندازہ ہوتا کہ دیر صرف اس کی مرضی کی ہے جو ابھی کسی کے لیے حامی نہیں بھر رہا تھا۔ شام ڈھلے وہ گھر آیا تو رفعت جہاں لان میں بیٹھی مل گئیں۔ داؤد کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نانو جان! آپ اکیلی یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ باقی سب کہاں ہیں؟'' اس نے گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہاری مامی (افشاں) اور بھابھی (علینہ) دونوں بچوں کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔ ابھی آتی ہو گی۔'' رفعت جہاں نے مسکرا کر کہا تو وہ سر ہلاتا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''علینہ بھابھی اور گڑیا نے جیسے ہی سنا کہ میری پوسٹنگ یہاں ہوگئی ہے۔ دونوں مجھ سے پہلے یہاں آنے کے لیے تیار ہوگئیں۔ میں نے مما سے بھی کہا تھا کہ ساتھ چلیں۔ آپ سب سے مل لیں گی مگر وہ ڈیڈ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں حالانکہ ڈیڈ تو اکیلے

ہی رہتے ہیں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے داؤد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ رفعت جہاں کچھ دیر خاموش رہیں۔

"ہوں! آج صبا کا فون آیا تھا۔" رفعت جہاں نے تمہید باندھی۔ وہ سمجھ کر مسکرانے لگا۔

"پھر کوئی لڑکی انہیں پسند آ گئی ہو گی۔" داؤد نے کہا تو وہ ہنس پڑیں۔

"تم سے پانچ سال بڑے ذیشان کی شادی کو آٹھ سال گزر گئے ہیں مگر تم شادی کے لیے مانتے ہی نہیں ہو۔ آخر کیوں؟" انہوں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی جیسے داؤد اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سمجھ کر سر ہلانے لگیں۔

"ضروری نہیں کہ جو تم محسوس کرو، وہ ہمیشہ درست بھی ہو۔ اپنے بھائی ذیشان کو دیکھو۔ علینہ کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے ماموں اور مامی کو دیکھو۔ ان کی زندگی ایک اچھے ہمسفر کی وجہ سے کتنی مکمل ہے۔ تم کیوں بلاوجہ شادی سے خوف زدہ ہو۔"

انہوں نے نرمی سے کہا تو وہ تلخی سے مسکرا دیا۔

"اور اگر ہمسفر اچھا نہ ملے تو نانو! آپ نے بارڈر پر کھڑے، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے کسی فوجی کو دیکھا ہے؟ جو دشمن کی گولی سے کبھی خوف نہیں کھاتا۔ جواں مردی سے لڑتا، اپنے کشادہ سینے پر بہادری کے کئی میڈل سجاتا ہے۔ پھر قسمت کا پہیہ گھومتا ہے اور وہ شخص اس آزمائش کی گھڑی میں، کسی بہت اپنے کی بے رخی کی ضرب سے ٹوٹ کر رو پڑے تو! اس اذیت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد تھا۔ بے بسی تھی۔

"مگر داؤد۔۔۔!" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

"نانو! چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں کہ آپ کی باغبانی کیسی جا رہی ہے۔ کل آپ کے ساتھ بیک یارڈ میں چل کر دیکھوں گا کہ میری نانو جان کے پودے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے گہری نگاہوں سے اپنے دراز قد، وجیہہ نواسے کی طرف دیکھا۔

"ہاں ضرور! مگر والدین اور باغبان اپنی اولاد کو ہرا بھرا، پھلتے پھولتے دیکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں؟" وہ سنجیدہ تھیں۔ "ضیغم کچھ عرصے میں بیوی بچوں کے ساتھ مجھے بھی لندن بلا لے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ یہاں سے جانے سے پہلے تمہاری خوشی دیکھ لوں۔"

داؤد نے غور سے اپنی فٹ اور اسمارٹ نانو کی طرف دیکھا وہ بچپن سے ان کے بہت قریب تھا۔ اس لیے ان کی بات ٹالتے ہوئے اسے تکلیف ہوتی تھی۔ ابھی بھی ایسی ہی تکلیف سے گزرتے ہوئے، شام جیسی اداس لڑکی کا خیال آیا تو وہ ٹھٹک گیا۔

"مجھے تھوڑا وقت دیں۔ شاید اس بار فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے۔" سادہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوئی اور فوراً گم ہو گئی۔

داؤد وہاں سے چلا گیا مگر رفعت جہاں کو سوچوں میں الجھا گیا۔ وہ کافی دیر ملول دل کے ساتھ ماضی کے گزرے لمحات یاد کرتی رہیں۔

ان کے دو ہی بچے تھے۔ صبا اور ضیغم۔ دونوں میں آٹھ سال کا فرق تھا۔ صبا بڑی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے ضدی مزاج کی تھی جبکہ ضیغم ماں کی طرح نرم دل اور تحمل مزاج تھا۔ ضیغم کو ہمسفر بھی ہم مزاج ملا۔ افشاں اور ضیغم اپنے دو بچوں کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ صبا کے دو بیٹے تھے۔ داؤد جس نے باپ کی طرح آرمی کو چنا تھا جبکہ ذیشان ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا تھا۔ ذیشان نے اپنی کلاس فیلو علینہ سے دھواں دار محبت کے بعد شادی کی تھی۔ صبا لاہور میں رہائش پذیر تھی جبکہ رفعت جہاں نے اپنے مرحوم شوہر کی آبائی زمین پر گھر بنانا پسند کیا، جو اسلام آباد کے قریب بنی نئی آبادی تھی، بہت خوب صورت اور شاندار جگہ تھی۔ ابھی یہاں زیادہ گھر نہیں بنے تھے مگر زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔ داؤد جس کی زندہ دلی اور قہقہوں سے بھی زندگی گونجتی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے بہت

خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی خاموشی انہیں تکلیف پہنچاتی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور سفید شال کو اپنے گرد لپٹتے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

سخت مٹی کو اپنی محنت اور ہمت سے نرم بنا کر بیج بوتے ہوئے اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ لہراتی، سرسبز فصل اور سبزیوں سے بھری کیاریاں اتنا سکون اور اطمینان عطا کریں گی۔ یہ اس کی محنت کا اور یقین کا پہلا مرحلہ تھا۔ ابھی آگے کا سفر طے کرنا تھا۔ پہلا پڑاؤ توقع کے برخلاف بہت شاندار ثابت ہوا مگر اس پڑاؤ تک آنے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اگر پہلے اپنے نصیب کے لکھے کے آگے سر جھکا دیتا تو شاید آج اس کے حاصل میں پچھتاوے کی چھوٹی چھوٹی باریک کنکریاں شامل نہ ہوتیں مگر وقت سے پہلے وہ کیسے جان سکتا تھا کہ تقدیر نے کہاں آ کر سر جھکانا تھا؟

اس نے تاحد نگاہ پھیلے اپنے رقبے پر نگاہ ڈالی جب کندھے پر کالی چادر پہنے اور دائیں طرف کے کندھے سے بندوق لٹکائے پچاس سالہ گل شیر پاس آیا۔

''چھوٹے مالک! زلفی صاحب کے آدمی بہت تنگ کرنے لگے ہیں۔ اکثر کھیتوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی پانی بند کر دیتے ہیں، کبھی اپنے جانور فصل خراب کرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ علاقے کے تھانے میں شکایت درج کروا دیں تو بہتر ہوگا۔ ایسے لوگوں کا کیا پتا، کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' گل شیر نے فکرمندی سے کہا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''سب سے بڑا نقصان تو پانچ سال پہلے پہنچا چکے ہیں۔ یہ تو بہت معمولی باتیں ہیں۔''

عبدالہادی نے سنجیدگی سے کہا تو گل شیر نے سمجھ کر سر ہلایا۔ وہ ان کا بہت پرانا اور قابل اعتبار ملازم تھا۔

''آپ بالکل بڑے مالک کی طرح سوچتے ہیں۔ وہ بھی دشمنوں کے لیے بہت ظرف رکھتے تھے۔'' گل شیر نے اداسی سے کہا۔

''کاش! میں ان کی طرح ہوتا تو یہ نوبت نہیں آتی مگر۔'' اس کا پچھتاوا پھر سے ڈنگ مارنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ گل شیر کوئی جواب دیتا، دوسرے ملازم نے وکیل کے آنے کی اطلاع دی تو وہ چونک کر سر ہلاتا، پرانی حویلی کی طرف چل پڑا۔ گل شیر مستعد انداز میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

☆☆☆

''بابا!'' زویا سارے گھر میں آوازیں دیتی ہوئی، انہیں ڈھونڈ رہی تھی جب سامنے سے کافی کا مگ لے کر آتی گل بی بی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''صاحب! اوپر والے کمرے میں ہیں۔ میں کافی دینے جا رہی ہوں۔ تمہیں کوئی کام تھا؟'' گل بی بی نے مصروف انداز میں پوچھا۔ وہ اچھل پڑی۔

''بابا اوپر والے کمرے میں؟؟ کافی میں انہیں دے آتی ہوں۔ آپ میرے لیے گرما گرم پکوڑے بنا دیں۔ ہری چٹنی کے ساتھ۔'' اس نے جلدی سے کہا اور گل بی بی کی بات سنے بغیر تیزی سے کافی کا مگ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر آ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے کچھ فاصلے سے تین کمروں کے دروازے دیکھے۔

''ہیں! میں تو سمجھی اوپر بس ایک ہی کمرا بنا ہوا ہے جہاں جانا سختی سے منع ہے مگر یہ تو بھول بھلیوں جیسا ہے۔''

وہ بڑبڑائی اور سوچتی ہوئی آگے بڑھی۔ ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ فوراً کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ سادہ سا کمرا اکثر گیسٹ روم کے لیے استعمال ہوتا۔ وہ درمیان والے کمرے کی طرف بڑھی اور زور سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ ایک جھٹکے سے اندر کی طرف گیا۔ کافی کا مگ چھلکا۔ آدھی کافی نے سفید اور

براؤن رنگ کے خوب صورت اور نفیس رگ پر نقش و نگار بنا دیے تھے۔ اس نے گھبرا کر پہلے قالین کے ٹکڑے کو اور پھر سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو راکنگ چیئر پر جھول کر کتاب پڑھتے وہ ایک دم سے رکے۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔

''بابا! میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ کافی بھی لائی ہوں۔ تھوڑی سی گر گئی ہے مگر تھوڑی تو باقی ہے۔ آپ ابھی تھوڑی سی پی لیں باقی تھوڑی بعد میں پی لینااور۔!'' اس نے اتنی بار تھوڑی کی گردان کی کہ ان کا دل کیا اپنا سر پیٹ لے لیں۔

''برائے مہربانی تم تھوڑی دیر چپ کرو گی؟''

انہوں نے گھور کر پوچھا تو وہ فوراً خاموش ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ زویا نے انہیں گھنٹی بجاتے دیکھا۔ کچھ لمحوں کے بعد گل بی بی جلدی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلی نگاہ قالین پر پڑی تو وہ تڑپ اٹھیں۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' گل بی بی نے حیرانی سے پوچھا۔

''اسے یہاں سے لے جائیں اور نئی کافی بنا کر بھیج دیں۔'' سنجیدہ آواز میں نیا حکم آیا تو گل بی بی نے جلدی سے جھک کر غالیچہ اٹھایا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''کچھ کہنا ہے؟'' سنجیدہ آواز پر زویا چونکی اور نفی میں سر ہلا کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟'' نرم آواز میں سوال کیا گیا۔

وہ مڑی اور چند لمحے ان کے چہرے کو دیکھتی رہی جس پر بہت نرم تاثر تھا۔ زویا کے لیے اتنی شہہ کافی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ان کے سامنے کچھ فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بابا! کالج تو ویسا ہی ہے جیسا ایسی جگہوں پر ہو سکتا تھا یعنی اتنی بڑی عمارت مگر نظم و ضبط بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ اس دن کیا ہوا؟ ڈرائیور نے جب کالج چھوڑا تو۔!'' زویا اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

''ڈرائیور تو چھٹی پر ہے۔'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہ جو کل پہلے دن مجھے پک کرنے آئے تھے۔ کیا نام تھا بھلا۔ ہاں ڈرائیور عبدالہادی۔ جب میں گاڑی سے نیچے اتری تو میں نے سمجھداری سے انہیں پک اینڈ ڈراپ سروس دینے پر راضی کر لیا۔ سوچا پہلی آتے ہی تنخواہ ملنے پر پیسے دے دوں گی مگر وہ تو دوبارہ نظر ہی نہیں آئے۔ یہاں سے کالج بالکل الگ سمت میں ہے اور ہر روز ٹیکسی سے جانا میں افورڈ نہیں کر سکتی۔'' اس نے ایک سانس میں بات مکمل کی۔

''عبدالہادی ڈرائیور نہیں ہے۔ اسی لائن میں تھوڑا آگے اس کی خالہ کا گھر ہے۔ اکثر ان سے ملنے آتا رہتا ہے۔ اس کا گھر تمہارے کالج کے پاس والے گاؤں میں ہے۔ اسی لیے میرے کہنے پر تمہیں ڈراپ کر دیا تھا۔'' ٹھنڈے لہجے میں بات مکمل کی گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔ اپنی جلد بازی کا احساس ہمیشہ بعد میں ہوتا۔

''میں اپنا فون کمرے میں بھول آئی ہوں۔ ابھی آتی ہوں۔''

اس نے بوکھلاہٹ میں کہا اور کچھ سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔ زویا شاید دنیا میں واحد تھی جس کی وجہ سے وہ بلاوجہ بھی مسکرانے لگے تھے۔

کمرے سے تیز رفتاری سے نکلتی زویا بے خیالی میں مخالف سمت میں چلی گئی جب کونے والے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی۔ جب اسے لگا جیسے وہ ماضی کے کسی لمحے میں پہنچ گئی ہے۔ اسے دیواریں، دیواروں پر لگی آویزے، پینٹنگز، فرش کا ڈیزائن سب دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔

''یہ حصہ پرانا ہے جبکہ سامنے والا حصہ نیا بنا ہے۔'' اس نے غور سے آس پاس دیکھتے ہوئے خود

کلامی کی تھی۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ اس نے نیم اندھیرے میں ڈوبی راہداری میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے جیسے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ایک دم رک گئی۔ اس نے دس سال کی بچی اور ایک خوب صورت ہنستی مسکراتی لڑکی کو اس بند دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ دونوں سائے ایک دوسرے سے باتیں کرتے آگے بڑھے اور بند دروازے سے اندر چلے گئے۔ دروازے میں غائب ہونے سے پہلے بچی نے مسکراتے ہوئے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا۔ وہ بچی زویا تھی اور ساتھ اس کی ماں۔!

''زویا بیٹی! کہاں گم ہو؟'' گل بی بی نے پاس آتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے بے اختیار بند کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''چلو بیٹی! یہاں آسیب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آجاؤ شاباش۔!''

گل بی بی نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئی وہاں سے لے جانے لگیں۔ زویا نے راہداری مڑنے سے پہلے ایک بار پھر پلٹ کر کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اس بار میرون شال اوڑھے ایک لڑکی اپنی ڈائری پکڑے کمرے کے اندر جا رہی تھی۔ زویا بے چین ہوئی کیونکہ وہ اس میرون شال والی مہربان دل پری کو بھی جانتی تھی۔ اپنے کمرے میں آکر بھی وہ گم صم رہی۔ اس گھر کے کسی پراسرار کونے سے اس کے بچپن کا بھی کوئی تعلق تھا۔ وہ بے چین ہو کر سوچنے لگی کہ کیسے اپنے بچپن کے ان لمحوں کے بارے میں جانے، جو اس کے لاشعور میں موجود تھے۔

''صرف بابا ہی اس راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی اس جگہ سب سے لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھے۔''

پہلی بار اسے اپنے چاچو کے سب سے دور رہنے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

''میرب بی بی! مالکن گھر پہ نہیں ہیں؟ کھانے میں کیا بناؤں؟'' بلقیس نے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی میرب کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر اپنے خیالوں کی دنیا سے واپس آئی۔

''آں! کچھ بھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''میرے بیٹے علی کی طبیعت کل سے بہت خراب ہے۔ اسے ڈاکٹر کو بھی دکھانا اس لیے سب کام جلدی ختم کر رہی ہوں۔'' بلقیس نے فکرمندی سے اپنے بارہ سالہ بیٹے کا ذکر کیا۔

''علی بیمار ہے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ذہن میں نہیں رہا۔ اچھا میں کام ختم کرلوں۔'' بلقیس کہتے ہوئے واپس جانے لگی۔

''ایک منٹ! آپ ایسا کریں کہ گھر چلی جائیں۔ مما اور ڈیڈ کسی پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔ وہ دیر سے آئیں گے۔ مہک اور حسن بھی گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بلقیس اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ اسی گھر کے سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔

''مگر بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ آپ کے لیے کھانا۔!'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میرے کمرے سے بیگ لے کر آئیں۔'' میرب نے سنجیدگی سے کہا تو بلقیس سر ہلا کر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد آئی تو میرب کا شولڈر بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ کچھ پیسے رکھ لیں۔ کل میں علی کو دیکھنے آؤں گی۔'' سدا کی حساس اور نرم دل میرب نے نرمی سے کہا۔ میرب اکثر علی کی پڑھائی میں مدد کرتی تھی۔ بلقیس احسان مندی سے شکریہ کہہ کر چلی گئی۔

اس نے سر اٹھا کر خوب صورت اور نفاست سے سجے وسیع لاؤنج کو دیکھا جہاں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ میرب کے ذہن پر بے اختیار اپنے ماضی کا وہ گھر آیا جو اس گھر کی طرح عالیشان تو نہیں تھا مگر اس گھر میں رہنے والے مکین ایک دوسرے کی محبت

میں گندھے ہوئے تھے۔ جہاں چھوٹی چھوٹی خوشیاں سکون، خلوص تھا۔ میرب کو لگا جیسے وہ پھر سے یاسیت کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ فوراً سنبھلی۔

''نہیں، مجھے خود کو مصروف رکھنا ہے۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا تھا کہ!''

اس نے خود کو ٹوکا اور پھر سامنے دیوار پر لگی اسکرین کی آواز اونچی کر دی۔ سارا گھر شور سے گونج اٹھا۔ میرب نے مطمئن ہو کر کانوں میں روئی ٹھونسی اور سامنے میز پر رکھی کتاب اٹھالی۔ صوفے پر نیم دراز وہ کتاب کے بھاگتے لفظوں پر اپنی بکھری توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

''میں جانتی ہوں کہ مسلسل پڑھنے سے دل اکتا جاتے ہیں۔ اس لیے آج کا سارا دن ہم فطرت کو قریب سے دیکھنے اور جانچنے میں گزاریں گے۔ غیر نصابی سرگرمیاں، زرخیز ذہنوں کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں اور!''

زویا سفید جاگزر پہنے، پتھریلے راستوں پر اعتماد سے چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایف۔ اے فائنل ائیر میں تقریباً بیس لڑکیاں زیر تعلیم تھیں جنہیں زویا آج، کلاس روم سے باہر لے آئی تھی۔ کالج کے گیٹ سے باہر نکل کر وہ ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھتی اپنی دھن میں بول رہی تھی، جب پیچھے چلتی بیزار لڑکی نے اپنی ساتھی کی طرف دیکھا۔

''یہ مس صاحبہ کتنا بور کر رہی ہیں۔ چلو گھر سے کچھ کھانے کو لے کر آتے ہیں۔'' لڑکی نے کچھ دور اپنا گھر دیکھا تو اسے بھوک ستانے لگی۔ دونوں پیچھے سے غائب ہو گئیں۔

''پتا نہیں اماں نے کپڑے دھوئے یا نہیں! دیکھ کر آتی ہوں۔'' ایک لڑکی کو ڈھیر لگے گندھے کپڑوں کی فکر لاحق ہوئی تو اس کا رخ بھی بدل گیا۔

آہستہ آہستہ کر کے سب لڑکیاں غائب ہو گئیں۔ زویا بات کرتے جیسے ہی پلٹی پیچھے اکیلی کھڑی ثمرہ کو دیکھ کر چونک گئی۔ ثمرہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مس! سب اپنے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔''

ثمرہ نے ہنستے ہوئے بتایا تو زویا پریشان ہو گئی۔ اسی وقت پگڈنڈی پر سامنے سے چلتا ہوا عبدالہادی آیا اور انہیں وہاں دیکھ کر چونک گیا۔

''گڑیا! سب خیریت ہے؟'' عبدالہادی نے حیرانی سے سوال کیا تو زویا فوراً اس کی طرف پلٹی۔

''دیکھیں، ایک بار آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ میرے نام رکھیں۔ میں گڑیا نہیں ہوں اور آئندہ۔!''

اسی وقت ثمرہ گلا کھنکار کر آگے بڑھی۔

''بھائی مجھے پیار سے گڑیا کہتے ہیں۔'' ثمرہ نے مسکرا کر کہا تو زویا ٹپٹا گئی۔ جبکہ سامنے والا بھی ہنسی ضبط کرتا اونچی فصلوں میں نظر دوڑانے لگا۔

''دراصل بھائی! مس ہمیں لے کر!''

ثمرہ نے تفصیل بتانا شروع کی۔ زویا منہ بنا کر فصل کے قریب ہو کر غور سے دیکھنے لگی۔ اسی وقت گھنی فصل میں سے قد آور کتا بھونکتا ہوا باہر نکلا۔ زویا ڈر کر پیچھے ہوئی۔ کتا بھاگتا ہوا ثمرہ کی طرف بڑھا۔

''ٹائیگر! میرا یونیفارم گندا ہو جائے گا۔ دور رہو۔'' ثمرہ نے منہ بنا کر کہا تو کتا ایک دم رک گیا اور پھر عبدالہادی کی طرف بڑھ گیا۔

''کتنا فرمانبردار کتا ہے۔'' زویا نے متاثر انداز میں کہا تو کتا اس کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہوئی۔

''تعریف پسند نہیں ہے تو شکریے کے ساتھ واپس کر دو۔ بھونکنے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی واپس مڑی۔ ثمرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ابھی تھوڑا دور گئیں جب باقی لڑکیاں بھی کونوں سے نکل کر آ گئیں۔ زویا نے انہیں گھورا جیسے ہی وہ کالج کے گیٹ کے پاس پہنچی، چوکیدار نے اپنے پیلے دانت نکالتے ہوئے اسے پرنسپل کے آفس میں جانے کا کہا۔ زویا گہری سانس لیتی پرنسپل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہاں سے سرزنش سن کر باہر نکلی تو اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

''اس ملک میں قابل استاد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' اس نے سب کی عقلوں پر افسوس کیا اور آئندہ ایسی ایکٹویٹی کرنے سے توبہ کرلی۔

ثمرہ نے گھر آ کر ہنستے ہوئے ساری تفصیل بڑے بھائی عبدالہادی کو سنائی تو وہ بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔

''حیرت ہے شہر کی لڑکیاں بھی اتنی سادہ مزاج کی ہوتی ہیں۔'' عبدالہادی نے تبصرہ کیا جس کا جواب ثمرہ کے پاس تو نہیں تھا مگر زویا کے ماضی کے پرانے صندوق میں، یاد کے سفید رومال میں، محرومی کے عرق سے مہکتے کسی بے رحم لمحے میں لکھا ہوا تھا۔

اس طرح جیسے چھپالوں گا خموشی روح کی
دوستوں کے سامنے یوں بولتا رہتا ہوں!!

☆☆☆

رفعت جہاں نے اپنے گھر کی پچھلی طرف خالی زمین پر اپنی باغبانی کے بہت سے کمالات دکھائے تھے۔ رفعت جہاں اور میرب کی پہلی ملاقات یہاں ہی ہوئی تھی۔ میرب کے گھر کا پچھلے حصے میں لوہے کا ایک دروازہ تھا جسے کھول کر وہ خالی میدان میں آ جاتی۔ یہاں تنہائی میں بیٹھی کچھ سوچتی رہتی یا اکثر انہیں کام کرتا دیکھتی جنہوں نے اپنی محنت اور لگن سے اس ویران حصے پر باغبانی کر کے آباد کر لیا تھا۔ رفعت جہاں کو گم صم رہنے والی میرب نے پہلی نظر میں متاثر کیا۔ میرب کی الجھی شخصیت اور آنکھوں کی اداسی اس کے اندر کے سب راز کھول دیتی تھی۔ ان کی اپنی نرم طبیعت اور دوستانہ فطرت کی وجہ سے بہت جلد میرب سے دوستی ہوگئی کہ میرب کی شام کا ایک حصہ ان کے ساتھ گزرنے لگا۔ یہ تب کی بات ہے جب داؤد کی پوسٹنگ وہاں نہیں ہوئی تھی۔

رفعت جہاں کی وجہ سے میرب کی سلام دعا افشاں سے بھی ہوئی اور اس کے دونوں بچوں سے بھی اچھی دوستی ہوگئی۔ میرب، رفعت جہاں کو نانو ہی کہتی تھی۔ ان کے ساتھ باغبانی کرتے، کبھی بیکنگ یا کوکنگ کرتے میرب نے اپنی ماضی کے درد سے لڑنا سیکھ لیا تھا۔ وہ کتنی تنہا اور اداس تھی اس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا مگر رفعت جہاں کے لیے میرب کی اداسی کی وجہ بہت حیران کن تھی۔ میرب اپنی زبان سے بھی اپنے درد کو بیان نہیں کرتی مگر ان کی تیز نگاہوں نے میرب کی شخصیت کے بگاڑ کو بہت جلد جان لیا۔

پہلی بار ان کی ملاقات ایک محفل میں میرب کے والدین اور بہن بھائی سے ہوئی تھی۔ سارہ سے مل کر وہ بہت حیران ہوئی۔ حسین و جمیل سارہ مشہور سماجی شخصیت تھی جو ایک این جی او کی مالک تھیں۔ سارہ کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مناسب نین نقش کی مالک میرب ان کی بیٹی ہے جبکہ میرب سے چھوٹی مہک سارہ کی ڈیٹو کاپی تھی۔ حسن بھی وجاہت میں باپ پر گیا تھا۔ محفل میں سارہ فخریہ انداز میں مہک اور حسن کے بارے میں بات کر رہی تھی مگر جہاں میرب کا ذکر آتا نہ چاہتے ہوئے بھی سارہ، اپنی مرحومہ ساس کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکی کیونکہ میرب اپنی دادی کا پرتو تھی۔ دیکھنے میں بھی اور مزاج میں بھی۔ رفعت جہاں میرب کی تنہائی اور اداسی کی وجہ سمجھ گئیں۔ اس دن کے بعد سے وہ میرب پر خصوصی توجہ دیتیں جو اپنوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی بیگانی تھی۔

☆☆☆

''مگر پاپا! یہ کیسے ممکن ہے؟'' زویا نے آنکھوں میں پھیلتی نمی کو پیتے ہوئے بے چین لہجے میں سوال کیا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں موجود تھی۔ ''میں آپ لوگوں کے بغیر مستقل یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ جلد میرا ٹرانسفر آپ کے شہر ہو جائے......'' اس نے بے تابی سے کہا مگر باپ کی بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔ ''کیا آپ کی بابا سے بات ہوگئی ہے؟ وہ بھی چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس رہوں......'' اس نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں یہاں صرف جاب کی وجہ سے آئی ہوں۔ بابا اکیلے رہتے ہیں تو میں کیا کروں؟ میرا۔'' وہ ایک دم رکی۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی

موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹی تو سپاٹ چہرے کے ساتھ انہیں کھڑا دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''و......وہ......وہ میں......!''

وہ ہکلائی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ یہ دیکھے بغیر کے کسی کے وجود میں زلزلے نے کیسی تباہی مچادی تھی۔

''بابا اکیلے رہتے ہیں تو میں کیا کروں؟'' زویا کی بیزار آواز ان کے کانوں میں گونجی۔

''جب محبت نے مجھے تنہا کردیا تو کسی اور کی کیا بساط ہے۔'' ایک تلخ مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیلی۔

وہ ماضی کے کسی لمحے میں پہنچ گئے۔ جہاں کبھی ان کی زندگی، سانس لیتی تھی۔

☆☆☆

''گڑیا دیکھ کر۔''

داؤد نے تیزی سے بھاگتی سات سالہ بچی کے پیچھے بھاگتے ہوئے آواز لگائی۔ جب اچانک وہ لڑکھڑائی۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتی، میرب نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ بچی ڈر کر رونے لگی۔ میرب نرم لہجے میں اسے بہلانے لگی۔ داؤد پاس آ کر رک گیا اور خاموشی سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

''میرب آپی!'' اچانک دس سالہ فیضان نے پاس آ کر پکارا۔ فیضان حکیم کا دوسرے نمبر والا بیٹا تھا۔ فیضان سے دو سال بڑا دانیال تھا۔

''فیضان! تم اسے جانتے ہو؟'' میرب نے حیرانی سے سوال کیا تو فیضان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ذیشان بھائی کی بیٹی ہے۔'' فیضان نے معصومیت سے کہا۔ میرب بے ساختہ مسکرائی۔ گڑیا کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

''اور یہ ذیشان بھائی کون ہیں؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میرے بڑے بھائی!'' کئی سالوں کے بعد داؤد کے اندر پرانا والا شرارتی لڑکا انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔

''آپ!'' میرب اپنے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔

''یہ ہمارے داؤد بھائی ہیں......'' فیضان نے جلدی سے تعارف کروایا۔ ''صبا پھوپھو کے بیٹے۔!''

فیضان نے جلدی سے کہا تو داؤد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''اب تمہاری میرب آپی پوچھیں گی کہ صبا پھوپھو کون ہیں؟''

داؤد نے شرارتی لہجے میں کہا مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

''رفعت نانو کی بیٹی۔'' میرب نے مدھم لہجے میں کہا اور رخ پلٹ لیا مگر داؤد اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی۔

''میں نانو کا نواسا ہوں۔ کیپٹن داؤد! ان دنوں آپ کے شہر میں تعینات ہوں اور۔''

داؤد کی بات پوری سنے بغیر وہ پلٹ کر جانے لگی۔

''میرب آپی کسی سے بات نہیں کرتی ہیں۔'' فیضان نے داؤد کے علم میں اضافہ کیا۔ داؤد نے حیرانی سے کچھ دور جاتی میرب کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔

''معذرت اگر آپ کو میری بات بری لگی۔''

داؤد کی سنجیدہ آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

اس وقت گڑیا آگے بڑھی اور میرب کی انگلی تھام لی۔ میرب مسکرائی اور گڑیا سے باتیں کرتے ہوئے آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے فیضان اور داؤد بھی تھے۔ وہ چاروں ایک ساتھ گھر پہنچے۔ میرب اپنے گھر کی طرف بڑھی۔ داؤد کے اشارے پر دونوں بچے اندر بھاگ گئے۔ میرب جب تک اپنے گھر کے اندر نہیں گئی، وہ کھڑا رہا۔ میرب کی نگاہ سرسری پلٹی اور وہ ٹھٹک گئی۔ داؤد سنجیدگی سے کھڑا اس

کے گیٹ کے اندر جانے کا منتظر تھا۔ میرب کو تحفظ کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ وہ بھی اہم ہیں۔ کوئی اسے اہمیت دے سکتا ہے۔ داؤد کے بظاہر چھوٹے فکر انگیز عمل نے اس کی کمزور شخصیت کو بے ارادہ ہی سہارا دیا۔ جو آنے والے دنوں میں ہر روز شام کو پارک میں ملنے کا بہانہ بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی آمد کے شدت سے منتظر رہتے مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنے جذبات کو چھپا رہے تھے۔

☆☆☆

"کب تک آپ خود سے لڑتے رہیں گے؟" ثمرہ نے کتابوں میں کھوئے بھائی کو چائے کا کپ پیش کرتے ہوئے کہا۔ عبدالہادی نے چونک کر بہن کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

"میرا پڑھنا، تمہیں لڑنا لگ رہا ہے؟" اس نے مسکرا کر ٹالا۔ ثمرہ نے گہری سانس لی۔

"اپنی خواہش کو زمین کی خاطر قربان کرنا آسان نہیں ہوتا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ اپنی زمین کی خاطر پہلی بار کھڑا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ زمین خود ہی طاقت بن جاتی ہے۔ بے فکر رہو۔ تمہارا بھائی کمزور نہیں ہے۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"آپ نے اپنی من پسند زندگی صرف میری وجہ سے چھوڑی ہے نا!" ثمرہ کے چہرے پر اداسی کے گہرے بادل چھا گئے۔

"ایسا نہیں ہے گڑیا! مجھے واپس آنا ہی تھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔" اس نے یقین سے کہا۔

ثمرہ نے گہری سانس لی اور سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد عبدالہادی نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ اسے آج اپنے مرحوم والدین شدت سے یاد آئے جو اس زمین کی خاطر قتل کر دیے گئے تھے۔ وہ بیٹا تھا، کیسے اپنے والدین کا قرض چکائے واپس نہیں آتا۔

اس کی لہو رنگ آنکھوں میں ضبط کی نمی پھیل رہی تھی مگر وہ سر جھٹک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر کچھ دیر مزید وہ اپنے والدین کے بارے میں سوچتا تو شاید خود سے کیا عہد ٹوٹ جاتا اور اس کے ہاتھ بھی خون سے رنگے جاتے۔ جو وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"میری ضد اور نادانی کی وجہ سے، دشمنوں کو موقع مل گیا وار کرنے کا مگر میں نے خود سے عہد کیا ہے کہ آخری سانس تک اپنی بہن اور اس زمین کی حفاظت کروں گا۔" اس نے پانچ سالوں میں ہر روز اس عہد کو دہرایا تھا تاکہ اس بار کوئی بھول کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ بنے۔

☆☆☆

"میں کافی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔" زویا کافی کا مگ تھام کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں نے کافی تو نہیں مانگی؟" ان کے چہرے پر واضح ناراضی تھی۔

زویا نے ایک نظر ان کے پھولے چہرے پر ڈالی اور بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ان کے چہرے پر حیرانی در آئی۔

"چھوٹے بچے بھی اکثر اسی طرح منہ پھلا کر ناراض ہو جاتے ہیں جیسے کہ آپ۔!" زویا کی بات منہ میں رہ گئی۔ سامنے والے کی گھوری واضح تھی۔

"کافی میز پر رکھ دو۔" سنجیدہ لہجے میں حکم دیا گیا۔

اس نے سعادت مندی سے بات مانی اور کافی رکھ کر پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر جھکے کچھ لکھتے ہوئے وہ چونک گئے۔

"اب کیا یاد آ گیا ہے؟" گہری سانس لے کر سوال کیا گیا۔

"میں کل شام والی بات کے لیے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔ پاپا کا خیال ہے کہ مجھے اب واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کی دوسری بیوی اور دو بچوں کو میری ضرورت نہیں۔ اس لیے وہ

چاہتے ہیں کہ میں اب آپ کے پاس رہوں۔" زویا نے نم آنکھوں کے ساتھ سچ کہا تو کتنی دیر وہ کچھ بول ہی نہیں سکے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تو وہ اداسی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ ایسی اداسی سے کسی کی یاد کا چہرہ بنتا تھا۔

"اداسی تمہارے لیے نہیں بنی۔ ہنستی رہا کرو۔" نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے انہوں نے نگاہیں کاغذ پر مرکوز کر دیں۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ اپنے اصل سے دور ہو کر ہم ادھورے رہ جاتے ہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔

"اور تم بھی نہیں سمجھو گی کہ دو ادھورے لوگ ہی ایک دوسرے کی تکلیف کو سمجھ سکتے ہیں۔"

مدھم آواز میں کہا گیا جملہ اسے بے ساختہ پلٹنے پر مجبور کر گیا۔ وہ تیزی سے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ مجھے اپنی کہانی سنائیں گے؟" اس نے یقین سے کہا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"کون سی کہانی؟" انجان بن کر سوال کیا گیا۔

"وہ ہی جو پاپا سناتے ہیں، جو مما نے بتائی تھی یا جو زمانے والے کہتے ہیں کہ!" زویا لمحے بھر کو چپ ہوئی۔

"زمانے کی مت سننا۔ وہ کبھی بھی محبت کی سچی کہانی نہیں سناتا ہے۔" درد بھری مسکراہٹ میں کچھ کھو دینے کا عکس واضح تھا۔ زویا نے نفی میں سر ہلایا۔ انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"کہانی سن کر محبت کی راہ مت چن لینا۔" انہوں نے آزردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میز کی دراز سے ایک ڈائری نکالی۔

"آؤ تمہیں کہانی سناتا ہوں۔ تمہاری طرح ہی ادھوری رہ جانے والی ایک اداس لڑکی کی کہانی۔ جس کی محبت بھی اسے اداسی کی گپھا میں گم ہونے سے نہیں بچا سکی۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا اور ڈائری کا پہلا صفحہ کھولا۔

"یہ تب کی بات ہے جب۔!"

مدھم لہجے میں بولتے ہوئے وہ ماضی کی کتاب کا حصہ پڑھنے لگے جہاں بھی ان کا دل خوشی کی لے پر تھرکتا تھا۔

☆☆☆

"مہک! تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ پتا بھی ہے میں ان دنوں این جی او کے کام کی وجہ سے کتنی بزی رہتی ہوں اور تم ہو کہ ایک ہی بات کی ضد کر رہی ہو۔"

میرب سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں داخل ہوئی تو ناشتے کی میز پر حسب معمول سارہ اور مہک کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ حسن کی ساری توجہ اپنے ناشتے پر تھی۔ وہ پری انجینئرنگ کے دوسرے سال میں تھا جبکہ مہک بی۔ اے کر رہی تھی۔

"اف مما! آپ ہی نے تو کہا ہے کہ شہلا آنٹی کی بیٹی کی شادی میں پورے جوش و خروش سے شرکت کرنی ہے۔" مہک نے منہ بنا کر سارہ کی کزن کا نام لیا جس کی بیٹی کی شادی اگلے مہینے ہونی تھی۔

"شہلا میری کزن بھی ہے اور دوست بھی۔ اس کی بیٹی کی شادی، میرے لیے گھر کی بات ہی ہے۔ اس لیے ہماری شرکت بھرپور ہونی چاہیے۔" سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ تھوڑا وقت نکال کر میرے ساتھ شاپنگ پر چلیں۔" مہک نے ہمیشہ کی طرح ماں کی پسند کو اولین سمجھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے اس ویک اینڈ پر چلتے ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"بھئی، میرب سے بھی پوچھ لو بلکہ ایسا کرو کہ اسے بھی ساتھ لے جانا۔ میرب نے بھی شادی کی شاپنگ کرنی ہوگی۔" ہمایوں نے مسکرا کر ان کی توجہ خاموشی سے ناشتا کرتی میرب پر مبذول کروائی۔ مہک طنزیہ ہنس پڑی۔

"میرب کے پاس دادو کے بنائے بہت سے

شاندار جوڑے ہوں گے۔" مہک نے مذاق اڑایا۔
"بری بات!" ہمایوں نے گھورا۔ ان کی آنکھوں میں واضح تنبیہ تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں، وہ میرب کو لے کر بہت سنجیدہ ہو چکے تھے۔ مہک فوراً سنبھل گئی۔
"ڈیڈ! مہک ٹھیک کہہ رہی ہے میرے پاس بہت سارے ڈریس ہیں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔
"مگر تم میری پسند کے مطابق ڈریسنگ کرو گی۔ مجھے تمہارا بیک ورڈ انداز پسند نہیں۔ مانا کہ تمہاری شخصیت پر اماں جان کی مخصوص چھاپ ہے مگر تمہیں وقت کے ساتھ خود کو گروم کرنا چاہیے۔ مجھے اپنے سرکل میں تمہیں لے کر ہمیشہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیشہ کی طرح تلخ بول گئیں۔
ہمایوں نے لب بھینچ لیے۔ ان کی نگاہیں میرب کے چہرے پر گڑی تھیں جہاں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا جیسے یہ سب باتیں، اس کے بجائے کسی اور سے کہی گئی ہیں۔
"میرب ہر لحاظ سے پرفیکٹ اور گراونڈ ہے۔ اسے تمہارے سرکل میں متعارف ہونے کے لیے بودے سہاروں کی ضرورت نہیں ہے۔" ہمایوں نے ناگواری سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ سارہ نے سر جھٹکا اور وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر شوہر سے بات کرنے چلی گئیں۔
میرب خاموشی سے ناشتا کرتی رہی۔ اس کے اندر اٹھتے شور پر باہر کے سکوت کا پردہ تھا۔
"آپ ناشتا چھوڑ کر کیوں چلے آئے؟"
سارہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
ہمایوں نے ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔
"وجہ تم جانتی ہو۔" ان کا لہجہ سرد تھا۔
"میں کوشش کرتی ہوں مگر نا چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تھوڑا تلخ ہو جاتا ہے۔" سارہ نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔
"یہ جانتے ہوئے بھی کہ پہلے ہی ہم اس کے ساتھ بہت زیادتی کر چکے ہیں۔ وہ چند مہینے کی تھی جب ہم اسے اماں جی کے پاس چھوڑ کر، روشن مستقبل کے لیے باہر چلے گئے۔ کبھی کبھار فون پر ہونے والی گفتگو کے علاوہ، ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ پھر مہک اور حسن کی پیدائش نے اس کی جگہ لے لی۔ ہم پاکستان شفٹ ہوئے۔ زبردستی اماں جی سے بحث کر کے اپنے پاس لے آئے مگر۔" وہ کہتے ہوئے چپ ہو گئے۔ آگے کی کہانی درد ناک تھی۔ سارہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔
"ہماری بچی کے ساتھ پہلے ہی بہت برا ہو چکا ہے۔ پلیز اسے آزادی سے جینے دو۔" ان کے لہجے میں منت تھی۔ وہ لب کاٹ کر رہ گئیں۔
ہمایوں آفس چلے گئے مگر وہ ماضی کی بھول بھلیوں بھولیوں میں کھو گئیں۔ جہاں ان کی خوب صورت اور حسین جوانی کے خواب بہت اونچے تھے۔ ان کا روشن مستقبل سامنے تھا۔ سارہ نے کچھ سال تک بچوں کی ذمہ داری سے دور رہنے کا سوچا ہوا تھا مگر میرب نے آ کر ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ میرب کی آمد کا سن کر ہی سارہ نے رونا پیٹنا ڈال دیا کیونکہ کچھ مہینوں تک وہ ہمایوں کے ساتھ امریکا جا رہی تھیں۔ اپنا بزنس سیٹ کرنے۔ بچے کی ذمہ داری کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمایوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل پاتیں۔ اس لیے سارہ نے ابارشن کروانے کا سوچا مگر جب یہ بات ان کی ساس عصمت بیگم کو پتا چلی تو وہ فوراً شہر پہنچ گئیں۔ سارہ، ہمایوں اور ان کے درمیان لمبی بحث ہوئی۔ جس کا اختتام اس بات پر ہوا کہ بچے کو عصمت بیگم پالیں گی۔ سارہ ڈلیوری کے فوراً بعد، ہمایوں کے ساتھ امریکا چلی جائیں گی۔
میرب ان چاہا بچہ تھی۔ وہ پیدا ہوئی تو ماں یا باپ کی طرح حسن کی دولت سے مالا مال نہیں تھی۔

سارہ کے پہلو میں لیٹی سانولی سی بچی کو دیکھ کر سب حیران ہوئے۔ جو بھی نرس آتی، سارہ سے بچی کے بارے میں حیرت سے سوال ضرور کرتی۔

سارہ کے دل میں میرب کے حوالے سے ایک اور گرہ پڑ گئی۔ میرب کو عصمت بیگم کو سونپ کر وہ خوشی سے چلی گئیں۔ امریکا جا کر اپنی من پسند زندگی گزارتے ہوئے، انہیں کبھی میرب کا خیال نہیں آیا۔

مہک اور حسن جب ان کی گود میں آئے تو سارہ کا سر فخر سے تن گیا کیونکہ وہ خوب صورتی میں ان پر گئے تھے۔ انہیں ایسی ہی اولاد چاہیے تھی جو دنیا میں ان کا خوب صورت حوالہ بنے۔ وہ اس وقت نہیں جانتی تھیں کہ اولاد اپنی خوب صورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نیک عمل اور حساس دل کی وجہ سے دونوں جہاں میں خوب صورت حوالہ بنتی ہے۔

☆☆☆

"مجھے اپنے سب کام خود کرنے چاہئیں۔"

زویا نے ایک بار پھر خود سے کہا اور دھڑکتے دل کو سنبھالتی، دوبارہ سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس لیے آس پاس گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آج کل کالج سے چھٹیاں تھیں۔ اس لیے زویا کا زیادہ تر وقت بی بی گل کے ساتھ باتیں کرتے گزرتا یا نئے تجربات کرنے کا شوق پورا کرنے میں۔ اس دوران جب بھی اسے موقع ملتا وہ میرب کی ادھوری کہانی سننے پہنچ جاتی۔ میرب کی زندگی کی ڈائری کے ابھی کچھ ورق ہی اس کے سامنے آئے تھے۔

زویا جو پچھلے کچھ دنوں سے ڈرائیور انور کی زیر نگرانی گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی آج موقع ملتے ہی اکیلے گاڑی لے کر نکل پڑی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی اچانک بند ہوگئی۔ اس نے ہر طرح سے کوشش کی مگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔

"میری تو قسمت میں ہی سیدھا اور پرسکون راستہ نہیں ہے۔"

اس نے گہری سانس لی اور بے دلی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس نے مدد کے آس پاس دیکھا جب اس کی نگاہ ایک گھر کے دروازے سے باہر نکلتے شناسا چہروں پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں پکارتی، گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے عبدالہادی نے ہارن دے کر اسے متوجہ کیا۔ زویا نے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی کا تاثر سجایا جبکہ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ عبدالہادی نے گاڑی کے ہارن پر غصے سے ہاتھ رکھ دیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتی، اس کی گاڑی ہینڈ بریک نہ لگانے کی وجہ سے ڈھلوان سے سرکنے لگی۔ زویا نے بوکھلا کر دور جاتی گاڑی کو دیکھا اور بھاگ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔

"ارے گاڑی۔ رکوتو!"

زویا نے ایسے پکارا جیسے گاڑی اس کے حکم پر چلتی ہے۔ گاڑی سیدھا، عبدالہادی کی گاڑی سے جا ٹکرائی۔ شکر ہے کہ گاڑی کے سرکنے کی رفتار کم تھی اس لیے بچت ہوگئی۔ عبدالہادی غصے میں بڑبڑاتا باہر نکلا۔ تب تک ثمرہ اور ایک شفیق چہرے والی خاتون بھی پاس آگئی تھیں۔

"بیٹی! تم ٹھیک ہو؟ چوٹ تو نہیں لگی۔"

شفیق خاتون نے فکرمندی سے پوچھا تو وہ ایک دم چونکی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی در آئی جو سامنے کھڑے عبدالہادی کی زیرک نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہی۔ وہ جو غصے میں بھرا اسے بے نقط سنانے کا ارادہ رکھتا تھا ایک دم چپ ہوگیا کیونکہ سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی جسے اس نے فوراً چھپالیا۔

"زہرہ خالہ! یہ ہماری نئی ٹیچر ہیں۔" ثمرہ نے جلدی سے تعارف کروایا تو تو حیران رہ گئیں۔

"اتنی چھوٹی سی لڑکی اور کالج میں پڑھاتی ہے۔" زہرہ نے حیرانی سے کہا۔

"میری ما کہتی ہیں کہ میں عمر چور ہوں۔ ویسے اتنی چھوٹی نہیں ہوں۔ بس نازک اندام ہونے کی وجہ سے لگتی ہوں۔ پورے پچیس سال کی ہوں۔"

زویا نے فخریہ انداز میں بتایا تو زہرہ کے ساتھ ساتھ عبدالہادی بھی زیرِ لب مسکرا دیا۔ یہ لڑکی ایسی ہی تھی جب بھی سامنے آتی اس کی فطرت کی بے ساختگی نے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"عمر تو کم ہی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ نازک سی پیاری لڑکی بہت قابل ہے۔ اس لیے لیکچرار بنی۔" زہرہ خالہ نے پیار سے اس کا گال چھوا۔ زویا کی آنکھیں لبالب پانی سے بھر گئیں اور وہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گئی۔ زہرہ خالہ نے نرمی سے اس کا سر سہلایا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ الگ ہوئی اور مسکراتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔

"پتا نہیں کیا وجہ ہے اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔" زویا بڑبڑائی۔

"اس لیے کیونکہ آپ نے گاڑی کو چلنے کا حکم نہیں دیا ہو گا نا! جیسے رکنے کا کہہ رہی تھیں۔" عبدالہادی نے شرارت سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

زویا نے منہ بنا کر اسے دیکھا جبکہ زہرہ بہت دلچسپ نگاہوں سے لاڈلے بھانجے کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہونہہ!" زویا نے سر جھٹکا اور گاڑی میں بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔

"پہلے شرمندہ کروانا ضروری تھا۔" وہ بڑبڑائی۔ اور گاڑی کو موڑ کر واپس گھر لے گئی جو چند گھر چھوڑ کر تھا۔

"عجیب حواس باختہ استانی ہے ثمرہ کی۔" عبدالہادی نے گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔

"جی نہیں! بہت سادہ اور معصوم سی ہیں۔" ثمرہ نے فوراً تصحیح کی۔

"تم دونوں نے شاید غور نہیں کیا۔ نہ وہ سادہ ہے اور نہ حواس باختہ! وہ اگنور چائلڈ ہے۔ جیسے کسی انجان کے لہجے میں چھپی فکرمندی، محبت کا احساس بے ساختہ رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔" زہرہ خالہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

عبدالہادی کچھ دیر بول ہی نہیں سکا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے زویا کی نم آنکھیں اور زہرہ خالہ سے بے ساختہ لپٹنا یاد آیا۔

"ہم لوگ اندازے لگانے میں ہمیشہ جلدی کر دیتے ہیں نا!" اس نے اداسی سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"ایک عمر تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی ہوں۔ بچوں کی نفسیات کے کئی رنگ بخوبی پہچان لیتی ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" ثمرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہر انسان کے اندر کی دنیا، اس کی کہانی اتنی ہی دلچسپ اور بے یقین کر دینے والی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید انسانوں کی کشش بھی ختم ہو جائے۔ کھوج، تجسس، ہمدردی کا جو تعلق، کسی کو دریافت کرنے، ڈھونڈنے سے بنتا ہے وہ کسی زمانے میں ٹوٹتا نہیں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

عبدالہادی نے سمجھ کر سر ہلایا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ زویا کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے اس کی گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی، بالکل ایسے ہی جیسے دل نے ایک دھڑکن مس کی ہو۔ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، وہ بھی اسے کھوجنے کے سفر پر نکل چکا تھا۔

☆☆☆

"تم آج بھی سارہ کے ساتھ پارٹی پہ نہیں گئیں؟"

میرب کو گھر کے پچھلی طرف بنی خشک اور بنجر زمین پر باغبانی کا شوق پورا کرتے دیکھ کر رفعت جہاں نے مسکرا کر کہا۔ ساتھ ساتھ گھر ہونے کی وجہ سے وہ اور میرب روز ہی ملتے۔ اس لیے وہ اس کے معمولات سے واقف تھیں۔ اس وقت وہ بھی اپنے

گھر کے پچھلے طرف لگائی سبزیوں اور پودوں کو دیکھنے آئیں، جب ان کی نگاہ اداس چہرے والی میرب پر پڑی۔

"مجھے لوگوں کا ہجوم پسند نہیں ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔

"میرب! تمہاری عمر تو ایسی نہیں ہے خاموشی اور تنہائی سے کھیلنے والی۔ لوگوں سے ملا جلا کرو۔ اپنے ماضی کو بھول کر آگے بڑھو۔" انہوں نے مدھم لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ "جب ہم اپنوں کا بدصورت حوالہ بنیں تو وہاں صرف رشتوں میں تنہائی اور سرد مہری ہی پہنچتی ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"بدصورت صرف رویے ہوتے ہیں۔ چہرے نہیں! اور یقین رکھو کہ ہر چہرہ کسی نہ کسی نظر کا محبوب ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا انصاف ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تو میرب نے بے یقینی سے دیکھا۔

"ہر چہرہ؟ کیا میرا چہرہ بھی؟" اس نے حیرانی سے دہرایا۔ اس کی بے یقینی پر وہ تڑپ کر رہ گئیں۔

"ہاں! اگر تم یقین رکھو۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میرب دھیرے سے مسکرادی۔

"دادو اس دنیا میں میرا ایسا واحد رشتہ تھیں جو بغیر کسی وجہ کے مجھ سے محبت کرتی۔ ان کے بعد محبت کا یہ احساس کسی رشتے سے نہیں ملا مگر مجھے دادو جیسی شفقت والی آپ ضرور مل گئیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

انہوں نے سر ہلایا۔ وہ میرب کے دکھ سے تب سے واقف تھیں جب اسے اپنوں کے درمیان تنہا سسکتے دیکھا۔ اب تو وہ بہت بدل گئی تھی۔ اپنے دکھ کو چھپانے میں ماہر، مضبوط لڑکی جو صرف ان کے سامنے ہی کبھی کبھی ہار جاتی تھی۔

زندگی کس قدر تنگ ہوتی۔ اگر امید کی کشادگی نہ ہوتی!!

☆☆☆

"السلام علیکم! میں یاد ہوں آپ کو؟ اس دن۔" زہرہ نے دروازہ کھولا تو سامنے زویا بریانی کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ وہ مسکرا ئیں۔

"تمہیں کون بھول سکتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہتے ہوئے، اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

"کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں؟" اس نے منہ بسور کر کہا۔

"ارے تم بہت پیاری ہو۔ اس لیے کہا۔" وہ نرمی سے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لائیں۔

زویا عجیب سے احساس میں گھر کر ان کے ساتھ کھنچی چلتی گئی۔

"آپ کے گھر میں کون کون ہے؟" لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

"میرے دو بیٹے ہیں جو بیرون ملک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سیٹ ہیں۔ مجھے کئی بار بلایا مگر میں صرف گھومنے پھرنے جاتی ہوں۔ مجھے اپنے گھر، اپنے ملک سے عشق ہے۔ زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"اکیلے گھر میں گھبرائیں نہیں آپ؟" زویا نے حیرانی سے پوچھا۔

"اپنے گھر میں ڈر کیسا؟ سارا دن تو ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کے سنگ گزر جاتا ہے۔ سرونٹ کوارٹر میں ایک فیملی مستقل طور پر رہتی ہے۔ وہ گھر کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے مجھے تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایک بات یاد رکھنا کہ ہماری تنہائی، دوسرے کی ضرورت سے مل کر رنگ بدل بھی لیتی ہے۔ اس لیے انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ اور سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی ہمارے کام آتا ہے، کسی کے ہم کام آتے ہیں۔ چائے پیو گی یا کافی؟" انہوں نے مڑتے ہوئے سوال کیا۔ وہ چونکی۔

"آئس کریم شیک!" اس نے جلدی سے کہا تو وہ مسکرادیں۔

"تمہارا بے تکلف انداز اچھا لگا۔" وہ کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"اکثر ایسے بے تکلف لوگ، گھر پر قبضہ بھی جما لیتے ہیں۔ خالہ میری بلیک کافی۔"

اپنی آستین کو فولڈ کرتے، وہ بڑبڑاتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا۔ زویا پر نگاہ ڈال کر اونچی آواز میں کہا۔

"آپ یہاں ہی پائے جاتے ہیں؟ اپنا گھر کیا کرائے پر دے رکھا ہے؟" اس نے تپ کر کہا۔

"آپ کرائے دار بننا چاہیں گی تو منظور ہے۔ چھ مہینے کا ایڈوانس کرایہ لوں گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں کیوں کسی کے گھر رہوں؟ میں اپنے گھر ہی ٹھیک ہوں۔" اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

اسی وقت زہرہ خالہ ٹرے میں ان دونوں کی پسند کے مطابق مشروب لے کر آ گئیں۔

"بی بی گل کو شکریہ کہنا۔ میں آتی ہوں۔"

وہ بریانی کی پلیٹ اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ زویا نے مطمئن انداز میں سامنے کھڑے عبدالہادی کی طرف دیکھا جو اسے گھورتا ہوا آگے ہوا اور آئس کریم شیک کا گلاس اٹھا لیا۔

"یہ میرا ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"آپ کے مزاج کے حساب سے بلیک کافی سوٹ کرتی ہے۔ انجوائے کیجیے۔" وہ مزے سے شیک پیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ زویا نے منہ بنا کر کالی کافی کو دیکھا اور مگ اٹھا کر پہلا سپ لیا۔

"اتنی کڑوی! جیسا بندہ، ویسی پسند۔!" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کپ واپس رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی۔" وہ جو اپنی دھن میں چلتی لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی۔ سنجیدہ آواز پر ٹھٹک کر رک گئی۔ کان سے لگائے آلے کسی سے بات کر رہے تھے۔

ان کی نظر بچا کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ جب اس کے کانوں میں کچھ الفاظ پڑے اور وہ ساکت رہ گئی۔

"تم زویا کے معاملے میں اتنے لاپروا کیسے ہو سکتے ہو؟ مت بھولو وہ تمہاری بیٹی ہے۔ تمہاری پہلی اولاد۔ علینہ کی نشانی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دوسری شادی کرتے ہی اسے بھول جاؤ گے ذیشان! تم نے پڑھے لکھے ہو کر جاہلوں والی حرکت کی ہے۔ اگر زویا یہاں نہ آتی تو میں کبھی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کس محرومی کے سائے تلے پلی بڑھی ہے۔" ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

زویا نے گردن گھما کر اپنے ہینڈسم چاچو کی طرف دیکھا۔ جن پر گزرے وقت نے گہرے نقوش چھوڑے تھے مگر آج بھی وہ اپنی وجاہت اور سوبر شخصیت کی وجہ سے سب سے الگ نظر آتے۔ اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی امڈ آئی۔ دور ویرانے میں رہنے والے شخص نے چند مہینوں میں اس کی تکلیف کو جان لیا تھا۔ اس کا مقدمہ، اس کے باپ سے لڑ رہا تھا۔ وہ جو اتنے سال باپ کے گھر میں رہتے ہوئے بھی پرائی رہی، آج اپنا ہمدرد باپ جیسا سایہ اور شفقت پا کر بے اختیار رو پڑی۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ داؤد نے گردن گھما کر اسے جاتے ہوئے دیکھا اور گہری سانس لی۔

"تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اگر تم اپنی زندگی میں خوش ہو تو رہو مگر زویا آج سے میری ذمہ داری ہے۔ میں اس کا چاچو بھی ہوں اور ماں باپ بھی۔ دوبارہ میری بیٹی کو تکلیف پہنچانے سے پہلے سوچ لینا۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہا اور ذیشان کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا پھر بیل بجا کر بی بی گل کو بلایا۔

"ہمارے لیے چائے کے ساتھ گرم پکوڑے بنا دیں۔ میں اور زویا چائے لان میں بیٹھ کر پئیں گے۔" داؤد نے مسکرا کر کہا تو بی بی گل سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

"جلدی سے لان میں چلو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

اگلی کال انہوں نے زویا کو کی اور اس کے فون اٹھاتے ہی حکم صادر کر کے کاٹ دیا۔ کچھ دیر کے بعد زویا دھلے منہ اور سوجی آنکھوں کے ساتھ لان میں موجود تھی۔

''اس دن آدھی کہانی سنی تھی۔ باقی کی نہیں سنو گی ؟'' داؤد نے مسکرا کر پوچھا تو زویا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ایک شرط پر پوری کہانی سناؤں گا کہ تم اپنی زندگی میں میرب نہیں بنو گی۔'' داؤد نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

زویا نے بے اختیار وعدہ کر لیا۔ وہ محبت کی کہانی کے طلسم کدہ میں جانا چاہتی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ کسی کی محبت کو مجسم دیکھنے کی خواہش میں اکثر اپنی آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

''میں میرب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

داؤد کے اعتراف پر رفعت جہاں کو حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ پچھلے کچھ مہینوں سے وہ ان دونوں کے درمیان بسنے والی محبت کی مہک پہچان چکی تھیں۔ وہ خاموش رہیں۔ داؤد کو ان کے ردعمل پر حیرانی ہوئی۔ اس نے اپنے دل کا حال میرب سے بھی پہلے، انہیں بتایا تھا جن سے اس کا دلی تعلق تھا۔

''کیا آپ کو برا لگا ؟'' مسلسل خاموشی پر اس کی پریشانی بڑھ گئی۔

''صبا! وہ کبھی نہیں مانے گی۔'' بالآخر ان کی خاموشی ٹوٹی۔ ایک لمحے کے لیے وہ چپ رہ گیا۔

''مما کو کیا اعتراض ہوگا؟ ذیشان نے بھی اپنی پسند سے شادی کی ہے۔'' اس نے حیرانی سے کہا۔ وہ مسکرا دیں۔

''میرب اپنے بچپن سے اگنور چائلڈ رہی۔ اس کی خوب صورت اور حسین ماں کے معیار سے بہت پیچھے تھی۔ اس لیے وہ آج تک میرب کو اپنے سرکل میں متعارف کرواتے ہوئے جھجکتی ہیں۔ سارہ کو میں کافی سالوں سے جانتی ہوں۔ مجھے اس کے مزاج کا اندازہ ہے۔'' انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

''مگر ان باتوں سے مما کا کیا تعلق ہے؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''اس لیے کہ صبا اور سارہ کی فطرت ایک جیسی ہے۔ دونوں انسانوں میں ظاہری طور پر پرفیکشن چاہتی ہیں جو ممکن نہیں۔'' انہوں نے مدھم لہجے میں کہا۔

کتنی دیر وہ کچھ بول نہیں سکا۔ اس پرفیکشن (کاملیت) کی خواہش نے تو اس کے دل کا سکون چھینا تھا۔

''تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میرب نے ساری زندگی مشکل میں گزاری ہے۔ شادی کے بعد بھی ویسا ہی ماحول اور رویے اس کا مقدر بنیں گے۔ وہ ذہنی طور پر مضبوط نہیں رہی کیونکہ۔!'' ایک دم کچھ کہتے ہوئے وہ رکیں۔ اپنی سوچوں میں گم داؤد نے غور نہیں کیا۔

''جو بھی ہو۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ مما کو ماننا ہوگا۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

'' صبا نے اسی کاملیت کی خواہش میں اپنی محبت کو کھو دیا۔ جو اپنا خسارہ نہیں جان سکی، وہ تمہاری محبت کی کیا قدر کرے گی۔'' انہوں نے افسردگی سے خود کلامی کی۔ محبت کا نقصان کسی اپنے کا ہو یا اپنا ہو۔ اداسی ایک جیسی اور چبھن بہت اندر تک محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆

''یہ لڑکی کون ہے؟''

صبا جو کافی دیر سے اسے رفعت جہاں کی خدمت کرتی دیکھ رہی تھی۔ ایک دم سوال کیا تو وہ دونوں چونک گئیں۔ میرب ان کی خراب طبیعت کا سن کر سوپ بنا کر لائی تھی۔ اب بہت پیار سے انہیں پلا رہی تھی جب کمرے میں داخل ہوتی صبا اسے دیکھ کر چونکی۔ کچھ دیر ان دونوں کی پیار بھری باتیں سنتی

رہی۔ پھر اچانک سوال کیا۔
"یہ ہمارے پڑوسی ہمایوں صاحب کی بڑی بیٹی میرب ہے۔" رفعت جہاں نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔
"سارہ ہمایوں کی بیٹی؟" صبا کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ اس نے سرتاپیر عام حلیے میں ملبوس لڑکی کی طرف دیکھا "ہمم! لگتی تو نہیں۔" زیر لب کہتے ہوئے وہ اور صوفے پر بیٹھ کر میز پر رکھا میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔
ان کی موجودگی میرب کو کنفیوز کر رہی تھی۔
"آپ آرام کیجیے۔ میں اب چلتی ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"کل شام گڑیا کی سالگرہ کا چھوٹا سا فنکشن ہے۔ تم نے ضرور آنا ہے۔" انہوں نے یاد دہانی کروائی تو وہ سر ہلاتی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔
"کبھی ماں سے بھی باتیں کرلیا کرو۔" رفعت جہاں نے مسکرا کر کہا تو صبا چونکی۔
"آپ کی بیماری کا سنتے ہی فوراً لاہور سے اسلام آباد پہنچ گئی۔ حالانکہ اتنے ضروری کام کرنے تھے۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"شجاع کیسا ہے؟ اسے بھی ساتھ لے آتیں۔" انہوں نے محبت سے اپنے داماد اور صبا کے شوہر کا ذکر کیا۔
"وہ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں کسی اور سے کیا غرض۔" صبا نے سر جھٹکا۔
"یہ تم کہہ رہی ہو؟ جس نے عمر کا ایک حصہ اس شخص کے ساتھ گزارا ہے جو اس کی محبت میں مبتلا رہا۔" انہوں نے افسوس سے کہا۔
"ہونہہ! یہ محبت، پیار سب فضول باتیں ہیں۔ شجاع جو میرے دیوانے تھے، میری محبت کا دم بھرتے نہیں تھکتے تھے۔ آج مجھے دیکھتے نہیں، مجھ سے بات نہیں کرتے۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کھنک تھی۔
"غلط تم بھی ہو سکتی ہو؟ محبت کا جواب محبت سے دینے میں اگر ہم چوک جائیں تو ایسے ہی ملال زندگی کو گھیر لیتے ہیں۔" انہوں نے نرم لہجے میں سمجھانا چاہا۔
"آپ اپنی بیٹی کو نہیں جانتیں؟ میں نے اپنے گھر، اپنے شوہر کے لیے کیا نہیں کیا؟ مگر میری وفا کی قدر نہیں کی گئی۔" اس نے تلخی سے کہا۔
"اپنی بیٹی کی ضد اور مزاج سے واقف ہوں۔ اسی لیے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم دونوں کی سرد جنگ نے داؤد کی زندہ دلی کو منجمد کر دیا ہے۔ وہ پہلے سے بہت بدل گیا ہے۔ اپنے والدین کی ناکام ازدواجی زندگی کی وجہ سے، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔"
ماں کی بات سن کر وہ کتنی دیر کچھ بول نہیں سکی۔
"میں اس بار ٹھان چکی ہوں۔ داؤد کی مزید نہیں سنوں گی۔ میری دوست کی بیٹی ہے کنول! داؤد بھی اس سے ملا ہوا ہے۔ دونوں کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔" صبا نے اپنی طرف سے طے کیا فیصلہ سنایا۔
"یہ حماقت مت کرنا۔ داؤد کبھی راضی نہیں ہوگا۔" انہوں نے پریشانی سے کہا۔
"کیوں؟" تیکھے لہجے میں سوال کیا گیا۔
"اس کا جواب بہت جلد مل جائے گا۔"
انہوں نے نگاہیں چرائیں۔ صبا کو کچھ کلک کیا۔ وہ چونک گئی۔ کچھ دیر ان کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔
رفعت جہاں کے چہرے پر اداسی تھی جیسے وہ اپنے سامنے رشتوں کو ٹوٹتا بکھرتا دیکھ رہی تھیں مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھیں۔
☆☆☆
پچھلی کتنی دیر سے وہ اپنی وارڈروب کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج شام کی خاص دعوت پر کیا زیب تن کرے۔ آج سے پہلے کبھی کپڑوں کے انتخاب میں اسے مسئلہ درپیش

نہیں آیا تھا مگر جب سے اس کے اندر کی دنیا بدلی تھی ،اس کی سوچ کے رنگ بھی نکھر گئے تھے۔

"میرے پاس سب بہت عام سے کپڑے ہیں۔" میرب نے اداسی سے خودکلامی کی۔

"آپ پر سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ آپ بہت پیاری ہیں۔" اس کی الماری سیٹ کرتی بلقیس نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"گڑیا کی سالگرہ اتنی اچانک آئی کہ میں خاص تیاری ہی نہیں کر سکی۔" اسے افسوس نے گھیر لیا۔

"باجی! آپ یہ والی فراک پہن لیں۔ بہت پیاری لگتی ہیں۔" اس نے کالے رنگ کی شفون کی فراک نکالی تو میرب چونکی۔

"ہاں! یہ پیاری ہے۔" اسے تسلی ہوئی۔ شفون کی ستاروں والی فراک کے ساتھ، اس نے چاندی کے جھمکے پہنے۔ ہلکے سے میک اپ اور کھلے بالوں کے ساتھ تیار ہو کر جب وہ نیچے اتری تو سارہ اسے دیکھ کر چونک گئیں۔ ہر وقت سادہ رہنے والی میرب، تھوڑی سی تبدیلی سے بہت الگ اور پیاری لگ رہی تھی۔

"ماشاءاللہ! اسی طرح رہا کرو۔ شکل صورت اللہ کی بنائی ہے مگر اپنی شخصیت کو گروم کرنے میں کیا برائی ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا تو میرب نے حیرانی سے دیکھا۔ سارہ کا ایسا لہجہ اس نے بہت کم سنا تھا۔

"آپ نہیں چلیں گی؟" میرب نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں! آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم انجوائے کرو۔" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میرب نے گڑیا کے لیے پیک کیا تحفہ اٹھایا اور گھر سے باہر چلی گئی۔ ساتھ والی گھر میں ہلکی روشنیوں کے ساتھ، ہال کو غباروں سے سجایا ہوا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے بچے بھی بلائے گئے۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔"

رفعت جہاں نے اسے دیکھتے ہی کہا تو میرب جھینپ گئی۔ داؤد جو بچوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں نے میرب کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس لیے اس کی چہرے کی چمک اور مسکراہٹ بہت روشن تھی۔

"لگتا ہے اس محفل کی خاص مہمان میرب ہے۔" تک سک سے تیار صبا کہتے ہوئے آگے بڑھی اور بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔ نجانے صبا کو اس لڑکی سے چڑ کیوں محسوس ہو رہی تھی۔

میرب اور رفعت جہاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، سالگرہ کا کیک کاٹنے کے لیے علینہ نے اسے آواز دی۔ صبا سر جھٹک کر اس کی طرف بڑھ گئی۔ میرب کو عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ ایک طرف کونے میں کھڑی ہو کر ان سب کے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھنے لگی۔ ایک اداسی سی اس کے اندر پھیل رہی تھی۔

"چہروں کی اداسی، منظر بھی اداس کر دیتی ہے۔ آج خوشی کا موقع ہے۔ یہ اداسی نہیں چاہیے۔"

اس کے پاس سرگوشی ابھری تو میرب نے گردن گھما کر کچھ فاصلے پر کھڑے داؤد کی طرف دیکھا جو بظاہر سامنے دیکھ رہا تھا مگر دھیان اس پر تھا۔ میرب کے دیکھنے پر، اس نے بھی گردن گھما کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نگاہوں میں محبت کی چمک تھی۔ دونوں ایک ساتھ مسکرائے۔ ان کی روشن مسکراہٹ نے گڑیا کے ساتھ کھڑی کیک کاٹتی، صبا کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اسے میرب سے اپنی بلاوجہ کی چڑ کی سمجھ میں آ گئی۔

"ہونہہ! یہ لڑکی میرے خوبرو بیٹے کے ساتھ کہاں سوٹ کرتی ہے۔" صبا نے غصے سے سوچا اور کیک کٹتے ہی تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ داؤد کے پاس آ کر وہ رکی۔ دونوں چونکے۔

"تم اپنوں کو چھوڑ کر، یہاں کھڑے وقت ضائع کر رہے ہو۔ کچھ دیر ماں کے ساتھ بھی بیٹھو۔" صبا نے حقارت بھری نگاہ میرب پر ڈالی۔ جس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ داؤد کچھ کہتا وہ پلٹی اور بھاگتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئی۔
"مما! آپ جو سمجھ رہی ہیں۔ وہ سچ ہے۔ میں میرب سے محبت کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔" داؤد نے ضبط کرتے ہوئے، مضبوط لہجے میں کہا اور صبا کو حیران چھوڑ کر میرب کے پیچھے چلا گیا۔
"میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔" صبا نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔
"میرب! میری بات سنو!"
میرب گھر کی پچھلی طرف بنے دروازے سے اپنے گھر کی طرف بڑھی جب داؤد کی آواز پر ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میرب کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔
"میں مما کے رویے پر معذرت خواہ ہوں۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔
"میں عادی ہوں۔" میرب نے تلخی سے کہا۔
"کچھ وقت لگے گا مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے یقین سے کہا۔
"کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ میری زندگی میں کبھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔"
میرب نے مایوسی سے کہا اور پلٹ کر جانے لگی مگر ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا ہاتھ کسی کی گرفت میں تھا۔ میرب کو لگا جیسے کائنات تھم گئی۔
"میری محبت کی دنیا میں قدم رکھ کر دیکھو! پھر بتانا۔" مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔
میرب نے پلٹ کر نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"محبت کی دنیا سے بہت الگ اور کٹھور ہے یہ دنیا۔ آزما کر دیکھ لیں۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔
"تم مجھے اپنا یقین سونپ دو۔ باقی میری قسمت۔" وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر یقین سے مسکرادی۔
"میں نے یقین کیا۔ پہلی بار! اگر یہ ٹوٹا تو میں بھی ٹوٹ جاؤں گی کبھی نہ جڑنے کے لیے!" وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ خاموش کھڑا اس کے قدموں کے نشان دیکھتا رہا۔ زمین پر نہیں، اپنے دل پر۔!

☆☆☆

"تم آج کل کہاں گم رہتی ہو؟ کب سے آواز دے رہی ہوں۔" سارہ نے لاؤنج کے صوفے پر گم صم بیٹھی میرب کو پکارا۔ وہ چونکی۔
"کچھ نہیں۔" اس نے نگاہیں چرائیں۔ سارہ چونک گئیں۔
"اگر ہمایوں کا اندیشہ درست ثابت ہوا تو؟" وہ پریشان ہو گئیں۔ کئی سال پہلے کی وہ رات آج بھی انہیں یاد تھی۔
"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟ کچھ برا تو نہیں سوچ رہیں۔ اگر مسئلہ ہے تو!"
انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اپنی فکر کا اظہار کریں۔ میرب سمجھ کر مسکرادی۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو کوئی کام تھا؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"ہمم! میری ایک دوست نے رشتہ بتایا ہے۔ اس ویک اینڈ پر وہ لوگ آئیں گے۔ تم پلیز خود پر توجہ دو۔ پارلر چلی جاؤ۔ ہیئر کٹ کروا لو۔ تمہارا ڈریس میں خود سلیکٹ کروں گی۔" سارہ نے فکرمندی سے کہا۔
میرب زیر لب مسکرادی۔ اس کی ماں کے لیے وہ آج بھی پہلے دن کی طرح مسئلہ تھی۔ وہ میرب کو ویسا بنا کر پیش کرنا چاہتی تھیں جو وہ نہیں تھی۔ وہ ہدایات دے کر چلی گئیں۔ میرب جو محبت کے حصار میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ آنے والے رشتے کا سن کر پریشان ہو گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور جلدی سے شال لپیٹ کر گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی آج بھی پارک میں داؤد اس کا منتظر ہوگا۔

☆☆☆

"اب میں سمجھی! آپ نے ساری عمر شادی

کیوں نہیں کی؟''
موبائل کال کی وجہ سے کہانی کا تسلسل ٹوٹا تو زویا نے اظہار خیال کیا۔ فون بند کرتے داؤد نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''ان کی شادی کہیں اور ہوگئی اور اسی وجہ سے۔!'' وہ کہتے ہوئے چپ ہوئی۔

''ابھی اپنے اندازے رہنے دو۔ کسی دوسرے کا سچ، ہمارے اندازے کے مطابق کبھی نہیں ہوتا۔'' ان کا لہجہ نرم تھا۔

''اور کیا ہوسکتا ہے؟ آپ جلدی سے باقی کی کہانی سنائیں۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔ وہ مسکرایا۔

''آج کے لیے یہ کہانی یہاں تک ہی، باقی پھر کسی دن۔''

داؤد نے سنجیدگی سے کہا کیوں کہ ان سے ملنے کچھ لوگ آرہے تھے۔ وہ، خان بابا کو مختلف ہدایات دیتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گئے۔ زویا لان میں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

''کیا محبت کی سب کہانیاں اداس کر دینے والی ہوتی ہیں؟'' اس نے اپنے دل میں جلتی بجھتی روشنی سے نگاہیں چراتے ہوئے، خود کلامی کی تھی۔

☆☆☆

''ثمرہ کی شادی؟'' اس نے حیرانی سے دہرایا۔ چائے پیتی زہرہ خالہ مسکرادیں۔

''اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟'' انہوں نے سامنے بیٹھی زویا کی طرف دیکھا۔

زویا شام کے وقت اکثر ان سے ملنے آجاتی۔ ابھی بھی سرسبز لان میں بیٹھے، چائے کے ساتھ پکوڑے کھاتے ہوئے وہ دونوں خوب صورت موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، جب انہوں نے انکشاف کیا۔

''ابھی تو اس نے ایف۔اے کے امتحان دیے ہیں۔ اتنی جلدی کیوں؟'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ وہ گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کی فکر کو دیکھنے لگی۔

''ثمرہ کی بات، اس کے چاچو کے بیٹے سے طے ہے۔ عبدالہادی جلد از جلد بہن کا فرض ادا کرنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''فرض ہے یا بوجھ؟'' وہ بڑبڑائی۔

''اگر پوری بات کا پتا نہ ہو تو اظہار خیال کرنا ضروری نہیں ہوتا استانی صاحبہ!'' لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہ قریب آیا۔ جھک کر زہرہ خالہ سے پیار لیا اور اس پر خشمگین نگاہ ڈال کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ اچانک کہاں سے نازل ہو گئے؟'' زویا نے منہ بنایا۔

''تمہاری گیٹ کی طرف پشت ہے۔ اس لیے تم اسے اندر آتا ہوا نہیں دیکھ سکیں۔'' وہ مسکرائیں۔

''مگر میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو صاحب بہادر کو ناگوار گزرا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''پانچ سال پہلے وہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس کے بہت بڑے بڑے خواب تھے۔ جن کی تکمیل کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ ساری زندگی گاؤں کی زندگی سے دور ہوسٹل میں رہا۔ اسے اپنے باپ کے خاندانی اور سیاسی مسئلوں سے بہت چڑ تھی۔ اس لیے وہ ان سب سے دور رہتا۔ جبکہ اس کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زمینوں، اپنے کام کی دیکھ بھال کرے۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان بحث رہتی۔ عبدالہادی نے روز روز کی اس بحث سے تنگ آکر بیرون ملک جانے کا فیصلہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے بہانے باہر جانا چاہتا تھا مگر اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ بات میری بہن ارم کے لیے تکلیف دہ تھی کیونکہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے بیٹے سے بہت امیدیں تھیں۔ عبدالہادی کو سمجھانے کے لیے وہ دونوں شہر آئے کیونکہ تین دن بعد اس کی فلائٹ تھی۔ عبدالہادی نہیں مانا۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ وہ دونوں وہاں سے خالی ہاتھ واپس لوٹے جب گاؤں واپس آتے ہوئے، ویران راستے میں ہونے والی فائرنگ کا شکار ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے......'' وہ رو

پڑیں۔ "میکے کے نام پر بس ہم دو بہنیں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ ارم مجھ سے کچھ سال بڑی تھی۔ ماں، بہن، دوست ہر رشتہ اس میں دیکھا......"

انہوں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "والدین کی زندگی میں من مانی کرنے والا، ان کے جانے کے بعد بالکل بدل گیا۔ اس کے خواب، اس کی خواہشیں، سب اس رنگ میں ڈھل گئیں جو اس کے والدین کی خواہش تھی۔" وہ مدھم لہجے میں گویا ہوئیں۔

"مگر انہیں قتل کس نے کیا اور کیوں؟ کیا عبدالہادی انہیں جانتا ہے؟" زویا نے حیرانی سے پوچھا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس کے والد کا سوتیلا بھائی نواز۔ جس سے جائیداد کا جھگڑا چل رہا تھا۔"

"پھر کیا انہیں سزا ہوئی؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"قانون سے تو نہیں مگر قدرت کی طرف سے عبرت ناک سزا ملی۔ ان کی کار کو حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ معذور ہو گئے۔ ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔" انہوں نے گہری سانس لے کر بتایا۔

"نواز کا بیٹا زلفی اکثر کسی نہ کسی وجہ سے تنگ کرنے کی کوشش میں رہتا ہے مگر اس کی بار عبدالہادی مضبوطی سے اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس علاقے میں اس کے والدین کی بہت عزت تھی۔ گاؤں کے لوگ بہت پیار کرتے تھے۔ اس لیے عبدالہادی سے بھی سب کو محبت ہے۔ اپنے لوگوں کے درمیان آکر اسے احساس ہوا کہ مٹی سے جڑے رشتے کتنے خالص اور انمول ہوتے ہیں۔" انہوں نے بات مکمل کی۔

اس شام وہاں سے واپس آتے ہوئے زویا سوچ رہی تھی کہ کسی دوسرے کے دکھوں کے نشان دیکھ کر، اپنے دکھ، درد کا سایہ ایک دم سے چھوٹا ہونے لگتا ہے۔

☆☆☆

"آپ کو اسے یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا۔"

زویا کے جانے کے بعد، وہ لاؤنج میں آئیں تو عبدالہادی کو کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا جہاں سے لان صاف نظر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جس میں ہلکی سی نمی بھی تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ اسے سب پتا ہو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ اس نے گردن موڑی۔

"کیوں؟" انداز سوالیہ تھا۔

"اپنے دل سے پوچھو! میں نے تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے روشنی دیکھی۔ جیسے تمہارے دل کے سونے آنگن میں اس کی محبت کا دیپ جلتا ہے۔" وہ یقین سے مسکرائیں۔

اس نے گردن موڑ لی اور اپنی نگاہیں اس جگہ مرکوز کردیں جہاں کچھ دیر پہلے وہ موجود تھی۔ من میں جلتے محبت کے دیپ سے اگر زہرہ واقف ہو گئی تھیں تو وہ کیسے انجان تھی؟

"بیٹا! میں جانتی ہوں کہ پچھلے پانچ سالوں میں تمہارے لیے زندگی ویسی نہیں رہی، جیسی تم نے سوچی تھی مگر زندگی میں آگے بڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ زویا حساس فطرت کی معصوم دل لڑکی ہے۔ فی زمانہ یہ خوبیاں نایاب ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی بے ساختگی تمہاری زندگی میں خوشی اور محبت کے رنگ بکھیر دے گی۔" زہرہ نے پاس آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"زہرہ خالہ! جب تک والدین زندہ رہے میں کبھی نہیں جان سکا کہ میں کون ہوں؟ میری پہچان، میرا حوالہ کیا ہے؟ مجھے لگتا تھا کہ وہ نیلا آسمان میری پرواز کا منتظر ہے مگر تقدیر نے جب مجھ سے میرے پیارے چھین لیے تب میں خود کو بنجر، ویران زمین کی طرح پایا۔ میرے کئی سالوں کے خواب کہیں گم گئے۔ والدین، اولاد کے لیے وہ سب کچھ ہوتے ہیں، جو اولاد کی خواہش، اس کے خواب ہوتے ہیں مگر ان کے جانے کے بعد اولاد کو اپنی اوقات،

اپنی بساط کا پتا چلتا ہے۔" مدھم لہجے میں آنسوؤں کی نمی گھلی تھی۔

اب کیوں لگتی ہیں مجھے یہ ٹھوکریں بابا۔
اب تو چپل بھی میں سیدھی پہنتا ہوں۔!!

"مجھے آج بھی ان کا اپنے پاس آنا، مجھے منانا یاد آتا ہے۔ میں لاڈلا تھا، اکلوتا۔ جانتا تھا کہ وہ میری ضد کے آگے ہار جائیں گے۔ میں اس خطرے کو نہیں بھانپ سکا جس سے وہ خوف زدہ تھے۔ ان کے جانے کے بعد کئی مہینے مجھے زندگی، ان شب روز، وقت کی سمجھ نہیں آئی۔ جب سمجھ میں آئی تو پتا چلا کہ میرے سامنے تو بنجر، بیابان زمین ہے۔ جسے اپنی محنت سے نرم کر کے بیج بونا ہے۔ پرانے عبدالہادی کی جگہ نئے عبدالہادی نے لینی ہے۔ پانچ سال کا سفر مشکل تھا مگر آج میں ویسا ہی بن گیا ہوں، جیسا ان کی خواہش تھی مگر افسوس! وہ یہ دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہیں۔" اس کے لہجے میں پچھتاوے تھے۔

"مگر وہ تم سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ اس پچھتاوے سے باہر نکل آؤ۔ تمہارا سفر اسی طرح لکھا ہوا تھا۔" انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ ثمرہ کے ساتھ، تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ کچھ دنوں تک میں میجر داؤد کے گھر رشتہ لے کر جاؤں گی۔" انہوں نے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا۔

"مگر ابھی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر بعد میں کرنا۔ پہلے بات کرنے دو۔" انہوں نے مان سے ٹوکا تو وہ چپ ہو گیا۔ ایک بار پہلے وہ اپنے والدین کا مان توڑ چکا تھا، اب ماں جیسی خالہ کا مان رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

آج پھر یادوں کی یلغار نے حملہ کیا تو وہ ڈائری کھول کر بیٹھ گئے۔ اس ڈائری میں لکھی تحریریں وہ نجانے کتنی بار پڑھ چکے تھے مگر پھر بھی انہیں ہر بار ہجر کا نیا ذائقہ محسوس ہوتا۔ محبت کی جدائی بہت ظالم چیز ہے۔ اس میں دکھ، درد، اداسی کی عمر لمحوں میں بڑھتی ہے اور پھیل کر صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے جیسے کسی گزری صدی کی بوڑھی جادوگرنی ہو جس کی بڑھتی عمر اسے کمزور تو بنا دے مگر اس کی جھریوں سے بھرے ہاتھوں اور چہروں کی لکیروں میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جائے۔ ان کے وجود کی پرانی اور بوسیدہ عمارت میں ماضی کے ایسے کئی نقش و نگار تھے۔ ویرانی تھی، یاد کے جالے تھے، آنسوؤں کی سیلن تھی۔ خشک پتوں کی طرح بکھرے کچھ خواب تھے۔ جنہیں وقت نے زرد کر دیا تھا۔ اس بوسیدہ عمارت میں آج بھی اگر اول روز کی طرح جلتا تھا تو اس کی محبت کا دیا۔

☆☆☆

محبت روح پر اترا الہام۔
محبت من دیپ ہے۔

دروازے پر ہونے والی دستک سن کر وہ چونکے۔ بے اختیار ان کی نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ جانتے کہ رات کے اس وقت بے چین پھرنے والی روح، زویا کی ہی ہوگی۔ کچھ لمحوں کے بعد، ان کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔

"میں نے سوچا اکیلے بور ہونے سے بہتر ہے کہ ہم مل کر کافی پیتے ہوئے، ادھوری رہ جانے والی کہانی مکمل کر لیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"تم جانتی ہو کہ اپنی ذات کی تنہائی میں کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی۔" انہوں نے گھورا۔

"کیا آپ جانتے ہیں بعض راتیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ سوچوں کے اژدھا خود میں جکڑ لیتے ہیں۔ ہر لمحہ سانس تنگ ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ رات نہیں کٹتی۔" اس نے کافی کا مگ جھک کر میز پر رکھا۔ وہ نگاہیں چرا رہی تھی مگر داؤد نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی۔

"آج تمہاری ماں کی برسی ہے۔"

انہوں نے مدھم لہجے میں کہا۔ زویا کا ہاتھ کانپا مگر وہ خاموشی سے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی بھیگی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔

''علینہ میری بھابھی بھی تھیں اور بہنوں جیسی دوست بھی۔ ذیشان، علینہ اور تم! ایک مکمل فیملی کی تصویر کے رنگ تھے۔ پھر نجانے کس کی نظر لگ گئی۔ علینہ کو کینسر جیسے موذی مرض نے نگل لیا۔ ہم سب نے بس اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ تب تم بارہ سال کی تھیں۔'' داؤد نے گہری سانس لے کر کہا۔ زویا خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

''مما کے جانے کے بعد، پاپا نے دوسری شادی کرلی۔'' وہ گویا ہوئی۔

''ہاں مگر تمہاری دادو کے اصرار پر۔'' انہوں نے فوراً تصحیح کی۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔

''ضد تو آپ سے بھی لگائی تھی دادو نے۔ مگر آپ نے تو شادی نہیں کی۔'' اس کا لہجہ مدھم تھا۔

داؤد کے چہرے کا رنگ بدلا۔ انہوں نے اپنی نگاہیں کافی کے کپ پر مرکوز کردیں۔

''دوسرا رشتہ، پہلے رشتے کے وہ سب نشان مٹانے کی کوشش کرتا ہے جو انمٹ ہوتے ہیں۔'' وہ اداسی سے مسکرایا۔

''جیسے پاپا کی دوسری بیوی نے اپنی جگہ بنانے کے لیے میری ذات کی نفی کردی۔ دکھ مجھے ان کے رویے پر نہیں ہے مگر میرا باپ کیسے بدل گیا؟ کہ میں انہیں کبھی نظر نہیں آئی؟'' اس کا احساس محرومی، ایک دن ایسے ہی نکل کر سامنے آجاتا تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ۔!'' داؤد نے کچھ کہنا چاہا۔

''آپ کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھتے تو میرب کو چھوڑ کر نہیں جاتے اور نہ وہ خودکشی کرتی۔ آپ سب ایک جیسے ہیں۔''

زویا نے تڑخ کر کہا داؤد نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی جیسے بہت ضبط کررہے ہوں۔

''شٹ اپ! دوبارہ میرب پر یہ الزام مت لگانا۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

''سب کہتے ہیں کہ۔!''

''یہ ڈائری میرب کی لکھی ہوئی ہے۔ جو تمہیں ماضی کا ہر سچ بتا دے گی۔ جاؤ یہاں سے۔!'' انہوں نے میز پر سے ڈائری اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ زویا حیران نگاہوں سے دیکھتی آگے بڑھی۔

زویا ڈائری تھامے، بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ضبط کرتے داؤد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے اپنا سر میز سے ٹکا دیا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی تھی مگر۔!'' وہ سسکیوں میں کہتا، ماضی کے ان لمحوں میں پہنچ گیا جہاں محبت کی کہانی شروع ہوتے ہی ختم ہوگئی تھی۔

میں نے تو، اک بات کہی تھی
کیا تو سچ مچ، روٹھ گیا ہے؟
ایسا گاہک کون ہے، جس نے
سکھ دے کر، دکھ مول لیا ہے؟

☆☆☆

''مجھے یقین ہے مما ضرور مان جائیں گی۔''

آج پھر شام کے آنچل میں اس کے وعدے بندھے تھے۔ سفید بینچ پر بیٹھی میرب کی نگاہیں دور کھیلتے بچوں پر مرکوز تھیں۔ داؤد نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ اس کی محرومی سے واقف تھا۔

''میرب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم زندگی کے کینوس پر صرف محبت سے اپنی تصویر بنائیں گے۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں تمہاری گمشدہ مسکراہٹ واپس لے آؤں گا۔'' اس نے یقین سے کہتے ہوئے کاسنی پھولوں سے اس کا دامن بھر دیا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی۔ محبت کا اظہار اتنا مکمل اور خوب صورت ہوتے ہوئے بھی اس کے ملال کو ختم نہیں کررہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے داؤد کی طرف دیکھا جسے اپنی محبت پر بہت یقین تھا۔ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

کچھ دیر ایسی ہی ہنستی رہی کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے لب بھینچ لیے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ہنسی نہیں، اس کے دل میں اٹھتے درد کی کھنک ہے۔

''اعتبار! کتنا عجیب لگتا ہے یہ لفظ۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''اعتبار رشتہ ہوتا ہے، محبت کی پہلی منزل، پہلا قدم بنتا ہے۔ اسے لفظ سمجھو گی تو ساری زندگی اکیلی اپنی ہی آگ میں جلتی رہو گی۔ میں وہ سب سننا، جاننا چاہتا ہوں جو تمہارے دل کو تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم بتانا چاہو۔!'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

میرب سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ اس کی نگاہیں اپنی ہم راز ڈائری پر جمی تھیں۔ آج تک یہ ہی اس کی خاموش ساتھی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ کسی کا دکھ سننا، آنسو پونچھنا، ہمدردی کے چند بول بولنا، درد کی شدت کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کر دیتا ہے۔

گفتگو سے نکل آتے ہیں ہزاروں رستے۔
ذرا دیوار کی سنیے، ذرا اپنی کہیے۔

''میری کہانی کوئی انوکھی یا عجیب نہیں ہے۔ ایک عام سی لڑکی کی کہانی میں کیا نیا ہوگا۔ زندگی میں سب سے بڑا دکھ یا تکلیف یہ ہوتی ہے کہ جو آپ کے ہونے کی وجہ ہوں، وہ ہی آپ سے بیگانے رہیں۔ آپ کو بوجھ سمجھ کر خود سے دور کر دیں۔ کتنا عجیب لگتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی مرضی، پسند سے محبت کی شادی کی۔ انہیں اپنی ہی اولاد، اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ لگی۔ کیا محبت اتنی خود غرض ہوتی ہے؟ صرف اپنی خوشی کے لیے جینے والی۔''

بھیگے اور مدھم لہجے میں بولتی ہوئی وہ ذہنی طور پر وہاں موجود نہیں تھی۔ داؤد دم سادھے اسے سن رہا تھا۔ میرب نے پہلی بار اس پر اعتبار کر کے، اپنے ذات تک رسائی دی تھی۔

''میں اپنی پیدائش سے پہلے ہی ان چاہی تھی۔ میری پیدائش کسی کے لیے خوشی کا باعث نہیں بنی سوائے دادو جان کے۔ میرے والدین مجھے تب چھوڑ گئے جب مجھے ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ دادو جان میرے لیے سب کچھ تھیں۔ میری چھوٹی سی سادہ دنیا کا آسمان بھی اور میری زمین بھی جس پر میں نے پہلا قدم رکھ کر چلنا شروع کیا۔ ان کے ہوتے ہوئے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں اپنے والدین کا رد کیا ہوا بچہ ہوں۔ میں خوش تھی۔ سادہ سی زندگی میں کبھی زیادہ کی تمنا نہیں کی۔ مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا تھا کہ میں بھی دوسرے بچوں کی طرح ، اپنے والدین کے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟

مگر میرا احساس کمتری تب جاگا جب میرے والدین واپس لوٹ آئے۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ ۔ جو میرے بہن بھائی تھے مگر مجھ سے یکسر مختلف۔ میں ان کے درمیان ایسی ہی تھی جیسے روشن ستاروں کے درمیان رات ہوتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر بھی مجھ سے الگ تھے اور دیکھنے میں بھی۔ میں گرم جوشی سے ان کی طرف بڑھی مگر وہ مجھے آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی کیا بات کروں جب میری ماں کو ہی میرے شخصیت میں کئی کمیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے آنے سے مجھے پتا چلا کہ میں کتنی ڈل، زمانے سے پیچھے چلنے والی، بے وقوف لڑکی ہوں۔ جس کے پاس نہ حسن کی دولت ہے، نہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ اگر ہے تو حساسیت سے بھرا ایک دل۔ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''یہ مت بھولو کہ اگر رات نہ ہو تو ستاروں کی چمک ماند پڑ جائے۔ تم وہ رات ہو جس کی ذات میں پراسراریت اور زندگی کا سوز ہے۔ جیسے عشق کی کسی رمز میں ہوتا ہے۔ تم بنانے والی ذات کی خوب صورت اور مکمل تخلیق ہو۔ عام ہوتے ہوئے بھی سب سے خاص۔!''

داؤد کے لفظوں نے اسے گنگ کر دیا۔ کوئی ایسے بھی لفظوں سے مرہم رکھتا ہے؟ اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کر سامنے پنجوں پر بیٹھے داؤد کو دیکھا جو سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا بھیگا چہرہ صاف کیا اور کھڑی ہوئی۔

واپسی کے سفر میں دونوں خاموش تھے مگر ان کے ساتھ ساتھ چلتے قدم بول رہے تھے۔ گھر کے پاس پہنچے تو داؤد رک گیا۔ چونکہ اس کا گھر پہلے آتا تھا اس لیے وہ انتظار کرتا جب تک میرب اپنے گھر کے اندر نہ چلی جاتی۔ اس نے گیٹ پار کیا تو وہ گہری سانس لیتا ہوا مڑ گیا۔ اپنے ٹیرس پر کھڑی سارہ نے حیرانی سے ان دونوں کو آتے دیکھا۔

''میرب اور داؤد!'' سارہ نے زیرلب دہرایا اور پھر مسکرادیں۔

☆☆☆

''تم داؤد کو کب سے جانتی ہو؟'' میرب گم صم سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی تھی۔ سارہ کے سوال پر چونکی۔

''جی۔!'' اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟ وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔

''میں نے ابھی تم دونوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ داؤد۔!''

وہ کہتے ہوئے رک گئیں۔ ان کی ادھوری بات کند چھری کی طرح اسے کاٹنے لگی۔

''میری جیسی عام لڑکی کے ساتھ، اس کا ہونا عجیب بات ہے ناں!'' اس کے لہجے میں درد تھا۔ وہ چونکیں۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا! میں تو اس بات پر حیران ہو رہی ہوں کہ تم اپنی ذات میں گم رہنے والی لڑکی ہو جبکہ وہ تمہارے برعکس مزاج کا مالک ہے......'' انہوں نے پہلی بار نرمی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔ وہ خاموش رہی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ ہم دونوں کا تعلق کبھی بھی دوستانہ نہیں رہا۔ بہر حال مجھے خوشی ہوگی اگر ان کے گھر سے رشتہ آیا۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔

اسی وقت ہمایوں آفس سے واپس لوٹے تو ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر حیرت سے مسکرائے۔

''مہک اور حسن کہاں ہیں؟'' ہمایوں نے میرب کے پاس بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''مہک کی کالج فرینڈ کی سالگرہ تھی۔ وہاں گئی ہے جبکہ حسن کی اپنی مصروفیات ہیں جب سے اس نے باہر پڑھنے کا ارادہ کیا ہے گھر میں کم ہی نظر آتا ہے۔'' سارہ نے سر جھٹک کر کہا۔ ہمایوں نے سر ہلایا۔

''اس اتوار خاص مہمان آرہے ہیں نا! میں نے اپنی ساری مصروفیات کینسل کر دی ہیں۔'' ہمایوں نے مسکرا کر میرب کی طرف دیکھا جو گھبرا گئی۔

''وہ لوگ ابھی نہیں آرہے۔ کچھ مصروفیات ہیں۔'' سارہ نے اس کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

''میرب! آج ہمارے لیے چائے تم بناؤں گی۔''

سارہ مسلسل حیران کر رہی تھیں۔ میرب فوراً سر ہلاتی اٹھ کر چلی گئی۔ ہمایوں نے حیرانی سے سارہ کی طرف دیکھا جو مسکرادیں۔

''اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ میرب میری بیٹی ہے۔ مجھے بھی اس کی فکر ہے۔'' سارہ نے منہ بنا کر کہا تو وہ مسکرادیے۔

''اچھا لگا تمہیں اس کی فکر مند ماں کے روپ میں دیکھ کر۔ آج اگر اماں جان زندہ ہوتیں تو تمہاری اس تبدیلی پر بہت خوش ہوتیں۔'' ماں کے ذکر پر ان کا لہجہ اداس ہو گیا۔

سارہ نے ایک نگاہ ہمایوں پر ڈالی مگر کچھ کہا نہیں۔ بعض اوقات کہنے کے لیے اگر بہت کچھ ہو بھی تو سامنے والے کی بدلتی کیفیت کو دیکھ کر خاموش ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ وہ اس وقت صرف میرب کے مسئلے پر فوکس کرنا چاہتی تھیں۔ میرب نے ایم۔ اے اردو کیا تھا اور آج کل فارغ تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ عام سی میرب کے لیے داؤد جیسے شاندار لڑکے کا رشتہ آنا بہت بڑی بات تھی۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کے لیے بہترین کا انتخاب کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے داؤد کے گھر والوں سے اچھے مراسم بنانے چاہییں۔ انہوں نے سوچتے ہوئے، کل ان

کے گھر جانے کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

"میرب آپ سے بہت اٹیچ ہے۔ اکثر آپ کا ذکر کرتی ہے۔" آج میرب کے ساتھ سارہ بھی رفعت جہاں سے ملنے آئیں۔ جب سے انہیں میرب اور داؤد کے بارے میں پتا چلا تھا، وہ بہت خوش تھیں۔

"میرب بہت پیاری اور حساس دل بچی ہے۔ آپ لکی ہیں جو اتنی محبت کرنے والی بیٹی ملی۔" رفعت جہاں نے مسکرا کر چائے پیتی میرب کی طرف دیکھا جو نرمی سے مسکرادی۔

"اماں! آپ!" اپنی دھن میں بولتی صبا کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی مگر ان دونوں پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"آپ سے پہلے بھی ملاقات ہوئی تھی۔" سارہ نے خوش دلی سے اٹھ کر ملتے ہوئے کہا۔ صبا کا رویہ سرد تھا جسے وہ محسوس کر کے حیران رہ گئیں۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اماں بزی ہیں۔ میں پھر آجاؤں گی۔" صبا نے سنجیدگی سے کہا اور واپس مڑنے لگی۔

"ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ ہمارے ساتھ چائے پییں۔"

سارہ نے اپنے مزاج کے برخلاف تحمل سے کہا۔ صبا نے گردن موڑ کر پہلے اسے اور پھر میرب کی طرف دیکھا جو اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

"مگر مجھے خوشی نہیں ہوگی۔" صبا نے میرب کو گھورتے ہوئے کہا۔

سارہ نے حیرانی سے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور چونک گئیں۔

"میں سمجھی نہیں؟" سارہ کا انداز سخت ہوا۔ وہ صرف میرب کی وجہ سے مسلسل برداشت کر رہی تھیں ۔ ورنہ صبا جیسی بددماغ عورت کو ایک منٹ میں سیدھا کر دیتیں۔

"آپ کی بیٹی کافی سمجھدار ہے۔ سب سمجھا دے گی۔" صبا نے طنزیہ انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سارہ کا چہرہ سرخ ہو گیا جبکہ میرب فق رنگ کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔

"چلو یہاں سے!" انہوں نے آگے بڑھ کر غصے سے اس کی کلائی تھامی۔

"سارہ بیٹی! میں معذرت خواہ ہوں۔"

رفعت جہاں کی مدھم آواز پر سارہ نے ضبط کرتے ہوئے سر ہلایا اور میرب کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لے گئیں۔

آفس سے واپس آتے ہوئے داؤد نے غصے سے تنے چہرے والی سارہ اور نم آنکھوں والی میرب کو جاتے دیکھا تھا۔ ایک لمحہ لگا اسے سب سمجھنے میں۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

"سمجھتی کیا ہے وہ خود کو؟ ہمارا اسٹیٹس، ہمارا رہن سہن، ہم ہر چیز میں ان سے آگے ہیں۔ میں صرف تمہاری وجہ سے لحاظ کر رہی تھی۔ ورنہ بے نقط سناتی......" سارہ گھر آ کر غصے سے بھری مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ "میری غلطی جو تمہارے رشتے کے لیے آنے والوں کو منع کر دیا۔ میری بات لکھ لو۔ یہ عورت کبھی داؤد کو مرضی سے شادی نہیں کرنے دے گی۔ عجیب حاکم مزاج عورت ہے۔ گھر آئے مہمانوں کی عزت کا بھی خیال نہیں۔"

سارہ بولتے ہوئے تھک ہار کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر ایسے ہی خاموشی میں گزر گئی۔ انہوں نے سامنے سر جھکا کر بیٹھی میرب کی طرف دیکھا۔

"میرب!" انہوں نے پکارا تو اس نے سر اٹھایا۔ اس کا زرد چہرہ، کانپتے ہونٹ اور بھیگی آنکھیں دیکھ کر انہیں دھچکا لگا۔

"تم ٹھیک ہو؟" ایک خدشہ دل کو لاحق ہوا۔ میرب نے معصومیت سے سر ہلایا مگر وہ کانپ رہی تھی۔ سارہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس بیٹھ کر خود سے لگالیا۔ میرب نے زندگی میں پہلی

پیار ماں کے لمس میں ہمدردی، فکر اور محبت محسوس کی تھی۔ کچھ لمحوں میں وہ سنبھل گئی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہتے ہوئے تھوڑا پیچھے ہٹی۔
"جا کر آرام کرو۔" سارہ کو یہ ہی سمجھ میں آیا کہ اسے سونے کا کہہ دیں۔ وہ سعادت مندی سے سر ہلاتی اٹھ کر چلی گئی۔
"اف میرے خدایا! ماضی کے اُس واقعہ نے ہمارے دلوں میں خوف بٹھا دیا ہے۔" وہ سر تھام کر بڑبڑائیں۔

☆☆☆

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا بیٹا یہاں آ کر محبت کی دنیا بسا کر بیٹھ جائے گا۔ وہ بھی ایک عام سی لڑکی سے۔"
صبا کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔ رفعت جہاں نے پریشانی سے اُن دونوں کی طرف دیکھا جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔
"مجھے آپ کا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میرب کو جانے بغیر اس سے اتنی بیزاری کیوں ہے؟" وہ حیران تھا۔
"اس لڑکی میں ایسا کیا ہے؟ جو مجھے متاثر کرے گا؟" صبا کے لہجے میں حقارت تھی۔ داؤد کا چہرہ سرخ ہوا۔
"محبت چہروں کو خاص بناتی ہے، خاص چہرے محبت نہیں بناتے۔" اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔
"تم اپنی ماں کو یہ مت سمجھاؤ! بہر حال میرا فیصلہ حتمی ہے۔" صبا نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ داؤد نے رفعت جہاں کی طرف دیکھا۔
"صبا بیٹی! تم صبر اور تحمل سے اس معاملے کو ہینڈل کرو۔ میرب کو میں کئی سالوں سے جانتی ہوں۔ بہت اچھی بچی ہے اور۔!" انہوں نرم لہجے میں کہا۔
صبا نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکرا دی۔

"اگر میں غلط نہیں تو سارہ ہمایوں کی اسی بیٹی نے کئی سال پہلی خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ پاگل خانے میں کافی عرصہ رہی۔ کیا آپ اس پاگل لڑکی سے میرے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہیں؟" صبا نے ناگواری سے کہا۔ وہ ساکت رہ گئیں جبکہ داؤد کے چہرے کا بھی رنگ اڑ گیا۔ اس نے نانو کی طرف شکایتی نگاہوں سے دیکھا جو فوراً نگاہ چرا گئیں۔
"آن۔ ہاں مگر۔!" انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں۔
"جو لڑکی ایک بار یہ کوشش کر چکی ہے وہ دوبارہ بھی ضرور کرے گی۔" صبا نے یقین سے کہا۔
داؤد جو اپنا مقدمہ لڑنے کھڑا ہوا تھا پہلے محاذ پر ہی بچ جان کر ہار گیا۔ شکستہ قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ رفعت جہاں گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ اسے یہ سچ بتانا تھا مگر اس سے پہلے صبا نے جس طرح بتایا! اس نے داؤد کو صدمہ پہنچایا تھا۔

☆☆☆

کئی دنوں سے میرب نے داؤد نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر روز ڈائری ہاتھ میں تھامے، پارک جاتی۔ شام کے ساتھ ساتھ وہ بھی آس اور امید کا سورج ڈھلتے ہوئے دیکھتی۔ وہ حیران تھی کہ داؤد اس سے ملنے کیوں نہیں آیا؟ صبا کے رویئے کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت پریشان تھی۔ بظاہر کسی سے کچھ نہیں کہتی مگر اس کی غائب دماغی محسوس ہو جاتی تھی۔ اس کا کئی بار دل کیا کہ رفعت جہاں سے ملنے چلی جائے مگر ایک جھجک آڑے آتی رہی۔ اسی کشمکش اور بے دلی میں کئی دن گزر گئے جب ایک دن بیک یارڈ میں باغبانی کرتی رفعت جہاں نظر آئیں تو میرب خود کو ان کے پاس جانے سے نہیں روک پائی۔
"کیسی ہو میرب؟ اپنی کیا حالت بنالی ہے؟" انہوں نے فکرمندی سے مرجھائی ہوئی میرب کی طرف دیکھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟ اتنے دن نظر ہی نہیں آئیں۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"میں صبا کے پاس لاہور گئی تھی۔ داؤد کی پوسٹنگ لاہور ہوگئی ہے نا۔" انہوں نے نگاہیں چرا کر کہا۔ میرب خاموشی سے ان کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ محبت کی بساط الٹ چکی ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"داؤد تمہارے لیے سب سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے مگر اس دن۔!" انہوں نے گہری سانس لے کر ساری بات بتائی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ یہ سب داؤد کو بتانا چاہتی تھی مگر مناسب وقت پر۔ اس سے پہلے ہی سچ جان کر وہ بدگمان ہو کر یہاں سے چلا گیا۔

"تمہارے ماضی کی ایک بھول، تمہارے حال کے لیے داغ بن گئی ہے۔" انہوں نے افسوس سے کہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"جب دادو کا انتقال ہوا تب میرے میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے۔ ان کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ اسی ذہنی حالت کے ساتھ امتحان دیے اور اس کے بعد ڈیڈ مجھے اپنے ساتھ شہر لے آئے۔ جہاں آکر مجھے ایسا لگا جیسے میرا دوسرا جنم ہے۔ دادو کی بتائی، سکھائی تربیت میرے لیے طعنہ بن گئی۔ مما کو میری شخصیت پرفیکٹ چاہیے تھی تاکہ وہ فخر سے مجھے اپنے سرکل میں متعارف کرواسکیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں ہر لحاظ سے ڈل ثابت ہوئی۔ امتحان کا نتیجہ آیا تو بمشکل پاس ہوئی۔ میرا داخلہ تعلقات کی بنیاد پر ڈیڈ نے کروا تو دیا مگر ایک عام ماحول میں پلنے بڑھنے والی لڑکی کے لیے، اپر کلاس کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پائی۔ میں ایک ایسا پودا تھی جسے بالکل الگ اور ناموافق ماحول میں پھلنے پھولنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ جہاں قدم قدم پر میری عزت نفس کو کچلا جاتا، میرا مذاق بنتا۔ مجھ پر ان سب کا دباؤ اتنا بڑا کہ مجھے یہ زندگی بوجھ لگنے لگی۔ میں ڈپریشن کا شکار ہوگئی۔ مجھے سننے، سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ کوئی ہمدرد نہیں سوائے دادو کے! اس لیے میں ان سے ملنے کی دعائیں مانگتی۔ جس رات وہ مجھے خواب میں نظر آتی میں سارا دن خوش رہتی۔ ایف۔ اے میں میرے مارکس بہت کم آئے جس کی وجہ سے مما نے ملازموں کے سامنے مجھ پر بہت غصہ ہوئیں۔ میں نے اکثر سب کو خود پر ہنستے دیکھا تھا۔ میری بہن مجھ سے بات نہیں کرتی اور بھائی مجھ سے انجان تھا۔ اس گھر میں میرا کوئی نہیں تھا۔ سب اجنبی تھے جن سے بس خون کا رشتہ تھا۔ میں شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ نہ نیند آتی تھی اور نہ سکون ملتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر رونا، اپنی ذات سب پر بوجھ اور بیکار لگتی تھی۔ مایوسی کے ان روز و شب میں مجھے یہ ہی بہتر لگا کہ میں سب سے دور، اپنی دادو کے پاس چلی جاؤں جو مجھ سے پیار کرتی تھیں۔ میری فکر کرتیں۔ ایک رات اسی کیفیت میں، اپنے ہاتھ کی رگیں کاٹ کر زندگی سے نجات پانے کی کوشش کی مگر مجھے بچالیا گیا۔ اس واقعے نے میرے والدین کو ڈرا دیا۔ خاص طور پر ڈیڈ کو۔ انہیں اپنی لاپروائی، اپنی زیادتی کا احساس ہونے لگا۔ اس کے بعد میرے علاج پر بہت توجہ دی گئی۔ میں ڈاکٹر عائشہ کے ذہنی بحالی کے ادارے میں چھ مہینے رہی۔ جہاں رہ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ڈاکٹر عائشہ نے مجھے امید کا وہ سرا تھمایا جو رب کی محبت سے جڑا ہوا ہے۔ میں نے اس سرے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ میں مانتی ہوں کہ مجھ سے گناہ ہوا مگر میں اللہ سے بہت بار اس فعل کی معافی مانگی ہے۔ والدین کی محبت سے محرومی، اپنے بہن بھائی میں پرایا بن کر رہنا، چاہے روح کو کتنے ہی کچوکے لگاتا ہے مگر زندگی تب بھی پیاری ہے کیوں کہ یہ نایاب تحفہ ہے۔ داؤد کی محبت نے میرے احساس محرومی کی بنجر زمین پر کئی خوش رنگ کے پھول کھلا دیے ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی بہت ہے کہ کسی نے مجھے چاہا۔ باقی میرا نصیب کیونکہ محبت خودغرض نہیں ہوتی جو محبوب کی خوشی نہ دیکھے۔" وہ یقین سے مسکرائی۔

"تم انمول ہو۔ جس کے پاس احساس کی

دولت ہے، وہ سب سے بلند ہوتا ہے۔"

انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ میرب کو ایسا لگا جیسے دادو اس کے پاس ہے۔ داؤد کا فیصلہ چاہے کچھ بھی ہوتا، وہ مطمئن تھی کہ کبھی محبت اس پر بھی مہربان ہوئی تھی۔

☆☆☆

"آخر چاہتے کیا ہو؟ کتنی ہی اچھی اور خوب صورت لڑکیوں کے رشتے موجود ہیں مگر تم راضی نہیں ہوتے۔"

آج صبا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ نیوز چینل دیکھتے کرنل شجاع نے سنجیدہ نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ پچھلے تین مہینے سے وہ ہر روز یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ نہ داؤد کی چپ ٹوٹی اور نہ صبا کی ضد ختم ہوئی۔ داؤد نے خاموشی اور ضد کو اپنی ڈھال بنالیا تھا جس سے لڑتے لڑتے صبا تھکنے لگی تھیں اور اس کی ہار سے کرنل شجاع بے خبر نہیں تھے۔

"میرے خیال سے اب فیصلہ ہو جانا چاہیے۔" کرنل شجاع نے پہلی بار اس معاملے میں لب کشائی کی۔ دونوں چونک گئے۔

"کیا مطلب؟" صبا نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"داؤد بچہ نہیں ہے اگر وہ کسی کو پسند کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔" ان کا انداز دوٹوک تھا۔

"آپ نہیں جانتے وہ لڑکی پاگل۔۔!" صبا نے جھنجھلا کر کہنا چاہا۔

"وہ پاگل نہیں ہے۔" داؤد نے سخت لہجے میں ٹوکا۔

"مگر تمہیں ضرور پاگل کردے گی اگر اسی طرح اس کے جوگ میں رہے۔" وہ تلملائی۔

"آپ صرف میری محبت کے خلاف ہیں؟ ذیشان نے بھی محبت کی شادی کی۔ آپ کی اور بابا کی بھی لو میرج تھی۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

"میں محبت میں اندھی نہیں تھی۔ تمہارے باپ اور میری جوڑی کتنی شاندار تھی۔ لوگ ہماری مثالیں دیتے۔" صبا نے گردن اکڑا کر کہا۔ کرنل شجاع طنزیہ مسکرائے۔

"تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہماری جوڑی، ہماری محبت مثالی تھی......" انہوں نے "تھی" پر زور دیا۔ "کیونکہ اس وقت میں پوری شان سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ صبا نے محبت تو ایک فوجی سے کی مگر وہ اس محبت کو نبھانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔"

ان کے لہجے میں درد تھا۔

داؤد نے لب بھینچ لیے۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اپنے باپ کو اس درد سے لڑتے دیکھ رہا تھا۔

"آپ مجھے الزام دے رہے ہیں؟" صبا نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ مسکرائے۔

"نہیں! اپنی قسمت کو! مجھے یا تمہیں کیا پتا تھا کہ ایک محاذ پر لڑتے ہوئے میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہو کر وہیل چیئر پر آ بیٹھوں گا، اور تم نے بھی شاید اس شخص نے شادی کرتے ہوئے کب سوچا تھا کہ جب وہ معذور ہو کر تمہارے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا تو کتنا برا لگے گا؟ ہم کب اپنی قسمت کا لکھا پڑھ سکتے ہیں؟ اگر پڑھ سکتے تو جان جاتے کہ اکثر محبتیں، آزمائش کے اونچے پہاڑ سر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ ایسی ہی صبا اور شجاع کی محبت بھی تھی۔ کھوکھلی اور صرف اچھے وقت کی ساتھی۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائے۔

صبا ساکت رہ گئی۔ اتنے سالوں میں کبھی انہوں نے اس کی بے اعتنائی کا شکوہ نہیں کیا۔ یہ سچ تھا کہ صبا جیسی پرفیکشن پر مرنے والی عورت کے لیے، ایک معذور شوہر کے ساتھ چلنا مشکل امر تھا۔ اس کے بدلے رویے نے انہیں تنہائی پسند بنا دیا۔

داؤد جو ہمیشہ سے باپ کے قریب رہا، وہ ان کے دکھ سے واقف تھا۔ اس لیے وہ شادی جیسے رشتے سے دور رہنے کی کوشش کرتا رہا مگر میرب سے ملنے کے بعد، اس کی سوچ بدل گئی۔ صبا، بیٹے اور شوہر کے سامنے خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی

نگاہیں شرمندگی سے جھک گئیں۔
ہماری ذات کا منفی اور بدنما پہلو اگر سب کے سامنے آ جائے تو اس سچ کے سامنے ہم کسی سے کیا، خود سے بھی نگاہ نہیں ملا سکتے ہیں۔
کرنل شجاع اپنی وہیل چیئر کا بٹن دبا کر وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

میرب نرمی سے سارہ کے نرم ملائم سلکی بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ آج وہ انہیں سہارا دے کر لان میں لے آئی تھی۔ دو ہفتے پہلے وہ سیڑھیوں سے گرنے کی وجہ سے اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھی تھیں۔ پلاستر کی وجہ سے انہیں مخصوص مدت تک گھر میں رہنا تھا۔ ان کی سب ایکٹیویٹیز، دوستیاں، پارٹیاں چھوٹ گئیں۔ ہمایوں کی اپنی مصروفیت تھیں۔ حسن اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جا چکا تھا۔ مہک اپنی دنیا میں مگن تھی۔ گھر میں صرف میرب ہی تھی جو ان کا خیال ذمہ داری سے رکھتی۔ ان دو ہفتوں میں میرب نے جتنی محبت سے اس کی فکر کی، وہ حیران رہ گئی۔ تب انہیں سمجھ میں آیا کہ رفعت جہاں کیوں میرب کو انمول کہتی ہیں۔
ان تین ہفتوں میں ماں بیٹی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ اس دوران سارہ کے اندر یہ احساس شدت سے جاگا کہ وہ میرب کے بچپن کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ وہ نہیں جانتیں کہ میرب کس بات پر ہنستی تھی، کس بات پر روتی، کون سی چیز اسے خوش کرتی، وہ اپنی فرمائشیں کیسے پوری کرواتی؟ کیا اس کے خواب، ہنسی بھی جگنوؤں جیسی روشن اور تتلیوں جیسی رنگین تھی؟
وہ بے چینی سے اس کے بچپن کے قصے پوچھتیں۔ میرب خوشی سے دادو کے گھر کی باتیں بتاتی۔ وہ حیران ہوتیں کہ ان کی ساس نے میرب کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ میرب کے بولنے کا دھیما انداز، طریقے سے اٹھنا بیٹھنا، تہذیب اور تمیز سے چلنا پھرنا، بھلے وہ مہک کی طرح اپ ڈیٹ نہیں تھی مگر اس کی شخصیت میں وقار تھا۔ جو پرانے زمانے کے لوگوں کی شخصیت کا خاص حصہ ہوتا تھا۔ سب سے بڑی بات اسے رشتوں کو نبھانا آتا تھا۔ ان سب کے برے سلوک کے باوجود بھی وہ سب کی فکر کرتی، ان کا خیال رکھتی۔ وہ اعلیٰ ظرف تھی کیونکہ اس نے عصمت بیگم سے یہی سیکھا تھا۔ سارہ کی آنکھوں پر بندھی پٹی سرک چکی تھی۔ وہ ماضی کی سوچ پر شرمندہ تھیں۔ وہ میرب کی ماں تو کئی سال پہلے دن بن گئی تھیں مگر اس کے لیے ممتا اب جاگی تھی۔ رفعت جہاں، بلقیس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ منظر دیکھ کر چونک گئیں۔ انہیں انہیں اب سمجھ میں آیا کہ آج کل میرب کہاں مصروف ہوتی ہے جو ان سے ملنے نہیں آ رہی تھی۔
انہیں آتا دیکھ کر سارہ خوشدلی سے مسکرائیں۔
"کیسی ہو سارہ بیٹی؟" انہوں نے پاس آ کر نرمی سے پوچھا۔
"اللہ کا شکر ہے اب تو بہت بہتر ہوں۔ امید ہے کہ جلد چلنے پھرنے لگوں گی۔" سارہ نے یقین سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میرب سے ہر روز بیک یارڈ میں ملنے، مل کر باغبانی کرنے کی عادت ہے۔ اس لیے اس کی غیر موجودگی نے پریشان کر دیا۔"
انہوں نے مسکرا کر میرب کی طرف دیکھا۔
"میرب بہت خوش قسمت ہے جسے اتنی سچی محبتیں ملی ہیں۔" سارہ نے خلوص دل سے اعتراف کیا۔
"میں کچھ دنوں تک صبا کے پاس لاہور جا رہی ہوں۔" رفعت جہاں اصل مدعا کی طرف آئیں۔ وہ دونوں چونک گئیں۔
"بڑی بیگم صاحبہ! داؤد بیٹے کی شادی کے سلسلے میں نا؟ افشاں بی بی اس دن ذکر کر رہی تھیں کہ ان کی شادی ہونے والی ہے۔" بلقیس نے چائے پیش کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔
سارہ نے اسے گھورا تو وہ گھبرا کر چلی گئی۔

میرب کے چہرے کے سب رنگ اڑ گئے۔ وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی اور دھیمی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہاں سے چلی گئی۔

رفعت جہاں خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

"میں پوری کوشش کروں گی کہ ان دونوں کے درمیان کی غلط فہمی کو دور کرسکوں۔" رفعت جہاں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو سارہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

ان کے جانے کے بعد سارہ فکرمندی سے میرب کے بارے میں سوچنے لگیں۔

"میرب کے لیے ذہنی دباؤ ٹھیک نہیں ہے۔" سارہ جہاں نے بے چین ہو کر خود کلامی کی۔ پہلے اپنی لاپروائی میں وہ اس کا نقصان کر بیٹھی تھیں، اس بار چوکنا رہنا ضروری تھا تاکہ کسی بڑے نقصان سے بچا جاسکے۔

☆☆☆

رفعت جہاں نے اپنی زندگی میں پہلی بار صبا کو اس حال میں دیکھا تھا۔ سادہ سے لباس میں ملبوس، بغیر میک اپ یا کسی آرائش کے وہ گم صم اپنے کمرے کے کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ انہیں لاہور آئے ایک ہفتہ ہو گیا۔ یہاں آکر وہ حیران رہ گئیں۔ داؤد اپنی ڈیوٹی کی وجہ سے گھر میں کم ہی نظر آتا۔ شجاع تو ایک مدت ہوئی دنیا سے کٹ چکے تھے۔ ذیشان پہلے ہی نوکری کے سلسلے میں بیوی اور بیٹی سمیت کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ گھر میں عجیب سی خاموشی اور وحشت چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دنوں میں گھبرا گئیں۔ آج انہوں نے صبا سے بات کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس لیے اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ صبا شیشے سے نظر آتے سرسبز باغ دیکھ رہی تھی۔ ماں کے پکارنے پر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا مجھے نہیں بتاؤ گی کہ تمہارے اندر، ذات کی جنگ میں کس کی مات ہوئی ہے؟" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے صبا کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں ایک دم بھیگ گئیں۔

"آپ جانتی ہیں کہ ہار آپ کی بیٹی کا مقدر بنی ہے۔ آپ سب جانتی تھیں بہت پہلے سے اس لیے مجھے سمجھاتی تھیں مگر میں۔!" اس نے پچھتاوے سے کہتے ہوئے ہاتھ ملے۔ "جس شخص کی محبت نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا، ایک عام عورت سے محبوبہ میں بدل دیا۔ وہ شخص، وہ جذبہ ساری عمر ہی کتنا خاص رہتا ہے۔ میری لیے شجاع کی محبت ایسی ہی تھی۔ وہ بہترین شوہر، بہترین باپ بنے مگر میں! بہت کمزور نکلی۔ ان سے محبت کے، ساتھ نبھانے کے بہت دعوے کیے تھے اور جب وقت آیا تو ان کی تکلیف میں ساتھ نہیں دے سکی۔ ان کی معذوری، میرے لیے شرمندگی بن گئی۔ میں جسے ہر طرف سے تعریف وستائش سننے کی عادت تھی، کسی کے منہ سے اپنے لیے ترس یا ہمدردی بھرے الفاظ نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس سب میں شجاع کہاں رہ گئے۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ میری خود غرضی کو پہلے قدم پر جان کر، کوئی شکوہ کیے بغیر خاموشی سے اپنی تنہائی میں گم ہو گئے۔" وہ کہتے ہوئے رو پڑی۔

رفعت جہاں جو اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے چپ کروانے جارہی تھیں۔ ایک دم چونک گئیں۔ نیم وا دروازے کو کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ وہیل چیئر کی آواز پر صبا نے چونک کر دیکھا۔ کرنل شجاع کی آنکھیں نم اور چہرہ سرخ تھا۔ ان کی گود میں سفید رنگ کا کاغذ پڑا ہوا تھا۔ صبا تیزی سے اٹھ کر ان کے پاس آئی اور سامنے آکر رک گئی۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور پھر دونوں کی آنکھوں سے سالوں کی بدگمانی آنسو بن کر بہہ نکلی۔ صبا روتے ہوئے ان کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی اور گھٹنے پر ماتھا ٹیک کر رونے لگی۔

"میری سزا چاہے کتنی بھی بڑی ہو مگر آپ کی محبت سے بڑی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ مجھے معاف کر دیں۔"

اس کی آواز میں پچھتاوے تھے۔ رفعت جہاں

نے اس منظر کو دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے باہر جانے لگیں جب شجاع نے انہیں روکا۔

"اماں! میں نے آپ کی بیٹی کو اپنی محبت کے صدقے معاف کیا مگر میرے بیٹے کو محبت کرنے کی سزا مت دیں، ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے دور چلا جائے گا۔ اس کی مرضی اور خواہش پر، بارڈر پر پوسٹنگ کے آرڈر......" کرنل شجاع نے لب بھینچ کر کہا تو صبا نے فوراً سر اٹھایا۔ شجاع نے گود میں رکھا لیٹر اس کی طرف بڑھایا اور خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔ رفعت جہاں اور صبا پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

پھر اٹھا یاد کے آنگن سے اداسی کا دھواں
کسی نے طاقوں میں جلا کر مری شامیں رکھ دیں

آج بھی شام اداس تھی۔ وہ خاموشی سے طویل اور خاموش راستوں پر چلتی سبز پتوں کو چھیڑتی ہوا کی سرگوشیاں سنتی کسی آس کی ڈور تھامے اس کے گھر کے پاس سے گزرتی مگر گیٹ پر لگا تالا بالکل کسی کی چپ جیسا لگتا تھا جس کی چابی اس کے پاس نہیں تھی۔ مغرب کے وقت وہ اپنے گیٹ کے پاس پہنچی تو چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ میرب کی نگاہ، رفعت جہاں کے گھر کی دہلیز پر ٹھہر گئی تھی جہاں کوئی کھڑا ہو کر، اس کے بحفاظت گیٹ کے اندر چلے جانے کا انتظار کرتا تھا۔ دل میں درد کی ٹیس اٹھی۔ آنسو ضبط کرتی، وہ تیزی سے اندر چلی گئی تو لاؤنج میں تک سک سے تیار سارہ سے ملاقات ہوگئی جو صحت مند ہونے کے بعد سے اپنے ادھورے رہ جانے والے کاموں اور دوست احباب سے ملاقاتیں کر رہی تھیں۔ میرب کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"مسز شہناز کے گھر پارٹی ہے۔ تم ساتھ چلوگی؟" انہوں نے دوستانہ انداز میں پوچھا تو حسب توقع میرب نے نفی میں سر ہلایا۔

"اکیلی گھر میں کیا کروگی؟ مہک بھی میرے ساتھ جارہی ہے۔" انہوں نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ فکر مت کریں۔ مجھے عادت ہے اکیلے رہنے کی۔"

اس نے بظاہر سادگی میں ایک جملہ کہا تھا مگر ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ میرب اپنے ہی دھیان میں کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ پچھتاوے کے احساس میں گھرے لب کاٹنے لگیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ زندگی میں ایسا بھی وقت آئے گا کہ وہ خود سے نگاہیں نہیں ملا پائیں گی۔

"کاش! میں وقت کو واپس موڑ سکتی۔" بے بسی کے احساس نے انہیں مزید کمزور بنا دیا تھا۔

☆☆☆

"نانو! آپ اتنی جلدی واپس جارہی ہیں؟"

داؤد شام میں گھر آیا تو افشاں مامی نے بتایا کہ وہ لوگ کل واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ سیدھا رفعت جہاں کے کمرے میں آیا جو اپنا بیگ پیک کر رہی تھیں۔ انہوں نے سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی اور خاموشی سے اپنا کام کرنے لگیں۔ وہ ٹھٹکا۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے نظرانداز کر دیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ان کے ہاتھ تھام کر رخ اپنی طرف موڑا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اسے دھچکا لگا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تم اب سمجھدار ہو۔ اپنے فیصلے خود کرسکتے ہو۔ چاہے میرب کو چھوڑنے کا ہو یا ہم سب کو چھوڑ کر دور جانے کا۔"

انہوں نے سختی سے کہا اور اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

"سب کی طرح آپ بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں نے میرب کی محبت سے منہ نہیں موڑا ہے۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"تو پھر؟" انہوں نے گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ جو سر جھکائے کھڑا

تھا جیسے نگاہیں نہیں ملانا چاہتا ہو۔

''میں جب پہلی بار اس سے ملا تو تب ہی جان گیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کسی مشکل یا تکلیف کا شکار ہے۔ ذہنی مرض بظاہر نظر نہیں آتے مگر تھوڑا سا غور کرنے پر، متاثر شخص کے رویے سے ظاہر ضرور ہو جاتے ہیں۔ میرب کا تنہا رہنا، کسی پر اعتبار نہ کرنا، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے الگ نظر آنا، اکیلے بیٹھ کر رونا یا روتے ہوئے ڈائری لکھنا۔ اور بھی ایسی بہت سی باتیں ہیں جو چیخ چیخ کر یہ اعلان کرتی تھیں کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہے......'' داؤد نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا تو وہ چونکیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر درد تھا۔

''داؤد!'' وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھیں اور گلے سے لگا لیا۔ وہ مسکرا دیا۔ جانتا تھا کہ وہ اس سے کبھی ناراض نہیں رہ سکتی ہیں۔

''نانو جان! میرب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھی مجھے اندازہ تھا کہ میرے دل میں پنپنے والا جذبہ دوستی نہیں، محبت ہے۔ اس کا اعتبار حاصل کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا مگر وہ مجھ پر اعتبار کرنے لگی کیونکہ اس کی زندگی میں کوئی بھی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں تھا جو اسے سمجھ سکتا۔ میرب اپنوں کی طرف سے رد کی ہوئی لڑکی ہے۔ میں اس کی زندگی میں خوشیوں کی وہ بہار لانا چاہتا تھا، جو ماضی کے کسی دکھ کی دھوپ سے دور رہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ پر اندھا اعتبار کرتی ہے۔ مجھ سے اپنی تنہائی، اپنی اداسی بانٹتی ہے مگر مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ اس کے ماضی میں کچھ ایسا بھی چھپا ہوگا جو میرے لیے صدمے کا باعث بنے گا۔ مما نے جب اس کے ماضی کے بارے میں بتایا تو سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی، میں یہ سچ سن کر برداشت نہیں کر سکا اور اس سے ملے بغیر یہاں چلا آیا......'' اس نے گہری سانس لی۔ ''سچ کی کڑواہٹ اپنی جگہ تھی مگر اس سے جدا ہونے کی اذیت نے مجھے بتایا کہ محبت کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ وہ اپنے دائرے میں قدم رکھنے والوں کو واپس پلٹنے نہیں دیتی۔ میں بھی واپس نہیں پلٹ سکا۔ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہوئے ہار گیا ہوں مگر میں ہار کر بھی اسے بتا نہیں سکتا کیوں ہماری محبت کے درمیان، میری ماں کی مرضی پہاڑ بن کر کھڑی ہے۔ والدین سے پیارا اور خوب صورت رشتہ کوئی نہیں ہوتا اور میرے لیے یہ رشتہ بہت قیمتی ہے۔ میں اپنا دل تو توڑ سکتا ہوں مگر ان کا نہیں! میرب کو بھلا نہیں سکتا، اسے پا نہیں سکتا، ماں کو منا نہیں سکتا۔ بھلا کیپٹن داؤد سے زیادہ ناکام اور بزدل شخص کون ہوگا؟'' بے بسی سے کہتے ہوئے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''اس لیے نانو جان! مجھے یہ ہی بہتر لگا اپنے ادھورے وجود کے ساتھ سب سے دور چلا جاؤں۔ رشتوں کی بساط پر ضرور ہارا ہوں مگر مٹی کی حفاظت جان پر کھیل کر بھی کر سکتا ہوں۔ آپ کا نواسا اب اتنا بھی کمزور نہیں!''

نم آنکھوں کے ساتھ ان کے چہرے پر بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دیں۔

''مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ آپ سب اپنے اپنے ادھورے وجود، ناکام تمناؤں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود کتنے مکمل ہیں کیونکہ آپ سب کے پاس احساس اور محبت کی دولت ہے اور میرے پاس کیا ہے؟ شوہر، بیٹے، ماں سب کی ناراضی!''

صبا اداس لہجے میں کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے جو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ کچھ دیر داؤد کے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر مسکرا دی۔

''اپنے باپ جیسے ہو۔ محبت کرنا اور اسے نبھانا جانتے ہو۔''

صبا نے نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا اور پھر بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ بیٹے کے چوڑے سینے سے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کئی دنوں سے برداشت کرتے، خود سے لڑتے، اپنے احتساب

کی جنگ لڑتے، وہ تھک چکی تھی۔ داؤد نے محبت سے ماں کا ماتھا چوما اور ان کے آنسوؤں صاف کیے۔

''میں ہار گئی ہوں۔ میں سب سے ہار گئی کیونکہ میں خودغرض ہوں۔'' صبا کو پچھتاوے سکون سے سانس نہیں لینے دے رہے تھے۔

''جن کے اتنے کڑیل جوان بیٹے ہوں، وہ مائیں ہارتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ مسکرایا۔

رفعت جہاں نے صبا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ صبا نے ماں کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ آج پہلی بار صبا کو ایسا لگا کہ وہ ان کا عکس ہی ہے۔

''تم ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تمہاری محبت کو خوشی سے دلہن بناؤں گی۔'' وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ داؤد نے بے یقینی سے دیکھا۔

''اتنے حیران مت ہو۔ تمہاری ماں بے وقوف ضرور ہے مگر دل کی بری نہیں۔''

کرنل شجاع نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بارعب انداز میں کہا۔ صبا نے حیرانی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کتنے عرصے کے بعد یہ آنکھیں اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

''مجھے یقین ہے اس بار محبت کے نہ بجھنے والے دیپ اس گھر میں جلیں گے۔'' رفعت جہاں نے مطمئن ہو کر کہا تو وہ سب مسکرا دیے۔

☆☆☆

''جاگ رہی ہو؟؟''

سائرہ نفیس ساڑھی میں ملبوس، نفاست سے تیار بہت گریس فل لگ رہی تھیں۔ آج انہیں ہمایوں کے ساتھ فیملی ڈنر پر جانا تھا۔ میرب جو کھڑکی کھولے بادل اور ہوا کی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی، چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی اور مسکرا دی۔

''آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔'' میرب نے متاثر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ سارہ جو غور سے اس کی ویران آنکھوں اور اجاڑ چہرے کو دیکھ کر دل میں گھبرا گئی تھیں بمشکل مسکرائیں۔ اس کے پاس آ کر نرمی سے گال تھپتھپایا۔

''میرب! تم اعصابی طور پر پہلے ہی ایک طویل اور مشکل جنگ لڑ چکی ہو۔ ویسے تم بالکل ٹھیک ہو مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے اندر کی ویرانی، تمہیں پھر سے ڈپریشن کی اندھی کھائی کی طرف لے جانے لگی ہے۔ تم مضبوط لڑکی ہو۔ اللہ پر یقین رکھنے والی۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں میری بچی۔''

سارہ نے کہتے ہوئے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ آج نجانے کیوں ان کا دل بھر آ رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھیں۔

''میں اس بار اندھیرے سے ہار نہیں مانوں گی۔ یہ وعدہ ہے آپ کی بیٹی کا۔''

اس نے پہلی بار یقین سے کہا تو سارہ کو اس کا ''آپ کی بیٹی'' کہنا بہت سکون دے گیا ایسے جیسے میرب نے دل سے انہیں معاف کر دیا تھا۔

''ہم جلدی واپس آنے کی کوشش کریں گے بلکہ واپس آ کر میں تمہارے ہاتھ کی مزے دار کافی پیئوں گی۔ کافی پیتے ہوئے ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ تم آرام کرو اور سنو......'' وہ کہتے ہوئے رکیں۔ ''ڈاکٹر عائشہ نے ڈپریشن کے علاج کے دوران تمہیں کچھ دوائیاں دی تھیں جو تمہاری الماری کے اوپر والے خانے میں رکھی ہوئی ہیں اگر ضرورت پڑے تو'' وہ کہتے ہوئے رک گئیں۔

میرب سمجھ کر سر ہلانے لگی۔ وہ خود بھی مایوسی کی اس اندھیرے غار میں جانے سے ڈرتی تھی جہاں امید نہیں تھی۔ وہ چلی گئی تو میرب اپنی رائٹنگ میز پر رکھی ڈائری کی طرف متوجہ ہو گئی۔ رات کی تنہائی، بارش، ٹھنڈی ہوا اور اس کی یاد! میرب کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب وہ لکھتے ہوئے تھک گئی تو بے اختیار چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''اس سے تو بہتر تھا میں پہلے ہی مر جاتی اور۔ !'' روتے ہوئے اس نے خودکلامی کی اور ایک دم

خوف زدہ ہو کر رک گئی۔
"ن۔ نہیں۔ میں۔ مرنے کی بات کیوں سوچ رہی ہوں......" وہ گھبرا گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ دیر ایسے ہی رہی تو وہ سچ میں خود کو نقصان پہنچا لے گی۔ وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھی۔ "میں کمزور نہیں ہوں۔ میں دوبارہ مایوسی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گی۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا تھا کہ دوائی ضروری ہے۔ مما نے بھی کہا ہے دوائی لے کر سو جاؤں۔"

وہ کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھی اور اوپر والے خانے سے دوائی کا باکس نکالا۔ اس نے جلدی سے اپنی دوائی نکالی، اسی وقت بجلی زور سے چمکی اور لائٹ چلی گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے باکس واپس رکھا۔ جب تک جنریٹر آن ہوا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر سائیڈ میز پر رکھا گلاس اٹھا چکی تھی۔

"آپ کو کچھ چاہیے؟" اچانک بے دھیانی میں دروازہ کھول کر بلقیس اندر داخل ہوئی۔ میرب ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر نفی میں سر ہلا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ بلقیس کی نگاہیں اس کے ہاتھ میں موجود گولیوں پر اٹک گئیں۔

"مم گر۔!" وہ ہچکچائی۔

میرب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ تیزی سے واپس مڑی۔ میرب نے جلدی سے گولیاں منہ میں ڈال کر پانی پی کر گلاس واپس رکھا۔ جاتے ہوئے بلقیس نے یہ منظر بہت غور سے دیکھا تھا۔

اس نے کچھ دیر گہری سانس لی اور پھر مطمئن ہو کر دوبارہ اٹھ کر میز کے پاس گئی اور اپنی ڈائری اٹھا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی۔ اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ دل گھبرانے لگا۔

پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے؟ مما بھی ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ مہک شاید سو رہی ہو گی۔ اس نے باری باری سب کے بارے میں سوچا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔ بجلی کی آنکھ مچولی جاری تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے کمرے کی زیادہ تر روشنیاں بجھا دی تھیں۔ کافی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ اس کی بے سکونی بڑھ رہی تھی۔ تھک کر بستر پر نیم دراز ہو گئی اور گہری سانسیں لیں۔ عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ اس کے دل کو گھیر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور میز پر رکھی اپنی ڈائری اٹھالی۔ یہ ڈائری اس کی واحد ہمراز تھی۔ جس کی ضرورت آج کل شدت سے تھی۔ بادل کی گرج، چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش برسنے کی آوازیں سنتے ہوئے، وہ رک رک کر کچھ لکھ رہی تھی۔ کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی۔ پتا نہیں! سب کہاں رہ گئے؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھانا چاہا جب ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سینے پر کوئی بھاری چیز رکھ دی ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بستر پر نیم دراز، نور بہتی آنکھوں کے ساتھ اس نے سینے پر دھری ڈائری کو محسوس کیا تھا۔ ایسے جیسے اس میں مقید ماضی کے شفیق لمس اسے سہلا رہے ہوں......

☆☆☆

ہمیں تلاش نہ کرنا کبھی زمانوں میں
ہم ایک شب کا فسانہ تھے، بس تمام ہوئے

"سوری کچھ دیر ہو گئی اور۔!"

سارہ اپنی دھن میں بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نیم اندھیرے کمرے میں داخل ہوتے ہی عجیب سے احساس نے انہیں گھیر لیا۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تو جلدی سے بوکھلا کر کمرے کی سب روشنیاں جلائیں اور تیزی سے میرب کی طرف بڑھیں جو نیم دراز تھی۔ اس کے پاس آ کر وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔

"مم۔م۔میرب۔!"

وہ خوف سے ہکلائیں۔ کانپتے ہاتھوں سے سفید چہرے والی میرب کو چھوا اور ان کی چیخوں سے کمرا گونج اٹھا۔ ہمایوں جو اسی طرف آ رہے تھے۔ سارہ کی چیخوں پر بدحواس ہو کر بھاگے۔ کمرے میں

داخل ہوتے ہی وہ سب سمجھ گئے اور تیزی سے میرب کے بے جان جسم کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر باہر کی طرف بھاگے۔ ان کے پیچھے سارہ بھی تھیں۔ میرب سے چاہے کتنا بھی دور رہی ہوں مگر ماں کا دل آنے والے لمحے کی آہٹ کو پہچان کر کئی دنوں سے بے چین تھا۔ ان کا وہم درست ثابت ہوا۔

"میرب نے خودکشی کر لی۔"

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ ہمایوں کا چہرہ ضبط کرنے سے سرخ تھا۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے میرب کی زندگی بچ جانے کی دعا کرنے لگے مگر ہمیشہ کی طرح، میرب کے حق میں ان کی دعا بھی دیر سے اوپر پہنچی تھی جب فیصلہ ہو بھی چکا تھا۔

☆☆☆

"میرب نے خودکشی کیوں کی؟ وہ اتنی کمزور کیوں نکلیں؟"

زویا جس نے ساری رات جاگ کر میرب کی ڈائری پڑھی تھی۔ صبح سویرے، کندھوں کے گرد شال لپیٹ کر وہ فجر کی نماز کے بعد، چہل قدمی کرتے میجر داؤد کے پاس آئی۔ جن کی آنکھیں بھی ساری رات جاگنے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ زویا روئی ہوئی آنکھوں اور سرخ ہوئی ناک کے ساتھ، بوجھل قدموں سے ان کا ساتھ دینے لگی۔ داؤد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ زویا اپنی دھن میں ہی بول رہی تھی۔

"مجھے آج بھی دھندلا سا وہ پارک یاد ہے جہاں ہر شام میں آپ کی انگلی پکڑ کر جاتی تھی۔ پہلی بار انہوں نے مجھے گرنے سے بچایا تھا نا۔"

زویا کو وہ لمحہ یاد تھا جب میرب نے اسے پیار سے بہلاتے ہوئے چپ کروایا۔ اس شام ہی پہلی بار داؤد اور میرب ہم کلام ہوئے تھے۔

"تم بہت چھوٹی تھیں اس وقت۔ اتنی پرانی باتیں کیسے یاد ہیں؟" وہ حیران ہوئے۔ زویا اداسی سے مسکرائی۔

"کیونکہ میرب کی طرح زویا کی زندگی میں بھی کسی کی چاہت، فکر اور محبت کے لمحے گنے چنے ہیں۔ میں جو اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی۔ میرے وجود کے گرد سب کی خوشیاں گھومتی تھیں مگر میری ماں کے مرنے اور باپ کی دوسری شادی کرنے سے سب کچھ بدل گیا۔

آپ تو اکثر بارڈر پر ہوتے تھے۔ مما کے بعد دادا ابو اور دادی امی نے میرا بہت خیال رکھا۔ ان کے جانے کے بعد کوئی بھی میری فکر کرنے والا نہیں رہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

داؤد کے دل کو تکلیف ہوئی۔ اس نے نرمی سے زویا کو خود سے لگا لیا۔

"میں بھی تمہارا باپ ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ میرب کی اچانک موت نے مجھے تم سب سے دور کر دیا تھا۔ میں اپنے غم میں کسی کی خبر نہیں رکھ سکا۔ محبت کے محاذ پر ہارا شخص، جنگ کے میدان میں سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا رہا۔ میری بہادری، میری شجاعت پر کئی میڈل، کئی تمغے ملے مگر دل کا وہ زخم ہمیشہ ناسور بن کر رستا رہا۔"

انہوں نے مدھم لہجے میں کہا تو زویا نے سر اٹھا کر ان کے اداس چہرے کی طرف دیکھا۔

"دادو اکثر آپ کا ذکر کرتیں، آپ کو یاد کرتیں۔ جب ایک محاذ پر آپ کے شدید زخمی ہونے کی خبر آئی تو وہ بہت روئی تھیں۔ آپ کی جان تو بچ گئی مگر جب آپ گھر واپس آئے تو!" زویا نے دکھ سے ان کی بیساکھی کی طرف دیکھا۔ وہ فرائض کی ادائی کے دوران اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے تھے۔ داؤد مسکرا دیے۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرا وجود کا کوئی حصہ تو اس مٹی کی حفاظت کے کام آیا۔ خواہش تو شہادت کی تھی مگر!" انہوں نے گہری سانس لی۔

دونوں چلتے ہوئے کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں بی بی گل ان کے لیے چائے لے آئیں۔ دونوں کو ہی چائے کی طلب شدت سے ہو

رہی تھی۔ چائے پیتے ہوئے زویا گھنے درختوں پر پھدکتی، صبح سویرے چہچہاتی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔
''بابا! کیا آپ نے میرب کی خودکشی کی وجہ سے شادی نہیں کی اور سب سے دور یہاں آ کر بس گئے۔'' اس نے اداسی سے پوچھا۔
داؤد کچھ لمحے خاموشی سے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتے رہے اور پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
''میرب نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ!''
وہ مدھم لہجے میں بتانے لگے۔ زویا حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ محبت کی داستان کتنی طلسم زدہ اور مبہوت کر دینے والی ہوتی ہے۔ ہمارے اندازوں سے الگ اور منفرد!

☆☆☆

اس کے شہر کی طرف واپس جاتے ہی وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھا۔ وہ تصور میں کئی بار میرب کے حیران چہرے کے بارے میں سوچ چکا تھا مگر یہ خیال اسے خوشی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے وجود کی بے چینی اور من میں پھیلتی سرد خاموشی سے خائف تھا۔ راستہ بے چینی سے کٹا۔ وہ جب سب کے ساتھ وہاں پہنچا تو ہمایوں کے گھر کے باہر جمع لوگ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ رفعت جہاں اور افشاں بھی حیران تھیں جبکہ صبا اور شجاع ناسمجھی کے عالم میں ان کے چہرے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ خواتین اندر چلی گئیں۔ داؤد کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے جسم میں جان نہیں ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن نہیں سنائی دے رہی تھی۔
''داؤد!'' اس نے پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ شجاع وہیل چیئر پر بیٹھا اس کے گاڑی سے نیچے اترنے کا منتظر۔ باپ کے چہرے پر انہونی درج تھی۔ داؤد نے نفی میں سر ہلایا۔
''بابا! ہم واپس چلتے ہیں۔ پھر کسی دن آ جائیں گے۔'' اس نے جلدی سے کہا جیسے یہاں سے جاتے ہی سب پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔
''داؤد! اس کا آخری سفر ہے۔ دعا کے سرخ پھول جا میں''
کرنل شجاع ضبط کرتے ہوئے بھی آبدیدہ ہو گئے۔ اسی وقت سامنے سے روتی ہوئی رفعت جہاں آئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اس سے لپٹ کر روتی رہیں۔ اس میں حرکت نہیں ہوئی۔ جنازہ اٹھنے کا وقت ہوا تو سب اندر چلے گئے مگر وہ خاموشی سے سڑک کنارے لگے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ وہ میرب کو آخری بار نہیں دیکھنا چاہتا تھا کیوں کہ وہ یہ حق نہیں رکھتا تھا۔ وہ گم صم کھڑا تھا جب لوگوں کے ہجوم میں اس کا جنازہ گزرا۔ ان کے آگے جاتے ہی وہ بھی گم صم سا پیچھے چل پڑا۔ اس کی تدفین کے وقت بھی وہ قبرستان میں موجود تھا مگر وہ اس کی قبر کے پاس نہیں آیا۔ سب کے وہاں کے جانے کے بعد بھی وہ دور کھڑا، نئی بنی قبر کو تکتا رہا۔ وہ اس کی موت پر نہیں رویا تھا۔ وہ رونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ رونے کے لیے اسے پہلے یہ ماننا ضروری تھا کہ وہ سچ مر گئی ہے۔
''تم نے میرا اعتبار، میرا انتظار نہیں کیا۔ مجھے یہ احساس کبھی جینے نہیں دے گا۔''
بے بسی سے کہتا ہوا وہ گھٹنوں کے بل مٹی پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ کتنی ہی دیر ایسے گزر گئی جب اسے ڈھونڈتے ہوئے کرنل شجاع، ڈرائیور کے ساتھ وہاں پہنچے۔ داؤد کو بہت مشکل سے گھر لائے۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کر رہا تھا اور کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سب جو اس کی خوشی کو دلہن بنانے آئے تھے، حیران و پریشان بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

''ایک سال اتنی جلدی گزر گیا؟'' رفعت جہاں کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ وہ اداس نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"کوئی ہم سے پوچھے یہ سال کیسے گزارا ہے۔ ہر پل اس کی یاد، اس کا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنا رہا۔ میری میرب، مجھ سے دور چلی گئی۔ میری اپنی حماقت سے۔!" وہ کہتے ہوئے رو پڑیں۔

آج میرب کی پہلی برسی کے موقع پر وہ سارہ سے ملنے آئیں جس نے گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا تھا۔ گزرے ایک سال نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ سارہ کا سدا بہار حسن، غم کے سوز میں ڈھل گیا۔ ہر وقت خود کو سجانے سنوارنے، اپنے آپ سے یکسر بیگانہ ہو چکی تھیں۔ سادہ حلیے میں ملبوس، نم آنکھیں لیے، وہ سوشل ورک کر رہی تھیں تا کہ میرب کی روح کو ثواب پہنچے۔ مہک کے لیے بھی میرب کی اچانک موت صدمہ تھی۔ اسے لگتا کہ میرب کے تنہا رہ جانے میں کسی حد تک وہ بھی ذمہ دار تھی جس نے کبھی بہن سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمایوں، سارہ، مہک، حسن سب اپنی اپنی جگہ خود کو الزام دیتے مگر بظاہر خاموش رہتے کہ ان کی زندگی میں یکدم آنے والی خاموشی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ تباہی بہت اندر تک ہوئی ہے۔

"خود کو سنبھالو بیٹی! میرب نے بہت جلد بازی سے کام لیا۔ اسے داؤد کے لوٹنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میرب کی خودکشی نے داؤد کو بھی احساس جرم میں ڈال دیا ہے کہ وہ سب سے دور اور الگ رہنے لگا ہے۔" انہوں نے دکھی لہجے میں کہا تو وہ چونک گئیں۔

"مجھے داؤد سے ملنا ہے۔ بہت ضروری۔" انہوں نے بے صبری سے کہا تو رفعت جہاں نے حیرانی سے دیکھا۔

"مگر وہ تو۔!" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آپ مجھے اس کا نمبر دیں۔ میں خود بات کروں گی۔ اس کی امانت میرے پاس ہے۔" سارہ نے بے چینی سے کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

آج پھر وہ اسی جگہ موجود تھا جہاں آخری بار وہ دونوں ملے تھے۔ پچھلے گزرے سال نے اس کی دنیا بدل دی تھی۔ وہ ہنسنا بھول گیا۔ ہر وقت چہرے پر سنجیدگی اور وحشت زدہ آنکھیں رت جگے کی وجہ سے سرخ رہتی۔ اس وقت بھی وہ بیزاری سے سلونی شام میں کسی کا انتظار کرتے ہوئے آس پاس دیکھ رہا تھا، جب اسے سامنے سے سارہ آتے ہوئے نظر آئیں۔ وہ اگر میرب کی کسی امانت کا ذکر فون پر نہ کرتیں تو داؤد کبھی اس شہر میں قدم نہ رکھتا۔ سارہ نے کالے رنگ کی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ ان کا سوگوار چہرہ، اسے دیکھ کر روشن ہوا۔ انہیں داؤد سے دلی لگاؤ تھا کیونکہ وہ ان کی مرحوم بیٹی کی پہلی اور آخری خوشی تھا۔ سارہ نے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بینچ پر بیٹھ گئیں۔ داؤد خاموش تھا۔

"میرب بہت خوش نصیب تھی کہ اسے تمہاری سچی محبت ملی۔" وہ دھیرے سے گویا ہوئیں۔

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"اور یہ خوش نصیبی اس کی خودکشی کی وجہ بن گئی؟ آپ سب چاہیں کچھ بھی کہیں مگر میں جانتا ہوں کہ میرب کو ڈپریشن کی آخری سرحد تک لے جانے والا میں ہی ہوں۔ میری محبت، میرا اس سے دور جانا، اسے اتنا کمزور کر گیا کہ اس نے اپنی زندگی ختم کر لی۔ میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔" بے بسی سے کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ بہت تکلیف میں لگ رہا تھا۔

سارہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "خود کو الزام دینا بند کرو بیٹا! میرب نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اس کی موت قدرتی تھی۔"

سارہ کے منہ سے نکلے لفظوں پر داؤد نے فوراً سر اٹھایا اور بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ کر

میں سر ہلانے لگا۔ وہ سمجھ گئیں۔

"مجھے اندازہ تھا تم نہیں مانو گے۔ اس لیے!" سارہ نے کہتے ہوئے اپنے چادر میں سے ایک فائل اور میرب کی ڈائری نکالی۔ "یہ میرب کی میڈیکل رپورٹس ہیں۔ میں میرب کی ذہنی حالت کی وجہ سے بہت پریشان تھی حالانکہ وہ بہت بدل گئی تھی مگر مجھے لگتا تھا کہ محبت میں ناکامی اسے دوبارہ ڈپریشن کا مریض بنا دے گی اور وہ پہلے کی طرح خود کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس رات میں نے ہی میرب کو اس کی میڈیسن استعمال کرنے کا کہا تھا۔ جس وقت میرب وہ دوائی نکال کر کھا رہی تھی تب ہی بلقیس کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی چونکہ میرب کی پہلی خودکشی کے بارے میں سب جانتے تھے تو وہ اس وقت بھی یہ ہی سمجھی مگر میرب کی موت کارڈیک اریسٹ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ تم جانتے ہو کہ یہ جان لیوا ہوتا ہے۔ تمہاری طرح پہلے ہم بھی غلط سمجھتے رہے مگر تمام ٹیسٹ اور فرانزک رپورٹس کے بعد سب کچھ سامنے آ گیا۔ وہ ادویات بھی لیبارٹری بھیجی گئی تھیں۔ اس فائل میں سب تفصیل موجود ہے۔"

سارہ نے کہتے ہوئے چادر سے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔ داؤد کے چہرے پر بھی آنسو کی لکیریں تھیں۔ پہلی بار میرب کے مرنے کے بعد اسے سکون ملا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی تھی۔ میرب کی محبت اور آخری دم تک یقین نے اس کے اندر زندگی پھونک دی۔ وہ دونوں شام ڈھلنے تک، وہاں بیٹھ کر میرب کا ذکر کرتے رہے۔ مغرب کی اذان سے کچھ پہلے وہ گھر جانے کے لیے اٹھے۔

"داؤد! میں میرب کی زندگی میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی مگر آج تمہیں سچ بتا کر میں سرخرو ہوں کہ اپنی بیٹی کے دامن پر لگا داغ دھو دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ مہینوں تک ہم یہاں سے چلے جائیں۔ ہمایوں، میرب کے بعد یہاں نہیں رہنا چاہتے جبکہ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی کہ میری میرب اس مٹی میں دفن ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دو بچے میرب کے دکھ سے ٹوٹ رہے ہیں۔ ہمیں ان کو سمیٹنا ہے۔ اس لیے کچھ مہینوں تک ہم سب امریکا شفٹ ہو جائیں گے یہ گھر بیچ کر۔ جہاں میرب کے ہاتھوں سے لگائے کئی پودے ہیں مگر!"

وہ مایوسی سے سر ہلاتے اپنے گیٹ کی طرف بڑھیں۔

"میرب کی سب یادوں کی وراثت مجھے سونپ دیں۔ میں آپ کا گھر خریدنے والا پہلا اور آخری شخص ہوں گا۔"

داؤد کی مضبوط آواز پر انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ آنکھوں میں تشکر کے آنسوؤں لیے وہ مسکرا دیں کہ اس نے ایک دکھی ماں کے دل پر محبت سے مرہم رکھا۔ وہ گیٹ کے اندر چلی گئیں۔ وہ تب تک کھڑا دور دیکھتا رہا جب تک میرب کا عکس نظر آتا رہا۔ اذان ہوئی تو وہ مسجد کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

"یعنی جس گھر میں، ہم موجود ہیں یہ میرب کا تھا۔" زویا سچ جان کر اچھل پڑی۔ وہ مسکرائے۔

"تھا نہیں۔ آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" وہ مطمئن انداز میں کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گئے۔ بیساکھی کے سہارے چلنے لگا۔

"باقی کی کہانی؟" وہ بے چین ہوئی۔ وہ رکے اور مڑ کر اسے گھورا۔

"باقی سب تمہیں پتا تو ہے احمق لڑکی!" وہ بڑبڑاتے وہاں سے جانے لگے جب کچھ یاد آنے پر رک گئے۔

"کچھ دیر تک تمہارے والدین یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم مزید سوال کرو میں بتا دیتا ہوں کہ میں نے انہیں تمہارے رشتے کے بارے میں بتایا ہے......" وہ ایک لمحے کے لیے رکے۔ زویا ہونق پن سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کل شام کو تمہارے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ تمیز کا مظاہرہ کرنا۔ میں سوچنے میں وقت ضائع ہرگز نہیں کروں گا کیونکہ تمہاری جیسی احمق اور جذباتی لڑکی کے لیے، عبدالہادی جیسا سمجھ دار لڑکا ہی بہترین رہے گا۔'' وہ کہہ کر رکے نہیں۔

'' وہ ڈرائیور، میرا مطلب ہے سڑیل انسان۔''

وہ حیران ہو کر ایک دم سے بول پڑی۔

داؤد نے جلدی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''بابا ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ!''

سامنے سے آتے سڑیل انسان نے اس کی باتیں سن کر منہ بنالیا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں داؤد سے ملنے آیا جب زویا کے نادر خیالات اس کے کان میں پڑے۔

''ہمیشہ غلط وقت پر انٹری دیتا ہے۔'' وہ گھبرا کر بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی۔

داؤد نے سامنے کھڑے عبدالہادی کی طرف دیکھا اور دونوں بے اختیار مسکرائے۔

''میں تمہاری زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ زویا جیسی رشتوں سے محروم لڑکی کے لیے تم مضبوط پناہ گاہ بنو گے۔'' داؤد نے کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ عبدالہادی نے یقین سے ان کا ہاتھ تھاما۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کے یقین کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔''

اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو داؤد مطمئن ہو کر مسکرا دیے۔

اگلی شام کئی رنگوں اور خوشیوں کے جگنوؤں اور تتلیاں لے کر اس کے آنگن میں اتری تھی۔ زویا کو زہرہ نے اپنی خاندانی انگوٹھی پہنا کر ہمیشہ کے لیے عبدالہادی کے نام کر لیا۔ ثمرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا آج تو عبدالہادی کے سنجیدہ چہرے پر بھی روشن مسکراہٹ تھی۔ زویا کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے باپ، اپنی سوتیلی ماں کے چہرے پر اطمینان اور خوشی دیکھی تھی۔ زویا جو اپنی محرومی کو چھپائے، حواس باختہ بنی پھرتی تھی۔ اس کے حساس دل میں کسی کی محبت کا دیا تو کب سے جل اٹھا تھا مگر وہ اس سے نگاہ چرائے پھرتی مگر آج داؤد کی وجہ سے اس کی ہر محرومی، ہر کمی کا ازالہ ہو گیا۔ اس نے خوب صورت اور بارعب شخصیت والے اپنے دل عزیز چاچو کی طرف دیکھا، جو اس کے لیے باپ بن کر کھڑے ہوئے اور اس کو منزل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

ایک خوب صورت شام کئی خوب صورت یادوں کے سنگ رخصت ہوئی۔

سب کے جانے کے بعد زویا، داؤد کو ڈھونڈتی پورچ میں چلی آئی جہاں رات کے اندھیرے میں خوب صورتی سے سجے دیے دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئی۔ داؤد دھیرے سے چلتے ہوئے کھلے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچی۔

''کیا ہوا؟'' اپنے خیالوں میں گم داؤد نے چونک کر پوچھا۔

''میں آپ کا شکریہ ادا!'' زویا نے جلدی سے کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''واپس اندر جاؤ۔ بیٹیاں، باپ کو شکریہ نہیں کہتیں بلکہ ان کے لیے دعا کرتی ہیں۔ تم بھی میری کمائی وہ دعا ہو جو میرے مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہے گی۔'' انہوں نے کہتے ہوئے زویا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ رو پڑی۔

''آپ نے بلایا تھا انکل میجر!'' وہ سنجیدگی سے کہتا آگے بڑھا۔ زویا چونکی۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ داؤد یہاں کیوں موجود ہیں۔

''ہاں، تم جلدی واپس چلے گئے۔ ذیشان تم سے ملنا چاہ رہا ہے۔ زویا، عبدالہادی کو اپنے باپ کے پاس لے جاؤ۔''

داؤد نے کہا تو اس نے سر ہلایا اور گھر کے اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔ دونوں چند قدم گئے جب زویا

نے منہ بنا کر ساتھ چلتے عبدالہادی کی طرف دیکھا۔
"روتے ہوئے پہلے ہی بری لگ رہی ہو مزید منہ بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے شرارت سے کہا۔
زوبیا نے اسے گھورا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔ ہنسی کی آواز پر داؤد نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ننھے دیوں کی قطار کے درمیان وہ دونوں، ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ داؤد انہیں تب تک دیکھتے رہے جب تک وہ اندر نہیں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی جس میں رات کی رانی کی پھیکی خوشبو اور محبت سے جلائے دیے ہی رہ گئے تھے۔
"ضروری تو نہیں کہ اپنی محبت کے مرقد پر نوحے پڑھنے والے، دوسروں کی محبت کی راہ میں ملن اور خوشی کے دیے نہ جلا سکیں۔"
میجر داؤد نے مطمئن ہو کر خود کلامی کی اور اپنی آنکھیں بند کر کے اسے محسوس کرنا چاہا جو سانس جیسی لگتی تھی ہر دم پاس۔!
"میرب! میں جانتا ہوں کہ تم یہاں آس پاس ہی ہو۔ دیکھو میں نے تمہاری جیسی ہی ایک معصوم اور رشتوں سے ترسی لڑکی کو تنہائی کے عفریت کا شکار ہونے سے بچالیا ہے۔"
وہ خود سے باتیں کرتے، بیساکھی کے سہارے چلتے، آہستہ سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ وہ رات کی تنہائی میں کچھ دور چلنا چاہتے تھے۔ میرب کا احساس پوری شدت کے ساتھ ان پر حاوی تھا کہ وہ اسے اپنے آس پاس بخوبی محسوس رہے تھے۔

رات آتی ہے تو چل پڑتے ہیں
بے بہا سلگی ہوئی یاد کے انگاروں پر
روح برسات میں بھڑکی ہوئی آتش ہے کہ
بجھتی ہی نہیں!
رات آتی ہے تو گر پڑتے ہیں۔
تیرے اندوہ کی نم غاروں میں
کون اب آکے نکالے گا ہمیں
کون ٹھہرائے گا بکھرے ہوئے پتوں کے
نصیب
ہم جو روندے ہوئے رستوں کی طرح
آہ بھی بھرتے ہوئے ڈرتے ہیں
جانے پھر کون سی ویرانی گزر جائے اچانک
کسی ویرانی سے۔!
ہم جو بھٹکے ہوئے بچوں کی طرح۔
سانس بھی لیتے ہوئے مرتے ہیں!
زندگانی کسی مرجھائے ہوئے دل کی طرح۔
سوگ کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی بیوہ ہے کوئی،
کوئی دم بھر بھی ٹھہرتے ہیں کسی آس کی،
چھاؤں میں تو رو پڑتی ہے۔
اور ہم پھر سے نکل پڑتے ہیں۔
ہم سیہ بخت، ترے فاصلہ بردار مسافر شب کے۔
عمر بیتی ہے جنہیں ہجر کی پیمائش میں۔
رات آتی ہے تو چل پڑتے ہیں۔!! (فرحت عباس شاہ)

"محبت من دیپ ہے۔ جس کی روشنی ہمارے ادھورے جسموں کو نہیں، ہماری روح کو سنہرا رنگ عطا کر کے عشق کے آسمان پر ازل تک اڑنے کے پر عطا کرتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ عشق کے یہ پر، کبھی نہ کبھی تو تمہارے نام کے آسمان تک لے ہی جائیں گے، پھر چاہے یہ دنیا ہو یا وہ دنیا! میں تمہاری راہ میں کھڑا رہوں گا۔"
نم آنکھوں کے ساتھ، میرب کے تصور سے باتیں کرتے، وہ اندھیرے راستے پر چل رہے تھے، یہ جانے کے بغیر کہ وہ جہاں سے بھی گزر رہے تھے، ان کی محبت کئی دلوں میں محبت کے ابد تک جلنے والے دیپ جلا رہی تھی۔

☆☆

نازنین فردوس

سسرال سے آگے

"ہمیں ایسے بھرے پرے گھر میں شادی نہیں کرنی۔ بالکل بھی نہیں۔" ہم اپنی بہن کی اس تجویز پر چلا اٹھے۔ جس کے بقول لڑکی کی اصل زندگی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی کی زندگی کا محور شادی شوہر بچے اور سسرال ہی ہوتا ہے اور سسرال کے آگے کچھ نہیں۔

"خدا کا خوف کریں آپی۔ زندگی میں شادی اور سسرال کے آگے بھی کچھ ہوتا ہے۔" ہم نے انہیں شرمندہ کرنا چاہا۔

"ہاں ہوتا ہے۔ اور وہ بھاڑ ہوتا ہے جہاں تم جیسی لڑکیوں کو چلے جانا چاہیے۔ آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے۔"

"مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ سسرال کم فوج زیادہ لگ رہی ہے۔ اور فوج کا مطلب ایک جرنیل قسم کی ساس کرنل نما سسر اور نندوں کی بریگیڈ ہو۔ اور اس محاذ میں ان سب کی مدد کرتے یہ چچازاد جیسے سسرالی رشتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں جو ہنگامی صورت حال میں کمک کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اور ہمیں نہتے سپاہی کی طرح ان سب سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں بھیجنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ اور اور"

"بس بس۔۔۔ میری نہتی فوجی بہن۔ تم نے تو ایسا نقشہ کھینچ مارا کہ جی چاہتا ہے تمہیں پوری تیاری کے ساتھ مع اسلحہ جات کے سسرال نامی میدان جنگ میں بھیج دوں تاکہ تم بالکل پسپائی نہ اختیار کرو بلکہ فاتح بن کر لوٹو۔" آپی نے بھی بالکل ہمارے انداز میں جواب دیا۔

"مسالہ جات؟" ہماری اردو ہمیشہ پریشان کرتی تھی۔

"اسلحہ جات یعنی ہتھیار......" آپی نے سر پر ہاتھ مارا (اپنے)

"اب جو بھی ہو۔ ہمیں اتنا پتا ہے ہمیں ایسی فیملی میں شادی نہیں کرنی جہاں میں پکا پکا کر ہی مر جاؤں۔"

"یعنی تم جنگ سے پہلے ہی ہتھیار ڈال رہی ہو۔" آپی نے ہمیں شرم دلانی چاہی۔

"نہیں۔ ہم نقص امن کے خدشہ کے پیش نظر صلح کا جھنڈا لہرانا چاہتے ہیں۔" ہم نے کمال اطمینان سے کہا تھا اور آپی کسی بھی بحث سے بچنے کے لیے کمرے سے ہی واک آؤٹ کر گئی تھیں۔

ہمارے لیے شادی کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن سسرال۔۔۔ وہ مسئلہ بن سکتا تھا یہ ہمیں لگ رہا تھا۔ اس لیے ہم کسی بڑے خاندان کی بہو بن کر نہیں جانا چاہتے تھے اور ہم یہی بات سب سے کہہ رہے تھے۔

"چھوٹی فیملی ہو۔ پڑھی فیملی ہو۔" یہ ہمارا مطالبہ تھا جو امی آپی کو سخت ناگوار گزرا۔

"ہاں گنتی کے چار۔ تاکہ لوگ دیکھ کر کہیں کہ خاندان نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔"

"اور آپ جو ہمارے لیے سوچ بیٹھی ہیں وہاں تو فوج کی پوری پلٹن ہے۔"

"ہاں تو کیا ہوا۔ فوج مطلب رعب و دبدبہ۔" آپی نے معنی خیزی سے کہا تھا۔ امی نے ان کا ساتھ دیا تھا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا ایک بڑے خاندان کی اہمیت تم کیا جانو۔ اچھے برے وقت میں یہ بڑے خاندان کتنے سودمند ہوتے ہیں تمہیں اندازہ نہیں۔

اور چونکہ سچ میں ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم خاموش ہو گئے تھے۔ اور ہماری یہ خاموشی شادی تک لے گئی تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی ہم اس بڑی فیملی کا حصہ بن چکے تھے۔ جہاں فیملی کے نام پر ایک پورا قصبہ تھا۔

شادی کے دو ہفتے تو بس سب "اچھا اچھا ہرا ہرا" ہی نظر آ رہا تھا۔ لیکن "ہرا ہرا نیلا نیلا" نظر آنا اس وقت شروع ہوا۔ جب ہم صبح کا ناشتا بنا رہے تھے تب ہماری ساس نے سسر صاحب کے لیے ناشتا بنانے کا حکم دے دیا۔

"ہم نے "جی امی" کہا اور ناشتا بنانے میں جت گئے۔

چاول تیار تھے، روٹی وہ کھاتے نہیں تھے، سالن گرم ہو رہا تھا۔ ہم نے پلیٹ لی اور چاول کی ڈش ٹیبل پر رکھ کر سالن لانے چلے گئے۔ سالن ابھی گرم نہیں ہوا تھا۔ بس دو منٹ لگے ہوں گے۔ جب سالن لے کر سسر صاحب کو دینے گئے تو ان کا ناشتا ہو چکا تھا۔ اور وہ اب لیٹ گئے تھے۔

ہم سالن کا برتن پکڑے حیران کھڑے تھے۔

"ابا۔ ہم سالن لائے ہیں۔ آپ نے چاول کس کے ساتھ کھائے۔" ہم کچھ حیرانی سے بولے۔

"اوہ۔ تم اتنی دیر سے سالن لائیں۔ میں نے تو ایسے ہی کھا لیا۔ مجھے کھانے کی جلدی ہوتی ہے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"اتنی جلدی ہوتی ہے کہ سالن لانے سے پہلے ہی چاول کھا لیے۔ الٰہی خیر......"

ہم بھاگم بھاگ اپنے میاں کے پاس پہنچے۔ انہوں نے سن کر ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ کل پہلے سالن رکھنا اور پھر چاول۔ وہ وقت کے پابند ہیں، وقت کے ساتھ چلنے پر یقین رکھتے ہیں اور کبھی کبھی وقت

سے پہلے ہی بھاگنا عقل مندی سمجھتے ہیں۔ وہ ریلوے میں تھے۔ پتا تو ہے نا تمہیں۔"

"اگر چاول سے پہلے سالن رکھا اور انہوں نے سالن یونہی پی لیا تو......؟" ہمارے منہ سے نکلا جس پر وہ گھور کر بولے۔

"ابا ہیں کوئی سالن پینے والے ڈریکولا نہیں۔"

"چلیں جی بات ختم۔" اور ہم دوسرے دن کی حکمت عملی سوچنے لگے جس سے وہ نہ روکھے چاول کھا سکیں اور نہ سالن پی سکیں۔۔

☆☆☆

ہمارے سسرال میں چار جیٹھ اور پانچ جیٹھانیاں تھیں۔ بھئی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک جیٹھ نے یونہی شوق میں دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ اور پانچ نندیں۔ اور ان کے ڈھیروں بچے۔ ڈھیروں یوں کہ ہمیں ابھی تک یہ بالکل بھی یاد نہیں ہوا تھا کہ کس جیٹھ کتنے بچے ہیں اور لڑکیاں لڑکے کتنے ہیں۔ ہر ہفتہ وہ لوگ اپنی ماں کی خیر خیریت کے لیے ضرور آجاتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اس سے ہماری خیریت مشکوک ہو جاتی تھی۔

یوں ایک مہینہ ہوتے ہوتے سسرال اور ساس نے ہمارے سارے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

اس دن صبح صبح مہمان آگئے وہ ہمیں مہمان لگے تھے لیکن مہمان اپنے آپ کو مہمان سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔ پورے گھر میں یوں دندنا رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔

یہ اتنے سارے لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں اور کیا ان سب کے لیے کھانا بھی پکانا پڑے گا۔ ہم تو ان مہمانوں کو دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچے تھے۔

یہ ہماری ساس کے خالہ زاد بہن کے بیٹے بہویں وغیرہ تھیں اور ان کے ساتھ سات آٹھ بچے۔۔۔۔ بچے پتا نہیں کتنے تھے ہم نے دو بار گنتی کی اور دونوں بار ایک مزید بچہ کہیں سے آنمودار ہوتا۔ اور ہم گنتی ہی بھول جاتے۔ آخر میں تنگ آکر ہم نے ان بچوں کو گننا ہی چھوڑ دیا۔ ہوں گے آٹھ دس۔

ہماری ساس نے کھانا نکالنے کا حکم دیا اور ہم انہیں ہونق بن کر دیکھنے لگے۔ صبح جو سالن بنا تھا وہ اتنے لوگوں کے لیے ناکافی نظر آرہا تھا مگر ساس صاحبہ نے خود ہی کچن میں آکر یہ مسئلہ یوں حل کیا کہ سالن میں سرخ مرچ اوپر سے ڈال دی۔ اور کچھ ہری مرچیں کاٹ کر ڈال دیں۔ اور خود باہر چلی گئیں۔

جب دسترخوان بچھا تو مہمان کھانے سے زیادہ پانی پی رہے تھے۔ اور جب کھانا ختم ہوا تو ہم نے دیکھا۔ سالن ابھی بھی جتنا تھا اتنا ہی تھا۔ شاید وہ ہماری ساس کے ہاتھوں کی برکت تھی۔

اور ہم ساس کی اس جنگی اور ہنگامی حکمت عملی کے قائل ہو گئے اور عش عش کر اٹھے۔

☆☆☆

اس شام ہم کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آئے تو بیڈ کے قریب ٹیبل پر قلاقند کا پیکٹ رکھا دیکھا۔ ہم حیران رہ گئے کہ یہ کہاں سے آیا۔ دل تو چاہا کہ کھول کر کھالیں مگر شرم مانع آئی اور یہ بھی خیال تھا کہ کہیں ہماری ساس نے منگوا کر نہ رکھا ہو۔ یہ سوچ کر ہم وہ پیکٹ لے کر ایک اچھی بہو بننے کی چاہ میں اپنی ساس۔ کے کمرے میں گئے جہاں سارے جیٹھ اور ہمارے میاں بھی بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ ساس صاحبہ پلنگ پر اپنے پورے رعب و دبدبہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

"امی جی، یہ قلاقند آپ نے منگوایا تھا۔" ہم نے وہ پیکٹ ان کی طرف بڑھایا اور اپنے میاں کو دیکھنے لگے جو عجیب عجیب اشارے کر رہے تھے۔

"اوہ۔۔" ہماری ساس نے وہ پیکٹ جھٹ پکڑ لیا۔

"نہیں۔ میں نے تو نہیں منگوایا تھا۔ شاید اشعر لے آیا ہو۔"

انہوں نے اشعر کو خشمگیں نظروں سے گھورا جو اب سر جھکا گئے تھے جبکہ جیٹھ حضرات چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ لیے ہمارے میاں کو دیکھ رہے تھے جو

اب کسی سے نظریں ملانے کو تیار ہی نہیں تھے۔

"اشعر......" اس سے پہلے کہ ہماری ساس کچھ کہتیں۔

"میں اب چلتا ہوں امی، صبح جلد جانا ہے" ہمارے میاں ہمیں کھینچ کر لے جاتے ہوئے بولے تھے۔

"کیا ہوا۔ ارے......" اپنے کمرے میں آتے ہی ہم کہہ اٹھے۔

"وہ قلاقند میں لایا تھا ہم دونوں کے لیے۔"

"آپ لائے تھے تو وہاں کیوں رکھا تھا کمرے میں۔" ہم نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

"کم تھا اس لیے سب کو نہیں بتایا تھا، چھپا کر لا کر کھانا تھا۔ اور تم نے سب کے سامنے شرمندہ ہی کر دیا۔"

"اوہ۔"۔ ہم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس آہ میں قلاقند نہ کھانے کا دکھ بھی شامل تھا۔

ہمیں کیا پتا۔ تھا کہ چوری سے لا کر رکھا ہوا قلاقند ہمارے لیے ہی تھا۔ ہماری اپنی فیملی چھوٹی سی تھی۔ ہمارے خاندان کے لوگ دوسرے شہر میں رہتے تھے تو آنا جانا بھی نہیں تھا بس کبھی کبھی چچا وغیرہ آ جاتے تھے۔ اور ابو نے بھی اس طرح کے شارٹ کٹ استعمال نہیں کیے تھے۔ تو ایک بھری پری فیملی کی نظروں سے بچا کر کوئی چیز لانا اور پھر اسے اکیلے ہضم کرنا ہماری جیسی خاتون کے لیے تو ایک نجا شیکنک ہی لگی تھی۔ اور میاں کی اس نجا شیکنک سے ہم یکسر انجان تھے۔

اس طرح ہم ایک بھرے پرے سسرال میں آ کر وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو ہم کسی درسی کتب سے کبھی سیکھ نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

اس دن اشعر اپنے ہنی مون کا پلان بنا رہے تھے اور ہم نے دیکھا وہ سب اپنے اپنے پلان بنانے لگ پڑے تھے۔ دو نندوں نے اسی وقت اپنا پلان قطعی کر لیا کہ ہمارے ساتھ ان لوگوں نے بھی آنا ہے۔ اور دو جیٹھوں نے اپنی اپنی ٹانگیں اڑائیں کہ یہاں نہیں وہاں جائیں گے۔ کافی دیر بحث مباحثے ہوتے رہے اور ہم سب لوٹتے، بیٹھتے رہے۔ ہمارا گھر "بگ باس" کے گھر کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ آخر کار ہمارے گھر کی "بگ باس" یعنی ہماری ساس نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ جانا تو بس شمالی علاقہ جات ہی ہے۔ چاہے گرمیاں ہوں یا سردیاں۔ اور وہ خود بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔ سسر صاحب کہاں پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی ساتھ آنے کا اعلان کیا ورنہ ان کی جانب سے جنگ کی دھمکی تھی جس پر سب نے بادل ناخواستہ رضامندی دی۔ ہم دونوں میاں بیوی سر ہلاتے اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔

"یہ سب لوگ کیوں آ رہے ہیں؟" ہم نے جھلا کر اپنے میاں کو دیکھا۔

"ہنی مون منانے۔" وہ شرمندہ سے بولے۔

"ہم دونوں کے ساتھ؟" ہم نے آنکھیں نکالیں۔

"سب کئی دنوں سے پلان کر رہے تھے کہ ہماری شادی کے بعد گھومنے جائیں گے تو......" وہ دبے دبے لہجے میں بولے۔

"اور تو اور ابا جی بھی آ رہے ہیں......" ہم نے دہائی دی۔ "ان کے ساتھ تو بس" دوڑا دوڑا بھاگا بھاگا" والی کیفیت ہی رہے گی۔ وقت سے زیادہ تیز رفتار تو وہ خود ہیں۔" ہم رونے پر آ گئے۔

"کوئی بات نہیں۔ ایک اور ہنی مون ہم اکیلے منائیں گے۔" ان کا خوشامدی لہجہ۔

"ہاں۔ اور اکیلے مطلب بالکل اکیلے جائیں گے ہم جیسے کنگنا گئے تھے۔" ہم نے ایک ہیروئن کی جانب اشارہ کیا تھا جو فلم میں اکیلی ہنی مون پر گئی تھی۔ اور خود اٹھ گئے تھے۔

اس طرح ایک بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہنی مون منا کر جب واپس آئے تو اتنا ہی سمجھ میں آیا کہ سسرال کے آگے پیچھے سسرال ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔

☆☆

فرح بخاری

تحمل ہی وفا

ناولٹ

اٹھارہویں قسط

"می۔۔را۔۔" اس کی گھٹی گھٹی آواز اس کے حلق میں دبی رہ گئی کیونکہ میران نے اس کے منہ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ وہ پھیلی آنکھوں سے اس کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے میں تم سے بدلہ لے رہا ہوں؟"

وہ بولا تو آواز کی سرسراہٹ سے رعنین پورا کانپ گئی۔ بولنے کی کوشش بھی بے کار تھی، منہ تو میران کے ہاتھ نے دبا رکھا تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے سر کو نفی میں ہلانے کی کوشش کی، پر ہل نہیں پایا۔

"بدلہ نہیں ہے یہ اسٹوپڈ۔" وہ ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ عجیب اضطراری سی کیفیت میں اپنی پیشانی مسلی۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر سے ڈسٹرب تھا۔

رعنین فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دو ہی سیکنڈز میں دوپٹا خود پر کھینچ کر آدھے بال کیچر میں پھنسائے۔ میران اب سائیڈ پوز کیے دونوں ہاتھوں پہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"میرا...... مطلب تھا...... میں ...... تو......"

رعنین نے کوشش کی کسی طرح اپنی بات کو سنبھالے لیکن سمجھ ہی نہیں آیا آگے کیا کہے۔

"میں بدلہ لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ کہنا شروع ہوا تو رعنین کو سمجھ میں آیا کہ وہ اسے تو سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بس اپنی کہنا چاہتا تھا۔

"اور بدلہ بھی اُن سے جنہوں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ اب اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے پلنگ کے کنارے بیٹھا تھا۔

رعنین تھوڑا سا اس سے پیچھے اب آلتی پالتی بنا کر اسے بغور سن رہی تھی۔ وہ باہر لان میں اتنا کچھ بول آئی تھی، ظاہر ہے میران اتنی دیر سے اس سب پر سوچتا رہا تھا۔ اور اب بولنے کی باری اس کی تھی۔ رعنین تو یوں بھی اس کی چپ سے خائف تھی۔ دل اگرچہ بری طرح خوف زدہ تھا کہ معلوم نہیں وہ اس وقت کون سا فیصلہ لیے یہاں تک آیا تھا۔ لیکن یہ مرحلہ تو ایک دن آنا ہی تھا۔

"قصوروار، گنہگار، جھوٹا، بدکردار، کم ظرف یہاں ایک ہی انسان ہے رعنین۔۔۔ اور وہ صرف اور صرف انصر ہے۔ میں نے کوئی انتقام لینا ہو، کوئی سزا دینی ہو تو اس کا حق دار بھی صرف وہی ہے۔"

"تو...... پھر...... تم......" وہ کہتے کہتے اٹک سی گئی۔ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ پھر وہ اس سے ایسا بیگانوں والا سلوک کیوں کر رہا تھا۔

"میرے دل پر بہت بوجھ ہیں رعنین......"

میران نے چہرا ایک بار پھر ہاتھوں میں دے دیا۔ اس کا لہجہ انتہا کا شکست خوردہ تھا۔ رعنین کا دل ڈوبنے لگا۔

"میں جانتا ہوں رعنا۔ قصوروار تمہارے بابا بھی نہیں ہیں۔ تمہیں بچانے کے لیے میری مدد طلب کرنا ان کی

مجبوری بن گیا تھا۔ اور میں اسی مجبوری کا شکار میں بھی ہوا۔ میں کیسے تمہیں اتنی بڑی تکلیف کا شکار ہونے دیتا، وہ بھی اپنے ہی ہاتھوں۔۔۔ لیکن عینا۔۔ بات اتنی کہاں ہے۔۔ بات صرف تمہیں کسی خطرے سے بچانے کی ہوتی تو جان دینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ لیکن میں نے تمہارے ساتھ ساتھ انصر کو بھی بچایا ہے۔۔ یہ بوجھ مجھے جینے نہیں دیتا۔ میں نے گناہ آلودہ، گرے ہوئے ذلیل شخص کو بچانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ دوسری بات یہ کہ تمہارے بابا کو معلوم تھا کہ انصر کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں نے ان سے وائس پر اقرار جرم مانگا تھا۔ جو انہوں نے مجھے دو ہی گھنٹوں کے بعد لا کر دے دیا۔ مجھے اس معصوم بچی کا خیال آتا ہے۔ جس کے مجرم سے میں نے برسوں پرانے قصور کا ثبوت تو نکلوا لیا لیکن اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اگر میں چاچا سے انصر کا پتا پوچھتا تو اس لمحے مجھے وہ یہ بھی بتا دیتے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح میں راضی ہو جاؤں۔ مجھے افسوس ہے کہ انصر کا اتا پتا مجھ سے بس ہاتھ بھر کی دوری پر تھا، لیکن میں نے صرف اپنا سوچا۔۔ اور۔۔ اور مجھے ضمیر کی یہ خلش کہیں سکون نہیں لینے دیتی۔"

"نہیں میران۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے......" رعنین کو بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن میران کی سوچ اس کا نقطہ نظر۔۔ اس نے سر کو نفی میں ہلایا۔ "اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ ارمینا پر ہوئی زیادتی کے بدلے میں انصر کی بہن کو طلب کرنا ایک جائز مطالبہ تھا اور جسے پورا نہ کر کے تم نے انصر کی جان بچانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے تو یہ میں نہیں مانتی۔ ابھی تم نے ہی کہا کہ میں بدلہ لینے والوں میں سے نہیں ہوں اور اس سے تو بالکل نہیں جو خود قصوروار نہ ہو۔ کیا ہمارے مذہب میں بھی واضح حکم موجود نہیں ہے کہ ظلم کرنے والے کو اول تو معاف کر دو۔ اور اگر معاف نہ کر سکو تو بدلے میں اس پر اتنا ہی ظلم کرو جتنا تم پر ہوا، نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ تو اس حساب سے انصر کے ظلم کا بدلہ انصر سے ہی لیا جانا چاہیے۔ مجھے بچا کر تم نے انصر کے ساتھ کوئی بھلا نہیں کیا۔ جہاں تک بات ہے انصر کے پتے ٹھکانے کی تو میں جانتی ہوں کہ بابا کبھی تمہیں صحیح جگہ نہیں بتائیں گے۔ جب انہوں نے مجھے اور امی تک کو نہیں بتایا کہ انصر کہاں ہے، تمہیں کیسے بتا دیتے۔ لیکن میران......" رعنین نے نجانے کیا سوچ کر بے ساختہ ایک گہری سرد آہ کھینچی۔

میران نے بھی چونک کر سر گھمایا، رعنین اسے ہی دیکھ رہی تھی پر آنکھوں میں شکایت اور ناراضی جھلک رہی تھی۔ وہ اس کی سائیڈ سے ہو کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ میران اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ "لیکن" کے بعد اس نے آگے کیا کہنا تھا وہ سننے کا منتظر تھا۔

"لیکن مجھے تمہارے خیالات سے اختلاف بھی ہے اور افسوس بھی بہت ہو رہا ہے۔ خدا کے لیے ہمارے نکاح کے جائز حلال رشتے کو ایک گنہگار کو بچانے کے لیے حصہ ڈالنا کہہ کر گالی مت دو۔ کیا واقعی تم نے مجھے دل کی رضامندی سے قبول نہیں کیا۔ حالانکہ جن حالات میں ہماری شادی ہوئی جانتے ہو میں کیا سوچتی رہی ان بدلتے حالات پر؟" اس نے پلٹ کر ایک نظر میران کو دیکھا، اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے سے ٹیک کر اس کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔

"ہم اُس وقت ملے میران جب ہمارا ملنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ہی بہت ٹوٹے ہوئے تھے۔ مجھے لگا ہم دونوں میں سے کسی کی آہ تو ضرور عرش پر ایسے پہنچی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے یوں اتنے غیر متوقع حالات میں ہمارے ایک ہونے کا سبب بنایا۔ اور اللہ کا انصاف دیکھو اس نے سبب بھی اسی کو بنا دیا جس نے ہماری راہیں جدا کی تھیں۔ کیا یہ بھی انصر کے لیے کسی سزا سے کم نہیں کہ جس انسان کو اس نے ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ جس کو پے در پے دھوکے دیے۔ جس سے بغیر وجہ کے صرف دنیا کے دکھاوے کے لیے نفرت کی آج انصر کی اپنی وجہ سے وہ ان کے گھر کا ایک اہم فرد ہے۔ سزا تمہیں نہیں میران سزا انصر کو مل رہی ہے۔ ہمیں تو ہماری سچی نیت کا پھل ملا ہے۔۔ میران یہ وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے، یہ بات تمہیں سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔

رعنین اپنے موقف پر زور دیتے جیسے تھک سی گئی۔ پلکیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ اس نے چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں دے دیا۔ میران کے خیالات نے دوریوں کی وضاحت تو کر دی تھی لیکن رعنین کا دل بھی دکھایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے میران کو اپنی محبت کی سچائی بھی سمجھانی پڑ سکتی ہے۔

اسے معلوم بھی نہیں ہوا اور میران اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے رعنین کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے۔ وہ اوپر دیکھنے ہی لگی تھی پر اس سے پہلے ہی میران نے اسے پیار کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ سب تجھے پہلے نہیں سمجھا سکتی تھیں۔ ہوں؟ جانتی نہیں ہو۔۔ میرا دماغ کسی ایک جگہ اٹک جائے تو مجھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس ایک ہی نقطے پر جم چکا تھا کہ انصر کی مدد کر رہا ہوں اور اسی ایک جملے کی وجہ سے ضمیر کے بوجھ تھے کہ دن بہ دن بڑھتے ہی جا رہے تھے۔"

"کیسے سمجھاتی...... مجھے کیا پتا تھا، کیا سوچ رہے ہو۔" اس نے غصے سے میران کے سینے پر مکا لگایا۔

"تم بھی تو بالکل چپ چاپ اور گم صم ہو گئی تھیں۔ مجھ سے پوچھتی کیوں نہیں تھیں۔ ہر وقت بس گھر کے کام، کام، کام۔" وہ اب اس کے بالوں کو سائیڈ پر کرتے اس کے کان کے نزدیک بول رہا تھا۔ اس کا نرم لہجہ، اس کا پرانا انداز، وہ سینے سے لگی مسکرا رہی تھی۔

"ایسا سڑیل میران میں نے کہاں دیکھا تھا۔ مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔" اس نے ہلکا سا سر اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ روئی روئی آنکھیں اب خوشی سے چمک رہی تھیں اور ہونٹوں کی ہلکی مسکراہٹ میں شگفتگی چھائی تھی۔ میران دیکھتا چلا گیا۔ اتنے قریب سے رعنین کو کبھی دیکھا ہی کہاں تھا۔ دل بے خود ہونے لگا۔

"رات بہت ہو گئی ہے عینو۔" اس نے جس لہجے اور مٹھاس سے یہ بات کہی وہ تو رعنین کے سر سے گزر گئی، اسے چار باتیں اور یاد آ گئیں۔ وہ فوراً اس سے دور ہوئی۔

"ارے ہاں۔ کل تو بہت مصروف دن ہے۔ کل میں نے نسیمہ سے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔ یسمینہ کو الگ سے بلا کر بہت کچھ سمجھانا ہے۔ امی اور پھوپھو نے بھی بلایا ہے۔ پرانا سامان الگ کرنا ہے۔"

"ہوں۔ اچھا۔۔ تو۔؟" میران نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"تو کیا۔۔ ٹائم دیکھو۔ سوا بارہ بج گئے۔ جاؤ۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

میران نے ابرو تان کر پہلے اس کی انگلی اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔

"اور۔۔ تم۔؟"

"ہاں، بس میں بھی سوتی ہوں۔" وہ مڑنے لگی۔

"یہ راحیل کا کمرا ہے۔" وہ اب مسکراہٹ روک رہا تھا۔

رعنین کے قدم وہیں رُکے۔ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ میران نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کی کلائی اپنے ہاتھ میں لی۔

"چلو۔ اپنے کمرے میں۔"

"کک۔ کک۔۔"

"کک۔ کک۔ کچھ نہیں۔" اس نے ہنس کر رعنین کی نقل اتاری اور اسی ہاتھ کو کھینچتے باہر نکل آیا۔ جبکہ وہ نہ آگے بڑھ پا رہی تھی نہ رک سکتی تھی۔

میران نے رُک کر اسے دیکھا۔

"کیوں۔۔ اُٹھا کر لے جانا ہے؟"

"نن۔ نن۔ نہیں۔" وہ بے چاری حواس باختہ سی تیز تیز چل پڑی۔

میران کو اس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔ اُس نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ رعنین کی کلائی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے اندر آ جانے پر میران نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ رعنین نے گھبراہٹ سے

تھوک نگلا پر گلا پہلے ہی انتہا کا خشک تھا۔
''پ۔ پانی۔۔''
''ہوں؟'' میران نے چونک کر دیکھا۔
''وہ۔۔ پانی پی لوں؟'' اس کی آواز بمشکل گلے سے نکل پائی۔ میران نے پھر مسکراہٹ روکی۔
''ہاں۔ وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہے بوتل۔ لے لو۔''
اس نے ابرو سے اشارہ کیا تو وہ گھبرا کر فوراً اُدھر بھاگی۔ میران کے کمرے سے کبھی بھی مانوس نہ رہی تھی۔ بیڈ کے کونے سے ٹکراتی ہوئی سائیڈ ٹیبل تک پہنچی اور بوتل کو ہی منہ لگا لیا۔ حالت یہ سوچ کر غیر تھی کہ اسے یہیں سونا ہے۔ اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ یہاں کے دو سنگل صوفے بیٹھنے کے لیے تو ٹھیک تھے پر اُن پہ سویا نہیں جا سکتا تھا۔ اُسے ٹیکسلا کا گھر یاد آیا، وہاں باوجود کمرا ایک ہونے کے بستر ہمیشہ علیحدہ ہی رہے تھے۔
میران دروازہ بند کر کے اس کے نزدیک آیا۔ وہ بیڈ کے کنارے پیٹھ کیے کھڑی تھی۔ میران نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔
''کھانا کھا لیا تھا؟''
''جی۔'' اس سے میران کی طرف دیکھا نہیں گیا۔
''ڈریس بڑے جلدی چینج کر لیا؟''
''جی۔ بس وہ بارش میں کچھ بھیگ گئی تھی۔ وہ سر نیچے کیے کھڑی تھی۔''
''کیا تم بھی یہی چاہتی تھیں عینا۔۔ کہ ہم دور ہو جائیں؟'' وہ اب سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔
رعنین کو اپنی لان والی باتیں یاد آئیں جو پتا نہیں کیوں وہ بنا سوچے ایک روانی میں کہتی چلی گئی تھی۔ اس نے فوراً سر نفی میں ہلایا، وہی جانتی تھی اس نے کیسے دل کڑا کر کے ایسی سخت باتیں کہنے کی ہمت پیدا کی تھی۔ کہہ لینے کے بعد ہوش آیا تھا کہ اگر میران نے اس کی باتوں پر عمل کر لیا تو کیا ہوگا۔
''تو پھر کیوں ایسا مشورہ دیا؟'' وہ اب شکوہ کر رہا تھا۔
''تا کہ تمہارے دماغ پر جو غصہ سوار ہے، تم اُس سے ہٹ کر بھی کچھ سوچو۔'' اس نے آہستگی سے جتایا۔
''ہوں۔۔ غصہ تو اُتر گیا۔'' میران نے شانے سے پیچھے لے جاتے اپنے بازو اس کی پشت پر باندھ کر اسے اپنے قریب کیا ''اُس سے ہٹ کر بھی سوچ رہا ہوں۔ اور۔۔ پتا ہے کیا سوچ رہا ہوں!'' اس کی آواز دھیمی سرگوشی جیسے ہونے لگی تھی۔
رعنین نے گھبرا کر سر دائیں بائیں ہلایا۔ میران نے گھور کر دیکھا
''کیوں۔۔ نہ بتاؤں کیا سوچ رہا ہوں؟'' وہ پوچھنے لگا۔
رعنین کا چہرا گلابی پڑنے لگا۔ ہلکی سی شرمیلی ہنسی کے ساتھ اس نے پھر سر نفی میں ہلایا۔
''اے لڑکی۔ مجھے پھر سے غصہ آ جائے گا۔''
''دھمکیاں دیتے ہو۔'' وہ منہ پھلائے شکوہ کرنے لگی۔ اب وہ اس کی قمیص کے بٹنوں کو بلاوجہ گھما رہی تھی۔ میران نے سر جھکا کر دلچسپی سے اس کی حرکت کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اوپر والا بٹن کھول دیا۔ رعنین گھبرا کر پیچھے ہونے لگی لیکن میران نے بازو کی سختی سے اسے روک لیا۔
''جا کر دکھاؤ کہیں۔''
''مجھے جانا بھی نہیں ہے۔'' اس نے شرما کر پہلا اقرار کیا اور میران تو کب سے ایسے کسی اقرار کا منتظر تھا۔ اس نے سکون سے رعنین کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے بالوں کو محبت سے سہلایا۔
''زندگی بڑی بے سکون ہو چکی تھی عینو۔ میرے لیے تمہارا یہ ایک جملہ سکون کی پوری جھیل جیسا ہے۔ اور تم خود۔۔ تم تو ہو ہی سراپا خوشی اور سکون۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ ایک انسان تو بس ایک ہی انسان ہوتا ہے۔ پر دو مل جائیں تو جہان مٹھی میں بھر لیں۔ مجھے تمہارے ساتھ کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ ہم دونوں نے مل کر بہت کام کرنے ہیں۔ میں اکیلا

واقعی اب تھکنے لگا تھا۔ مایوس ہو رہا تھا۔"
"لیکن تم اتنے چپ چاپ ہو گئے تھے، کہ تم سے ڈر لگنے لگا تھا۔" رعنین کی پلکیں بھیگنے لگیں۔
"مجھے معاف کردو رعنا، میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ ٹیکسلا کا وہ چھوٹا پیارا سا مکان جس کا کونا کونا ہماری محبت سے مہکنا چاہیے تھا۔ تمہارے لیے شاید ایک تلخ یاد سے زیادہ کچھ نہ ہو۔"
"نہیں میران۔ میں اداس ضرور رہتی تھی لیکن مایوس کبھی نہیں تھی اور وہ مکان میرے لیے تلخ یاد کیسے ہو سکتا ہے۔ جس مکان میں، میں نے مسز میران بن کر قدم رکھے وہ تو ہمیشہ میرے لیے ایک بہت خوب صورت یاد بن کر رہے گا۔"
"ہوں۔۔تو کیسا لگتا ہے مسز میران بن کر؟" وہ اس کے بالوں کو ماتھے سے ایک سائیڈ پر کرتے اسے پیار سے دیکھ رہا تھا۔
"میران لگتے ہی کب تھے تم۔" اس نے بے ساختہ منہ پھلایا جس پر میران نے قہقہہ لگایا۔
"میران لگنے لگا تب بھی تم تنگ ہی آجاؤ گی۔" اس نے معنی خیزی سے کہا تو وہ پھر گھبرا کر دور ہٹ گئی۔
"وہ میرا کچھ سامان اُس کمرے میں رہ گیا ہے۔"
"کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے کسی بس اسٹینڈ پر رہ گیا ہو۔ صبح کر لینا سامان کی سیٹنگ وغیرہ۔ اس نے کلائی سے تھام کر اسے واپس کھینچا۔ بلکہ یہاں تو ویسے بھی ہمارا قیام عارضی ہے جانِ من، اب تو ہم نے نئے مکان میں شفٹ ہونا ہے۔ تم نے دیکھا ہمارا ڈیرے والا نیا مکان؟"
"باہر سے ہی دیکھا ہے۔"
"او کے۔ تو کل صبح ہم اپنے نئے گھر جائیں گے، میری مسز اپنی مرضی سے وہاں کی سیٹنگ اور ڈیکور کرے گی۔"
"میران۔ ہم یہیں رہیں گے اب؟" رعنین کو بھلا کب موقع ملا تھا اس کے پلان جاننے کا۔ اور اب وہ نئے گھر کی بات کر رہا تھا۔
"ارادہ تو یہی ہے جاناں۔ دیکھو پھر حالات کیا کہتے ہیں......" میران کی بے ساختہ ایک آہ نکل گئی۔ "خیر......" وہ مسکرا کر رعنین کے نزدیک آیا۔ اسے کندھوں سے تھام کر پلنگ کے کنارے بٹھایا اور خود بھی قریب بیٹھتے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "آج کوئی ٹینشن والی بات نہیں۔ بہت دنوں سے دونوں اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔ اس لیے آج تو بس مجھے میری رعنین کو محسوس کرنے دو، میرے اپنے دل کی خوشی سے، میری محبت سے، میری مرضی سے۔ اور اُس رشتے کو، جو نجانے کتنے برسوں سے میری ایسی خواہش تھی کہ جو اب ایک حسرت میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اور شاید اسی وجہ سے اسے میری ہی نظر لگ گئی کہ میں اسے اس جذب سے ایک دن ایک بھی پل اس طرح محسوس نہیں کر پایا جیسا کہ کرنا چاہیے تھا۔ اور مجھے پتا ہے رعنین۔ کوئی بھی لڑکی جو اپنا گھر اپنا ماحول اپنے لوگ چھوڑ کر کہیں جاتی ہے، ہرگز ایسی زندگی کی توقع نہیں کرتی جیسی تم نے میرے گھر میں دیکھی ہے۔ تمہیں بھی اِس نئی زندگی میں سوائے مایوسی اور پشیمانی کے کچھ نہیں ملا ہوگا۔ اور سوچنے کا یہ نیا زاویہ بھی مجھے تم نے ہی دکھایا ہے۔ اس لیے مجھے ان ساری کوتاہیوں کا ازالہ کرنے دو۔ جن کی وجہ سے اتنا عرصہ ہم دونوں نے مصیبت سہی۔ اب مجھے اپنے سے دور مت کرنا۔ ہماری تکلیفوں کا زمانہ کٹھن ضرور رہا ہے، طویل ہرگز نہیں تھا۔ اور میں اسی پر شکر بجا لاتے آج سے اپنی نئی خوب صورت زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے میری پارٹنر پورے دل و جان سے میری شریک ہے۔ ہے نا؟"
وہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور کھلی ہتھیلی اُس کی جانب بڑھی ہوئی تھی، اور رعنین نے کیا سوچنا تھا، مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ میران کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

☆☆☆

نوریرا اور بچہ ایک ساتھ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئے۔ ڈاکٹرز نے اب بچے کا چیک اپ تو بتایا تھا لیکن انتہائی نگہداشت جیسا اب زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ رابیل نے گھر آکر ہی پہلی مرتبہ بچے کو نوریرا کے پاس لٹایا تاکہ وہ اسے فیڈ کر سکے لیکن نوریرا نے چہرا دوسری جانب کرلیا۔

''اِسے اُٹھا لیں پلیز۔'' اس نے رابیل کی منت کی جس پر وہ بری طرح چونک کر پلٹی اور دوبارہ اس کے نزدیک آئی۔

''کیا کہہ رہی ہو۔''

''بھابھی، اِسے لے جائیں۔'' نوریرا نے اپنی بات پر زور دیا۔

''کیوں۔۔۔اِس معصوم کا کیا قصور ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' نوریرا نے آہستگی سے کہا تو رابیل کا اس کا لہجہ بھیگا ہوا سا محسوس ہوا۔ وہ نزدیک آکر اس کے پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔

''پرانی باتیں بھول کر زندگی میں آگے بڑھو نوریرا۔ کسی کو بھی پرانے کسی سچ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے نا عیب چھپانے والا، پردے رکھنے والا، تم اپنی کسی حرکت سے اگلوں کو بلاوجہ شکوک میں نہ ڈالو۔''

''گھر میں کون سے اگلے؟'' وہ چڑ گئی۔

''بھئی تم اُسے پاس لٹانے سے انکار کر رہی ہو، کوئی ملنے ملانے والا آگیا تب بھی یہی کرو گی کیا؟ جبکہ اتنا چھوٹا بچہ تو ماں کے پاس ہی ہوتا ہے۔''

''یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ مہمان کی موجودگی میں بچہ امی یا آپ کے پاس ہو تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ اپنے روئے لہجے پر آپ ہی قابو پا چکی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن اس ضد کی وجہ کیا ہے؟ بچہ پہلے ہی کمزور اور بیمار ہے، اسے تمہاری توجہ چاہیے۔ اور یہ جیسے عجیب سے تمہارے خیالات ہو رہے ہیں، یہ بھی بس شروع شروع کی بات ہے۔ ابھی عادت نہیں ہے نا تو......''

''مجھے عادت بنانی بھی نہیں ہے۔'' اس نے رابیل کی بات کو قطع کیا، پھر چہرا سیدھا کر کے رابیل کی آنکھوں میں دیکھا۔

''بات یہ نہیں ہے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اتنی تو مجھے بھی سمجھ ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں لیکن۔ میں اِس سے محبت بھی نہیں کرنا چاہتی۔ بس میں اِس سے مانوس نہیں ہونا چاہتی۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں بھابھی......وہ پہلے تو سسکی، پھر بازو آنکھوں پہ رکھ کر رونے لگ گئی۔'' آپ کو نہیں پتا میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں بتا بھی نہیں سکتی، بس پچھتا سکتی ہوں۔ اور جب بھی پچھتاوا ہوتا ہے بھابھی، اپنے جیسی لاکھوں کروڑوں نادان لڑکیوں کے لیے دعا کرتی ہوں جو خود کو اپنی ہی حماقتوں کی وجہ سے کیسی کیسی مصیبت سے دوچار کر دیتی ہیں۔ میری دعا ہے اللہ پاک اُن سب کی حفاظت فرمائے۔''

''آمین۔'' رابیل نے بھی بے اختیار ایک آہ بھری۔

''لیکن بھابھی، اگر میں اس بچے کے قریب رہی تو وہ پچھتاوے جو کبھی کبھار حاوی ہو کر میرے ذہن کو جھنجوڑتے ہیں، مجھے پل پل اذیت دیں گے۔ میں نارمل زندگی جینا چاہتی ہوں۔ مجھے ذہنی مریض مت بنائیں پلیز۔۔۔میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔'' وہ بے بسی سے پھر رو دی۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم رو ؤ مت۔ میں ابھی اس کو لے جاتی ہوں۔ پھر بعد میں سوچتے ہیں۔ تم اپنے ذہن پر زور مت دو۔'' اس نے نوریرا کو تھپکی دی۔

اگرچہ اس کا اپنا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ لیکن فی الحال نوریرا کی بات مان لینے میں عافیت تھی۔ کچھ ہی دیر میں عابدہ پھوپھو آنے والی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی ان کے آنے پر گھر کے ماحول میں کوئی تناؤ جیسی کیفیت ہو۔ اس نے چپ چاپ بچہ اور اس کا چھوٹا موٹا سامان وہاں سے اٹھایا اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ امی کے کمرے میں ایک اور نواب صاحب تھے، ان کو بھی بچے میں کوئی دلچسپی نہ

تھی۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، اِسے کہیں اور رکھو۔

رابیل نے بچے کو اپنے بیڈ پر سلا کر اس کی فیڈر تیار کی اور امی کو بلا لائی۔ انہیں نوریا کی باتیں بتا کر یہی سمجھایا کہ فی الحال آپ بچے کا خیال رکھیں۔ کہ رابیل کو خود تو پورا گھر سنبھالنا تھا۔ پھر عابدہ پھوپھو اپنے آنے کا بتا چکی تھیں۔ دوپہر کا کھانا بھی تیار کرنا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈ کی وجہ سے اس نے ہلکا سا ہیٹر بھی آن کر لیا۔ بچہ بہت کمزور تھا۔ اسے بہت توجہ کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

سرسبز پہاڑوں کی چوٹیوں کو سرما میں سفید ہوتے دیکھنا ایک بڑا ہی دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک دور تک پھیلی سرسبز چراگاہ پر کہیں کہیں برف کے قطعے اُس نے پہلی بار دیکھے تھے۔۔ تو یعنی نیچے وادی سے دیکھنے پر یہی برف کے ٹکڑے سبزی میں کہیں سفید لکیر تو کہیں بادل کے ٹکڑوں جیسی جھلک دیتے آنکھوں کو طراوت دیا کرتے ہیں۔ وہ اپنے فر کے گلابی کوٹ میں مزید سمٹتی اپنے چہار جانب دیکھتی جا رہی تھی۔

''گاؤں تو ہمارا بھی بہت پیارا ہے لیکن یہاں کی بیوٹی بھی کیا غضب ہے نا!'' اس نے مسکرا کر زرگل کو دیکھا تو وہ ہلکی مسکراہٹ لیے بڑی محویت سے اسے تک رہا تھا۔

وہ دونوں پہاڑ کے کنارے پر بیٹھے تھے۔ نیچے وادیاں تو تھیں لیکن جگہ اس لحاظ سے خطرناک نہ تھی کہ اس جگہ کی اونچائی سے قریب آٹھ دس فٹ نیچے پھر ایک چوڑی جگہ تھی اس کے بعد پھر ایک بیس پچیس فٹ گہری ڈھلان۔۔ یوں یہ پہاڑ ہلکے ہلکے اسٹیپس کی صورت نیچے وادی تک جا رہا تھا۔ وردہ نے اسے غائب دماغ سا پایا تو ابرو جوڑ کر منہ پھلاتے ہوئے دیکھا۔

''سُن بھی رہے ہیں مجھے؟''

''ہاں تو اور کسے سننا ہے؟'' وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔

''اچھا تو کیا کہا میں نے؟ وردہ کو یقین نہیں تھا۔''

''سرکار، آپ یہاں کی غضب بیوٹی کی بات کر رہی ہیں۔ اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس بیوٹی کو سراہ رہا ہوں جو پروردگار نے خالص مجھے عطا کی ہے۔'' اس نے پیار سے وردہ کی سرخ ناک کو چٹکی میں لیا۔ سردی کی وجہ سے اس کا چہرا گلابی ہو گیا تھا جبکہ ناک کی نوک اور گال سرخ پڑ چکے تھے۔

''اوپر سے یہ میچنگ کوٹ......'' اس نے ہنس کر گلابی فر کے کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں بے چارا ماتم جبہ دیکھوں گا؟''

''میچنگ؟'' اس نے حیرت سے دیکھا، جس پر زرگل نے موبائل اوپن کیا اور وردہ کی ایک تصویر بنا کر اس کے آگے کی۔ وردہ بھی اپنا سرخ گلابی چہرا دیکھ کر ہنس پڑی۔

''ٹھنڈ بہت ہے یہاں۔'' اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے۔

''کافی پینی ہے؟'' زرگل نے مشورہ دیا۔

''نہ نہ مجھے تو چائے چاہیے۔''

''آ جاؤ۔ وہ سامنے ایک کیفے ٹیریا ہے۔ ساتھ کچھ اچھا سا کھاتے بھی ہیں۔'' وہ وردہ کا ہاتھ تھام کر آہستہ روی اور احتیاط سے ڈھلان اترنے لگا۔

''سوچو۔ اِس وقت اگر ہم پوری پلٹن کو ساتھ لیے یہاں آئے ہوتے۔'' زرگل نے شرارت سے وردہ کو دیکھا جس پر وہ بری طرح جھینپ گئی، کیونکہ ''پلٹن'' کا پروگرام تو اسی نے ختم کروایا تھا۔

''تھینکس یار۔ اِس خوب صورت ماحول میں اتنا حسین ساتھ فراہم کرنے کے لیے میری پیاری وائف کا بہت بہت شکریہ۔''

''بس کر دیں۔ میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہو رہی ہوں۔''

اس نے خفیفتاً منہ بسورا، جس پر زرگل نے کھل

کر قہقہہ لگایا لیکن پھر ایک جگہ پہنچ کر رُک کر وردہ کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ اب وہ سنجیدگی سے وردہ کو دیکھ رہا تھا

"اِس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے پاگلے۔ تمہیں پتا ہے، تمہارے ملنے کے بعد میں آج اِس بات کی اہمیت کو سچے دل سے سمجھ پایا ہوں کہ "فیملی" کا اصل مفہوم کیا ہے۔ ہمارے والدین، ہمارے بھائی بہن، ان سے جُڑے تمام قریبی رشتے قابل احترام بھی ہیں، اُن سے ہماری محبت بھی بڑی فطری سی بات ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میری فیملی تم سے شروع ہوتی ہے اور آگے چل کر ہمارے بچوں پر مکمل ہوگی ان شا اللہ۔ اِس میں عار محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ میری امی، میرے بھائی بہن، میرے بابا کی فیملی تھے۔ اور یہ سلسلہ قدرت کے نظام کے تحت آگے کو بڑھتا ہے۔

"جی، یہ تو خیر سچ ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سب کو ساتھ لے کر چلنے میں بھی اپنا ایک حُسن تو ہے نا۔"

وہ دونوں دوبارہ نیچے کو اترنے لگے تھے۔

"ہاں، بالکل چلنا چاہیے۔ نئی فیملی بنانے کا مطلب پرانے ساتھ چھوڑ دینا نہیں ہوتا۔ لیکن میں بات کر رہا ہوں اُس نئے نئے احساس کی جو تمہارے ملنے کے بعد میرے اندر پیدا ہو رہا ہے۔ اور بہت خوب صورت ہے۔ اور یہ سوچ اُس سے بھی خوب صورت ہے کہ آنے والے وقت میں نیا اضافہ اس کو مکمل کرے گا۔"

"آپ کو بچے پسند ہیں؟" وہ ہلکا سا سر گھما کر اسے بھی دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، بہت پسند ہیں۔ میں نے تو اپنے بچوں کے بہت سارے نام بھی سوچ رکھے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ اُن میں زیادہ تو لڑکیوں کے ہیں۔"

"ہم م م......" اپنے۔ بچوں کا بہت خیال رکھیں گے۔ وہ دھیمے سے بڑبڑائی تھی۔ یوں جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

زرگل نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بھی ایکدم نروس ہو کر تیزی سے چلنے لگی۔ زرگل نے اس کی عجلت اور نیچے کو جاتے راستے کو دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔ وہ بھی رُک تو گئی لیکن پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہی تھی۔ زرگل نے ایک سانس اندر کو کھینچ کر قدم اس کے قریب جا کر روکے۔ اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھپکا۔

"سب ہی ماں باپ اپنے بچوں کا ہر ممکن خیال رکھتے ہیں میری جان۔ بس دعا کرو کہ دشمن گھر کا نہ ہو، ورنہ یہ دنیا۔۔۔ یہ تو جنگل ہے ہی، کسی نہ کسی طرح ہر کوئی دامن بچا کر آگے بڑھنے پہ مجبور ہے۔ پھولوں کی سیج کسی کو بھی میسر نہیں۔ اور سنو......" وہ اب اس کے مقابل کھڑا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وردہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔" جب یہ طے ہے کہ ہم نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تو ماضی کا کوئی وہم بھی میں ہرگز ہرگز تمہیں ساتھ لے کر آگے نہیں جانے دوں گا۔ اور۔۔۔ سنو وردہ......" اس نے ایک گہرا سانس اندر کو کھینچ کر ارد گرد دیکھا۔

"قدرت کے اس حسین نظارے کو دیکھ رہی ہو!" اس نے سبزے، برف، پہاڑوں اور وادی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کتنا خالص کتنا شفاف نظارہ ہے۔ تمہارے لیے میرا دل میری محبت بھی اتنے ہی پیور ہیں وردہ۔۔۔ تم نے میری روح کو چھوا ہے، اور میں زندگی کے ہر قدم پر تمہارے ہونے کی پورے دل سے قدر کرنا چاہتا ہوں۔ اور تم نے میری طاقت بننا ہے۔ اِس لیے نہ خود کمزور پڑو اور نہ مجھ پر ماضی کی کسی بیکار تاریکی کا سایہ پڑنے دو۔

"چلو شاباش وعدہ کرو۔" آخر میں اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ہتھیلی سامنے پھیلائی اور وردہ تو اس کی پیاری بچی باتوں پر پہلے ہی مسکرانے لگی تھی۔ اس نے زرگل کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پشت کو محبت سے چوم لیا۔

"ایسا ہی ہوگا صاب جی۔ اب چلیں۔ چائے پینے؟"

"یس سر......" وہ اسے بازو کے گھیرے میں

لیے ہنستے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

میران نے گھڑی دیکھی، صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ آج اُسے سر سیف اللہ سے ملنا تھا۔ نسیمہ کچھ دیر پہلے ناشتا سامنے رکھ گئی تھی۔ وہ جب نیند سے اُٹھا، اس وقت بھی کمرے میں اکیلا تھا۔ نہا کر نکلا تب بھی رعنین کہیں دکھائی نہ دی۔ اور اب وہ ناشتا کر کے چائے کی آخری چسکیاں لے رہا تھا۔ لیکن بیگم صاحبہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ ناشتے کے برتن بھی نسیمہ اٹھانے کے لیے آئی۔

"رعنین بی بی کہاں ہیں؟" اس نے باہر جاتی نسیمہ سے پوچھ ہی لیا۔

"خان جی، وہ تو کوارٹر گئی ہیں۔ اُدھر بسمینہ صفائی کر رہی ہے۔ بی بی جی صبح سے اسی کے ساتھ کام کاج میں لگی ہیں۔"

نسیمہ کے لہجے میں بسمینہ کے ذکر پر ہلکی سی جلن تو واضح تھی، پر میران مایوس نہ تھا۔ رعنین نے بتایا تھا کہ پچھلے دنوں اس نے نسیمہ کو بہت سمجھایا تھا۔ وہ اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ تاج اور بسمینہ کے ایک ہونے میں اسی کو فائدے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ نسیمہ کے کیا ارادے تھے، لیکن بسمینہ کو کوارٹر میں شفٹ کرنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ پچھلے دو دن داخلی دروازے کی تبدیلی کا کام ہوتا رہا تھا۔ اُن کے کوارٹر کا دروازہ میران کی حویلی کے لان میں ہی کھلتا تھا لیکن اب اس کا ایک دروازہ باہر ڈھلانی راستے پر بھی بنایا گیا تھا تاکہ کل کو جب یہ حویلی کالج بن جائے تو بسمینہ کا کوارٹر اس سے علیحدہ ہو چکا ہو۔ اور آج اس کی بیگم صاحبہ یقیناً بہت مصروف تھی۔ وہ چونکہ ابھی نہا کر نکلا تھا اس لیے باہر کی ٹھنڈ دیکھتے اپنے لیے شال نکالنے کا ارادہ کیا۔ اور اسے ہونا تو الماری میں چاہیے تھا۔ وہ اوپر نیچے کافی چھان پھٹک کر چکا تھا۔ لیکن شال نہیں ملی تو مایوس ہو کر نکلنے کا ارادہ کیا۔ ہال میں رعنین کی آواز سنائی دی تو رسٹ واچ باندھتے میران کا ہاتھ رُکا۔ ہونٹوں پر ہنسی آئی۔ اس نے دروازے میں آ کر آواز لگائی تو کچھ ہی دیر بعد رعنین نے کوریڈور میں جھانکا۔

"یار، میری کالی شال نہیں مل رہی۔"

"کالی۔ شال۔" وہ سر کھجاتے سوچ میں پڑ گئی

"او۔ ہاں۔ وہ تو غلطی سے میرے کپڑوں کے ساتھ تہہ ہو گئی۔" وہ آگے آتے اس کے قریب سے گزرنے لگی لیکن میران نے بازو سے پکڑ کر پہلے اسے آگے جانے سے روکا پھر تھوڑا سا پیچھے ہو کر دروازہ بھی بند کر دیا۔

"ارررے۔" وہ جو اچانک روکے جانے پر دیوار سے جا لگی تھی، گھور کر میران کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے کی بچی۔" میران نے دونوں ہتھیلیاں دیوار پر جما کر اس کے نکلنے کا راستہ بند کیا۔ "کہاں تھیں تم صبح سے۔۔ یہ کیا غنڈہ گردی ہے؟"

"غنڈہ گردی؟" اس کی آنکھیں پھیلی تھیں۔

"ہاں تو اور" وہ اس کے کچھ اور نزدیک آیا۔

"تمہیں دیکھے بغیر میری صبح ہوتی ہے کیا؟" وہ ابرو اٹھا کر اسے پچھلی کچھ صبحوں کی یاد دلا رہا تھا۔

رعنین نے بھی ہنسی روکنے کے لیے زور سے لب بھینچے لیکن روک نہیں پائی۔ میران نے ہر صبح نہ صرف اسے گہری نیند سے جگانے میں پہل کی تھی بلکہ جتایا تھا کہ نیند سے اٹھتے ہی وہ سوئی ہوئی رعنین کو دیر تک محویت سے تکتا رہتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آج کی صبح اس شوق سے محرومی میں گزرا تھا۔

"سوری، وہ بسمینہ سے کل بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا دروازے کا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے آج سے وہ اپنا گھر سیٹ کرے گی۔ تم بھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔۔ اچھا اب ہٹو نا۔ تمہیں شال ڈھونڈ دوں۔" اس نے میران کی کلائی زور لگا کر دور کرتے راستہ بنایا۔

"یار، ٹھنڈ اتنی بڑھتی جا رہی ہے۔۔ ہم کب جائیں گے گھومنے۔" وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے الماری تک آ گیا۔

"گھومنے...... کیوں؟" وہ اچنبھے سے دیکھ

رہی تھی۔ ''یہاں اتنے کام دھندے رکے پڑے تھے۔'' وہ تو روزانہ کے حساب سے بہت مصروف تھی۔

''ارے واہ۔ ہم کیا ہنی مون منانے نہیں جائیں گے؟''

''بس کردو۔ اب کیا وردہ اور زرگل بھائی کی نقل کرنا ضروری ہے؟'' وہ منہ بنا کر کپڑے اُلٹ پلٹ رہی تھی۔

''کتنی سڑیل ہو عنبو۔ ہمارا ہنی مون کسی کی نقل کیوں ہو گیا۔ بھئی ہماری بھی نئی شادی ہوئی ہے۔ ہماری اپنی لائف ہے، ہمیں اس کو انجوائے کرنا ہے۔''

''ہاں ہاں وہ سب ٹھیک ہے۔'' رعنین نے کالی شال اس کے ہاتھوں میں زور دے کر تھمائی ''لیکن مسٹر میران۔ ہمارے کام بہت زیادہ ہیں۔ میں نے اِس حویلی کو سامان سے فارغ کرنا ہے۔ بلکہ مکمل خالی کر کے، اپنا نیا ڈیرے والا مکان سیٹ کرنا ہے۔ کچھ فالتو سامان یاسمینہ کو اس کا کوارٹر سیٹ کرنے کے لیے دینا ہے۔ اوپر سے نواب صاحب نے ٹیکسلا کے مکان کو بالکل نئے زیرو میٹر سامان سے بھر دیا تھا، اس کو بھی وہاں سے یا تو واپس لانا ہے، یا سیل کرنا ہے۔ اُف اللہ۔ یہ سارے کام شروع کب ہوں گے۔'' اور پورے کب ہوں گے۔ وہ تو آج خوب جھنجلائی ہوئی تھی۔

میران نے اس مرتبہ اسے کھلی الماری کے پٹ سے لگا کر پھر سے اس کا راستہ بند کیا۔ اب وہ اسے معنی خیزی سے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

ہو گئی بات مکمل؟ اس کا لہجہ بڑا ہی پرسکون اور دھیما سا تھا۔

''جی ہاں۔ اب خود بتاؤ، یہ کیا کم مصروفیت ہے۔؟''

''ہوم م م۔۔۔ کام تو واقعی بہت ہیں۔ لیکن مسز میران آپ بھی کان کھول کر سن لیں کہ ہنی مون پھر بھی نہیں ٹل سکتا۔ آپ اگر دس کام اور بھی نکال لائیں تو میرا جواب یہی ہوگا۔ کیا سمجھیں۔'' اس نے شرارت سے ابرو اٹھایا۔

''یہی کہ ڈھیٹ نمبر ون ہیں آپ۔'' وہ بھی ہنس دی۔

''اوکے۔ تو اب دماغ لڑواؤ اور جگہ سوچو۔ میں تو کہتا ہوں کسی دوسرے ملک......''

''دیکھو، اب تم پھیلو مت۔ دوسرے ملک کا مطلب ہے، بہت سارے دن۔'' اس نے دائیں بائیں ہاتھ پھیلائے۔

''اوکے بابا۔ تو اِدھر کہاں، اب میں سوات کہوں تو تم اُسے بھی وردہ زرگل کی نقل کہو گی۔ اس لیے ناران، چترال، گلگت، مری۔''

''یا پھر ٹیکسلا......'' رعنین نے آہستہ سے مسکرا کر اضافہ کیا تو میران نے چونک کر رعنین کو دیکھا

''ٹیکسلا؟'' وہ اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''ہوں۔'' وہ شرمیلا سا مسکراتے اب نیچے دیکھ رہی تھی۔

''تم نے اُس روز کہا تھا کہ ٹیکسلا کا ہمارا چھوٹا پیارا سا مکان۔'' وہ اتنا کہہ کر خود ہی چپ ہو گئی۔

''ہوں۔۔ اور۔'' میران کو اپنی بات بھی یاد آ گئی اور رعنین کا شرمانا بھی سمجھ میں آ گیا اس لیے مسکرا کر رُک گیا تا کہ اگلی بات بھی وہی پوری کرے۔

''اور۔۔ یہ۔۔ کہ۔۔ اُس گھر کا کونا کونا۔۔''

''ہاں ہاں۔۔ آگے۔'' وہ جلد باز ہوا جس پر رعنین کو اس کی شرارت سمجھ میں آئی۔ اس نے زور سے میران کے سینے پہ مُکا لگایا۔

''ساری بات تمہیں یاد ہے، مجھ سے کیوں اُگلوا رہے ہو۔''

''تمہارا آئیڈیا سیدھا میرے دل کو لگا ہے عینا۔۔ میرے دل میں اُس مکان کے حوالے سے واقعی بہت شرمندگی ہے۔ اور اِس شرمندگی اور پچھتاوے کے ازالے کے لیے اس سے بہترین موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم پورے ایک ہفتے کے

لیے اپنے گھر واپس جائیں گے۔ کھانا پینا، آؤٹنگ، باتیں، میوزک، مویز، پیار محبت، کتنا کچھ ہے جو ہم نے وہاں مس کیا۔"

"ہاں بالکل۔ وردہ بھی کتنی خوش ہو جائے گی اور واپسی پر ہم اس گھر کے سامان کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ طے کر لیں گے۔"

"ہاں بھئی نکالو۔۔ اور کام نکالو۔" میران نے اسے گھورا جس پر وہ ہنستی ہوئی اس کے بازو کے نیچے سے نکل گئی۔

"اچھا سنو، زرگل نے کہا ہے وہ لوگ پرسوں سوات سے واپسی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس دو دن ہیں۔ یہاں کے جتنے کام کاج دیکھنے ہیں، اسی دوران نمٹالو۔"

"ہاں۔ کم از کم بسمینہ کا کوارٹر تو سیٹ ہو جائے گا۔" وہ ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"ارے بھابھی۔ سات ماہ کے بچے کو بڑی کیئر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیکھو تو ذرا ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔ عابدہ پھوپھو بڑی دکھ بھری نظروں سے نوریا کے ننھے بچے کو دیکھ رہی تھیں۔ رابیل اور حسن بانو نے ذرا کی ذرا ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں چرالیں۔ دونوں ہی جانتی تھیں کہ کسی پرائے کا آ کر نو ماہ کے بچے کو سات ماہ کا کہہ جانا انہیں کتنا سکون دیتا تھا۔ ایک بہت بڑی مصیبت تھی جو نوریا کے سر سے ٹل گئی تھی۔ وجہ صرف اتنی سی تھی کہ نوریا نے دوران پریگنینسی اپنا بالکل بھی خیال نہ رکھا تھا۔ جس کے نتائج بچے کی کمزور صحت کی صورت سامنے ظاہر ہوئے تھے۔

"بچے کا باپ کہاں ہے؟ اسے چاہیے بچے کا اچھا سا علاج کروائے۔ اسے تو دنوں میں صحت مند کیا جا سکتا ہے۔ اسے بھلا کون سی روپے پیسے کی کمی ہے۔" اب وہ بھی عابدہ پھوپھو تھیں۔ باتوں سے بات نکالنا اور ہر اگلے جملے پر ان لوگوں کا گھیراؤ کرنا ایک وہی جانتی تھیں۔

"وہ۔۔ تو۔" حسن بانو نجانے جواب میں کیا کہنے والی تھی، پر رابیل نے جملہ بیچ میں ہی اُچک لیا

"ہاں پھوپھو۔ وہ بھی آیا تھا۔ بچے کی صحت کی بڑی فکر کر رہا تھا۔ وہ آج کل اپنے دوستوں وغیرہ سے چلڈرن ہاسپٹلز کے بارے میں معلومات لے رہا ہے۔۔ کل آنا ہے انھوں نے۔۔ ہے نا۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ساس کو دیکھا تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

"یہ نوریا کیوں اتنی چُپ چُپ رہتی ہے۔" اب کے عابدہ پھوپھو نے ایک نیا حملہ کیا۔

"بیٹے کا سُن کر بہت خوش تھی۔ لیکن اس کی صحت کی وجہ سے دکھی رہتی ہے۔" رابیل دل ہی دل تو ان کے بے تکے سوالوں سے بڑی زچ ہو رہی تھی لیکن جواب بھی اس نے ہر بات کا بڑے سبھاؤ سے دے دیا تھا۔

"ہاں بھئی۔ اولاد چیز ہی ایسی ہے۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔ اب وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں جا کر کچھ دیر بھائی سے حال احوال کیا اور جونہی وہ باہر نکلیں، حسن بانو نے اپنا سر تھام لیا۔ آگے کوئی بھی مہمان آئے رابیل۔۔ تم ہی سنبھالنا۔ مجھ سے نہیں دیے جاتے لوگوں کے اوٹ پٹانگ سوالوں کے جواب۔

"جی امی۔ ٹھیک ہے۔ پریشان نہ ہوں آپ۔"

"اور میرے لیے گیسٹ روم بھی سیٹ کر دو۔ اِدھر نوریا کو کمرے میں بچہ نہیں برداشت، وہاں مہربان صاحب اسے رکھنے کو آمادہ نہیں ہوتے۔ وقار کا بھی الگ مزاج بگڑا ہوتا ہے۔ ورنہ میں جانتی ہوں تم تو سینے سے لگانا چاہتی ہو۔ لیکن خیر۔ اللہ نے شاید اسی دن کے لیے مہلت دے رکھی تھی۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اندر کمرے میں چلی گئیں۔

رابیل تاسف سے ان کی پشت کو دیکھے گئی۔ سب سے پہلے اس نے وقار سے کہا تھا کہ نوریا بچے کو

اپنے قریب نہیں لانا چاہتی اس لیے بچہ میں لے لیتی ہوں۔ ہدیٰ بھی خوش ہوجائے گی اور ہمیں بھی دوسرے بچے کی خوشی مل جائے گی لیکن وقار کا سن کر ہی پارہ ہائی ہوگیا تھا۔ اُسے کسی قیمت پر "ایسا" بچہ قبول نہیں تھا۔ یہی حال مہربان صاحب کا تھا۔ وہ بھی بچے کو دیکھنا تک نہیں چاہتے تھے۔ نوریا کی مجبوری تو سب سے الگ تھی۔ رابیل اور حسن بانو دونوں ہی اسے نفسیاتی مریض بنتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ تب ہی اس سے کہتی ہی نہ تھیں کہ وہ بچے کا خیال رکھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی بچہ ابھی تک نوریا کے کمرے میں ہی تھا۔ اس کا خیال البتہ حسن بانو اور رابیل رکھتی تھیں۔ لیکن نوریا کی خاموش نگاہوں میں رابیل کو صاف ایک بے بسی دکھائی دیتی۔ بچہ اتنے قریب ہو تو نظر بھی پڑ جاتی ہے۔ پھر اس کی آواز اس کا رونا، وہ کہاں تک گریز کرتی، رابیل نے اس صورت حال کو دیکھتے امی کو گیسٹ روم میں شفٹ ہونے کا مشورہ دیا۔ دونوں نے یہی طے کیا کہ دن بھر کے دوران وہ باری باری اس کا خیال رکھیں گی اور رات کو امی اس کے پاس رہیں گی۔

نوریا اب چلنے پھرنے لگی تھی۔ کمرے میں جگہ جگہ بچے کی چیزوں کا ہونا بھی الگ ذہنی خلفشار کا باعث تھا۔ رابیل نے اُسی دن گیسٹ روم سیٹ کرکے بچے کا سارا سامان وہاں شفٹ کردیا۔ رابیل کے کمرے کو پہلے جیسا کردیا گیا۔ مہمانوں کے لیے رابیل نے ہی بہانہ گھڑا کہ نوریا کا کمرا بہت ٹھنڈا رہتا ہے اور سردیوں کے موسم کے لیے اچھا نہیں ہے۔ اس لیے وہ یہاں شفٹ ہوگئی ہے۔ اب تو بس بچے کی صحت پر توجہ دینی تھی۔ حسن بانو نے اس کا نام علی احمد رکھا تھا۔

☆☆☆

پچھلے دو دنوں سے وہ مسلسل میران لالہ کے فارم ہاؤس جارہا تھا۔ پہلا دن تو یوسف چاچا سے کام کاج سمجھنے میں گزرا۔ اس روز تاج نے پوری زمین کا چکر لگا کر ایریا سمجھا۔ فارم ہاؤس کو دیکھا، اپنے کام کی نوعیت جانی۔ لیکن آج دوسرے دن دو مزدور لگا کر اپنی نگرانی میں فارم ہاؤس کی صفائی کروائی۔ یوسف چاچا کا پیچھے اپنا ذاتی مکان تھا اس لیے فارم ہاؤس خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ پر اب تاج کو یہاں رہنا تھا۔ دو بڑے کمرے، ان کے آگے کھلا سا برآمدہ اور برآمدے کے دونوں کونوں میں سے ایک سائیڈ پر کچن اور دوسرے میں باتھ روم تھا۔ سادہ سے فارم ہاؤس کا فی الحال تو یہی نقشہ تھا اور جسے صرف صفائی وغیرہ اور ضروری سامان کی مدد سے رہنے کے قابل بنایا جاسکتا تھا۔

میران نے اسے کہا تھا کہ رات کو وہاں رہنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ وہ دن بھر کے کام کاج نمٹا کر رات کو اپنے گھر آجایا کرے۔ اُس وقت وہ گھر سے کھانا کھا کر میران لالہ کی حویلی کے گیٹ پر آیا تاکہ لالہ کو دن بھر کا حال دے سکے۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ اس نے بیل بجائی لیکن شاید اندر نہیں گئی کیونکہ کچھ دیر گزر جانے پر بھی کوئی رسپانس نہیں آیا تو اس نے گیٹ بجایا۔ انداز میں جھجک سی تھی کہ کہیں میران لالہ سو نہ چکے ہوں۔

"کون؟" اندر سے نسوانی آواز تھوڑی ہی دیر میں سنائی دی۔

"میں تاج... وہ لالہ سو تو نہیں۔"

بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی کہ گیٹ کھول دیا گیا۔ اور سامنے... تاج کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ اس نے یسمینہ کی آواز بھی نہیں پہچانی تھی۔ وہ سامنے کھڑی اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

"تم...... اِس وقت یہاں ہو؟" وہ حیرت سے ہنسا تھا۔

"اپنے گھر رہنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے!" وہ خوش گوار موڈ میں اسے بتا رہی تھی۔

"اچھا...... تم آگئیں یہاں؟" تاج نے دروازے کی تعمیر تو ہوتے دیکھی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ یسمینہ اتنے جلد یہاں شفٹ ہونے والی ہے۔

"ہاں۔ آج ہی آئی ہوں۔"

''اکیلی رہو گی؟''
''نہیں اماں ہوں گی پاس۔''
''ابھی ہے اندر؟ تاج کے انداز میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔''
''ہاں۔ وہ سو رہی ہے۔''
''لالہ بھی شاید سو چکے ہوں گے۔ میں پھر صبح آؤں گا۔'' تاج کو محسوس ہوا کہ یہاں ان دونوں کی موجودگی اس وقت کچھ آکورڈ سی ہے۔ اسے چلے جانے میں ہی بہتری نظر آئی۔
''تاج!'' بسمینہ نے بے ساختہ پکار لیا جس پر وہ رک کر پلٹا۔ لیکن پکار لینے کے بعد بسمینہ بھی گھبرا کر نیچے دیکھنے لگی۔
''کیا ہوا۔ بتاؤ نا!'' وہ پلٹ آیا تھا۔
''وہ۔ بابا نے۔۔ اُن لوگوں کو......''
''کیا۔۔ اُن لوگوں کو کیا؟'' تاج کا چہرا زرد پڑ گیا۔ وہ بلا لحاظ اندر تک چلا آیا۔ اس وقت وہ عین بسمینہ کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کی مختصر سی بات نے تاج کے ہوش ہی اُڑا دیے تھے۔
''کہو بسمینہ۔ کیا ہوا ہے؟'' وہ اس کا بازو جھنجوڑ رہا تھا۔ بسمینہ نے شکوہ بھری نظروں سے پہلے اس کے ہاتھ اور پھر آنکھوں میں دیکھا۔
''انکار کر دیا ہے پاگل۔'' وہ آخر میں مسکرانے لگی، اور تاج ماتھے پر ہاتھ مارتے گیٹ سے لگ گیا۔
''اُف۔۔ تم نے جان نکال دی میری۔ لیکن مینے۔۔ وہ فوراً سیدھا ہوا ''یہ ہوا کیسے؟''
''وہ۔ تو بس۔ میں اماں کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ تو بابا آگئے اوپر سے۔ انہوں نے رونے کی وجہ پوچھی تو اماں نے بتا دیا کہ وہ اتنے دور شادی کر کے نہیں جانا چاہتی۔ اب پتا نہیں شاید بابا بھی دوسرے گاؤں کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے، اسی دن ان کو جواب دے دیا۔ اماں کو بھی جھاڑ دیا کہ جب بسمینہ کی مرضی نہیں تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا۔''
''چلو شکر ہے۔'' اس نے ایک اطمینان بھرا گہرا سانس نکالا۔
''ہاں شکر ہے۔ کسی کے ماں باپ تو اس کی سنتے ہیں۔''
بسمینہ نے اسی کی بات اپنے انداز میں مکمل کی اور گیٹ بھی بند کر دیا۔ جبکہ تاج لب بھینچے بند گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ بسمینہ کا طنز تیر کی طرح سینے میں پیوست ہوا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پچھلے روز میران سر سیف سے ملنے گیا تو اسے گاؤں والوں کے کالج سے متعلق خیالات جان کر بہت حیرت ہوئی تھی۔ کچھ باتیں تو اتنی شاکنگ تھیں کہ میران بس بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کچھ دیر کے لیے واقعی یوں لگا جیسے کالج کا خواب شاید ہمیشہ کے لیے ایک خواب ہی رہ جائے۔ انہوں نے بتایا کہ اب تو عرصہ ہوا انہوں نے نئے کالج کی بات ہی کرنا چھوڑ دی ہے، وہ تو صرف ٹیوشن اکیڈمی کے لیے بچے اکٹھے کرنا چاہ رہے تھے پر یہاں کے بڑے مشر خان حاجی صبغت اللہ نے اس کے لیے بھی بچوں کو منع کر دیا۔ انہوں نے کہا برسوں سے یہ منحوس پہاڑی ایسے ہی واقعات سے بھری ہے۔ یہاں سے اپنے بچوں، بچیوں کو دور ہی رکھا جائے۔ اور جب بڑے خان جی کا ایسا حکم ہے تو یہاں کون ہے جو حکم عدولی کرے۔
''لیکن مجھے بتائیں سر۔ میں کیسے ہتھیار ڈال دوں۔ ایک اچھے مشن کی راہ کو بے قصور ہوتے ہوئے کیسے ترک کر دوں۔ اور ویسے بھی سر، جن واقعات سے یہ پہاڑی بھری پڑی ہے، سب کے پیچھے اثر تھا۔ میرا قصور کیا اتنا ہے کہ برسوں پہلے مجھے استعمال کیا گیا۔ اور سر، میں نے آتے ہی کہا بھی تھا کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ بھرے جرگے میں سب کو فیس کرنے کو تیار تھا۔ تب بھی اِسی بدذات نے آڑے آکر منع کر دیا تھا۔'' میران جوں جوں سنتا جا رہا تھا۔ اس کا پارہ مزید ہائی ہو رہا تھا۔ اب تو وہ اپنے مشن کی تکمیل کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں میران۔ سب سمجھتا ہوں۔ کیا میں نے کوشش نہیں کی ہوگی۔ لیکن میران مجھے لگتا ہے یہ بھی گاؤں والوں کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی ترقی ایک بھی زینہ چڑھ نہیں پا رہی۔"

"میں ہار نہیں مانوں گا سر۔" میران گہرے گہرے سانس لیتا سر کو نفی میں ہلا رہا تھا۔ بے چینی سے انگلیاں چٹخاتے وہ اس وقت بری طرح ڈسٹرب تھا۔

"کیا کرو گے؟" سر سیف اللہ اسے سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔

"کل ہم خان حاجی کے ڈیرے پر جائیں گے۔ اُن سے خود ملوں گا۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میں سچا ہوں سر تو۔۔ آخر میرا سچ ان پر اثر کیوں نہیں کرے گا؟" وہ جھنجلا سا گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلے جائیں گے۔ لیکن میران، میری ایک بات بڑے تحمل سے سنو......" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "تم کم عمر ہو، زندگی میں مشاہدات و تجربات بھی کم دیکھے اور جھیلے ہیں۔ اتنا ضرور سوچ کر جانا کہ جواب میں مایوسی بھی ہاتھ آسکتی ہے۔ زندگی میں ہم کتنا کچھ پلان کرتے ہیں۔ کبھی کچھ تو مل نہیں جاتا۔ اگر بڑے خان نہ مانیں تو ترش مت ہونا۔"

"یعنی آپ کو لگتا ہے کہ بہتری کی اُمید نہیں ہے۔"

میران کو لگ رہا تھا اس کے خون میں واضح اُبال اُٹھ رہے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے خود پہ کنٹرول کر پا رہا تھا۔

سر سیف اللہ بھی اس کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے، اور زیادہ پریشانی انہیں اگلے روز کے حوالے سے لگی تھی جب میران کو خان حاجی سے مل کر بھی مایوسی ہی ہاتھ آنے والی تھی۔

سیف اللہ خان حاجی صبغت سے مل چکے تھے۔ ان کے خیالات کے متعلق محض سوچ کر ہی انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ معلوم نہیں میران ان کے سامنے کیسے ری ایکٹ کرنے والا تھا۔ اور آج میران گھر سے تیار ہو کر سر سیف اللہ کے پاس جا رہا تھا۔ وہیں سے دونوں نے خان حاجی کے ڈیرے پر اُن سے ملنے جانا تھا۔

"بات صرف اتنا نہیں ہے میران خانا۔" حاجی صبغت نے اپنی لال آنکھیں ناراض انداز میں میران پر جما رکھی تھیں۔ میران نے کن انکھیوں سے سر سیف اللہ کو دیکھا جو بس ہلکا سا کھنکار کر رہ گئے۔

"یعقوب خان خود بھی امارے جرگے کا مشر ہے۔ میں آج تمارا بات مان کر کہ۔۔ تمارا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے، کالج کھلنے کا پرمیشن دے دوں۔ مجھے بتاؤ میں اپنے جرگے میں پھوٹ ڈلوا دوں؟"

"لیکن حاجی خان۔ جرگہ تو انصاف کے اصولوں پر بنتا ہے۔ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ سزاوار صرف مجرم ہونا چاہیے اس کا پورا خاندان نہیں۔ آپ نے تو اپنی زندگی میں نجانے کیسے کیسے فیصلے سنائے ہوں گے۔ کیا ایسی صورت حال سے پہلے کبھی جرگہ نہیں گزرا جب مجرم کے رشتہ دار بلاوجہ نہیں پھنس رہے ہوں۔"

"لیکن اس کا کیا ثبوت ہے میران خانا کہ اِدر ہر قصور کے پیچھے انصر خان ہی تھا۔ معافی چاہتا ہوں پر ام نے تو تمہارا نام بھی سنا تھا۔ اب وہی تم بچوں بچیوں کے کالج کا بات کرنے آئے ہو۔ میں کیسے گارنٹی دوں گاؤں والوں کو۔"

"میری بے گناہی کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔" میران نے اعتماد سے فوراً ہی کہا اور اس جواب پر سر سیف اللہ بھی چونک گئے۔ جبکہ میران نے اسی وقت موبائل کھول کر انصر کا وائس خان حاجی کے قریب کیا۔

"انصر بیٹا، میں اِس وقت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ تمہاری بہن کو اٹھانے یعقوب خان کے آدمی آئے ہیں۔ اِس وقت مجھے میران کی فوری مدد درکار ہے، لیکن اس کی شرط ہے کہ اسے برسوں

پرانے حادثے کا سچ پتا کرنا ہے۔ مجھے بتاؤ انصر کہ وردہ کے ساتھ رابیل کی شادی والی رات کیا ہوا تھا۔ یہ تو میں جان گیا ہوں انصر، کہ وردہ کا مجرم میران ہرگز نہیں تھا۔ کیونکہ اگر یہ کام اس نے کیا ہوتا تو وہ مجھ پر شرط رکھ کر مجھے سچ معلوم کرنے گھر واپس نہ بھیجتا۔ ابھی میرے پاس مشکل سے یہی آدھا گھنٹہ ہے۔ مجھے صرف سچ بتاؤ انصر کیونکہ تمہاری کسی بھی جھوٹی کہانی کی صورت میں بات بہت دور تک چلی جائے گی اور اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو رعنین ان لوگوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اور معلوم نہیں پھر وہ تمہاری بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ جلدی بتاؤ انصر، ابھی کے ابھی، تمہیں اپنی ماں کی قسم۔ دیکھو صبح کی اذان ہونے والی ہے۔ میرے پاس ایک منٹ بھی نہیں ہے۔"

میران کو اگلا وائس کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اس کے فوراً بعد خود ہی چل پڑا۔ اگلی آواز بلاشبہ انصر خان کی تھی۔

"ہاں۔ جیسے ہی میں نے سنا کہ وردہ نے میری شکل نہیں دیکھی تھی تو میں نے میران پر جھوٹا الزام لگادیا۔ وہ اتفاقاً کھڑکی سے نکل رہا تھا تو مجھے اسے پھنسانے کا موقع مل گیا۔ اور دیکھو بابا، خبردار اگر میران کو بھی میرے ٹھکانے کی بھنک بھی پڑی۔ اگر ایسا ہوا تو میں میران کو اور ہر اس شخص کو خود گولیوں سے بھون دوں گا جو میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا۔" انصر نے آخر میں دھمکی آمیز تنبیہ کرتے وائس کا اختتام کیا۔ خان حاجی اور سر سیف اللہ ہکا بکا سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"تو اس کا مطلب یہ بھی یعقوب خان نے ٹھیک کہا تھا کہ لڑکیوں کو بعد میں اُدر سے بھگایا گیا۔"

"جی بالکل۔ میں مانتا ہوں۔ ابراہیم چاچا نے گھر کی بچیوں کو اس صورت حال کا شکار ہونے سے بچایا۔ میں نے ان کی بیٹی سے نکاح کیا اور ہم شہر چلے گئے۔ اب اگر یہ جرگے کی نظر میں کوئی جرم ہے تو میں اس کی سزا بھگتنے کو تو تیار ہوں لیکن اس کے علاوہ میرا دامن ہر جگہ صاف ہے۔" میران نے سنجیدگی اور اعتماد سے اپنے سچ کا اقرار کیا۔ اور خان حاجی سوچ میں پڑ گئے۔

"اب مان لیا بچے، کہ تم قصوروار نہیں ہو۔۔۔ لیکن انصر خان تمہارا رشتہ دار بھی ہے اور اب سالا بھی۔ تو ایسے غلیظ مجرم کے بہنوئی کو بھی اِدھر کون عزت دے گا۔ میرا خیال ہے میران یہ کاج واج کا خواب تو بھول ہی جاؤ۔ کیونکہ تم نے خود سنا وہ حرام خور، کیسی ڈھٹائی اور بدمعاشی سے ڈھونڈنے والوں کو دھمکا رہا ہے۔ اب ہم کو بتاؤ، عزت اور غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے کہ نہیں۔ جب تک ہمارے گاؤں کے عزت دار شریف لوگوں کے سر پر ایسے حیوان مسلط رہیں گے، ہم تو اپنے بال بچوں کا، اپنی عورتوں کا آپ ہی دھیان رکھیں گے نا۔ معافی چاہتا ہوں سیف اللہ خان، پر ہم سے اتنا بڑا اُمید نہ لگاؤ۔" خان حاجی نے ہاتھ لہراتے بالآخر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

میران لب بھینچے خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔ سر سیف نے اسے حوصلے اور برداشت کی تلقین کر کے بھیجا تھا۔ وہ خود پہ جبر کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیف اللہ خان نے بھی اس کے اُٹھ کھڑا ہونے میں عافیت جانی، مزید کسی بحث کی خان حاجی نے گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ وہ دونوں کاج بننے کے خواب کو خود اپنی آنکھوں سے دھواں بن کر تحلیل ہوتا دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے اُسی بجھے مایوس دل سے باہر کی راہ لی۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"سلام مامی۔" بسمینہ نے نسیمہ مامی کو کوارٹر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

وہ اس وقت صحن میں کھڑی کپڑوں والی تار لگا رہی تھی۔ اس کی اماں صبح سویرے اپنے گھر چلی گئی تھی۔ پہلے اس نے وہاں ناشتا بنانا تھا پھر کام کاج پر نکلنا تھا۔ بسمینہ کا کوارٹر سیٹ ہونے میں ابھی اگرچہ کچھ ٹائم تھا لیکن رعنین کو پتا تھا وہ جتنے جلدی

نئے گھر جائے گی۔ اتنے جلدی نسیمہ کا دماغ کھلنا شروع ہوگا۔ صرف کہہ دینے سے وہ اثر نہیں ہوتا جو بسمینہ کو نئی اچھی جگہ دیکھ کر پڑ سکتا تھا۔ آج بھی رعنین نے جان بوجھ کر کسی کام کے بہانے نسیمہ کو کوارٹر بھیجا۔ اور وہ اب بھی کوارٹر کو دیکھتی اور کبھی بسمینہ کو۔ اسے اب سے پہلے واقعی یقین نہیں تھا کہ رعنین بی بی کوارٹر بسمینہ کو دے دیں گی۔ پر یہ تو دنوں دنوں میں ہو بھی گیا۔ بسمینہ تو کسی مالکن کی طرح گھر میں گھوم پھر رہی تھی۔ رعنین کی حویلی کا بہت سا اچھا اچھا سامان بھی یہاں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تجسس کے مارے اندر کمروں تک چلی آئی۔ پلنگ، پردے، الماری، کرسیاں وہ منہ کھولے یہاں کی آن بان دیکھ رہی تھی۔ یہ کوارٹر بھی استعمال نہیں ہوا تھا اس لیے بالکل نیا لگ رہا تھا۔ اوپر سے اتنا عمدہ سامان۔ وہ بھی اکیلی بسمینہ کا۔ وہ تو کھولتی ہوئی گھر واپس آئی۔

تاج اپنے بابا کے ساتھ کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ حسب عادت سر لپیٹ کر لیٹ گئی۔

''یوسف چاچا نے تو آج مجھے چابیاں بھی حوالے کر دیں......'' تاج نے اپنی جیب سے ایک بھاری گچھا چابیوں کا نکال کر بابا کو دکھایا۔ ''کل رقبے کا چکر لگاؤ بابا۔ دو دن مزدور کیا لگائے، اُدھر فارم کا تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب تو لالہ نے کہا ہے یہاں والے ڈیرے سے نئی کھاٹیں پردے، قالین، باورچی خانے کا سامان بھی وہاں لے جاؤں، بس میں سوچ رہا ہوں کل صفائی کروا لوں اچھی طرح پھر سامان بھی سیٹ کرتا ہوں۔''

''کیوں یہ لوگ خود نہیں جا رہے ہیں؟'' نسیمہ نے پہلی بار مداخلت کی۔

''نہیں۔ لالہ تو اب واپس آگئے ہیں۔''

''تو سامان کیوں بانٹا جا رہا ہے۔ اُدھر بسمینہ کو تو دیکھو۔ نت نئی چیزیں بٹور کر مہارانی بنی بیٹھی ہے۔'' نسیمہ کے اندر کی جلن زبان پر آہی گئی۔

تاج نے اپنی ہنسی ہونٹوں میں ہی دبا لی۔ بظاہر چہرا بالکل سنجیدہ کر لیا۔

''بھئی ان کے پاس ساز و سامان کی کوئی کمی ہے کیا۔ لالہ نے تو اُدھر ٹیکسلا میں بھی کتنا کچھ خرید لیا تھا۔ بڑے لوگ تو ویسے شوقیہ بھی نیا سامان خرید سکتے ہیں۔''

''ارے تم اس کو چھوڑو......'' عالمگیر نے ہاتھ جھٹک کر تاج کو اپنی طرف متوجہ کیا ''وہ جو تم چھوٹے خان سے چابیاں بھی لے آئے ہو، اب ان کو انکار کیسے کرو گے؟''

''انکار؟'' تاج کے ابرو کھنچ گئے۔ ''انکار کیوں کروں گا؟''

''ارے واہ۔ جادو جانتے ہو تم، کہ دو، دو گاؤں کا کام سنبھالو گے۔ چابیاں لینے سے پہلے میران خان کو بتاتے تو سہی کہ تمہارا تو دوسرے گاؤں بیاہ ہونے والا ہے۔ پوچھو اپنی ماں سے۔ وہ لوگ تو کل مٹھائیاں لے کر یہاں آرہے ہیں۔''

''ہیں...... کیوں؟'' تاج پورا ماں کی طرف گھوم گیا۔ ''اماں تمہیں نہیں پتا، میں میران لالہ سے وعدہ کر چکا ہوں، اب دھوکا ہرگز نہیں دوں گا۔ مجھے کسی نے گھر داماد بنا کر بھیجنے کی کوشش کی تو میں کچھ کر گزروں گا۔'' وہ ایکدم ہی طیش میں آگیا تھا۔ اور اپنی کہہ کر اسی غصے میں باہر بھی نکل گیا۔

نسیمہ نے غصے سے شوہر کو گھورا۔ ''اب تم سے کس نے کہا ابھی یہ بات چھیڑ دو۔''

''اچھا تو م[illegible] غلط ہوں؟'' عالمگیر اس پر اُلٹ پڑا ''اور تم کیا [illegible]ں ہو۔ نہ تم دوسرے گاؤں والوں کو جواب دے رہی ہو۔ نہ تاج کو منع کرتی ہو کہ میران خان کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے۔ چاہتی کیا ہو؟''

''میں تو خود مصیبت میں آگئی......'' نسیمہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ''کہاں جا کے مروں؟''

''مرنے ورنے سے کچھ نہیں ہوگا، کسی ایک فیصلے پر پہنچو بی بی......'' عالمگیر کا لہجہ طنز سے بھرا تھا۔ ''اور ذرا یہ تو بتاؤ مجھے۔ لڑکے والے ہم ہیں اور تاریخ مانگنے وہ آرہے ہیں۔ ہمارے بیٹے کو چھین کر لے

جانا چاہتے ہیں اور تم خوش ہو رہی ہو۔ اب وہ تمہارا بیٹا صاف کہہ گیا ہے کہ اسے گھر داماد نہیں بننا۔ اب بتاؤ، کیا کرو گی؟"

"ہائے اللہ۔ تو منع کر دوں؟" نسیمہ کا منہ اتر گیا۔

"جو کرنا ہے، آج ہی کرو۔ کل وہ لوگ آ گئے، دھوم دھام کے ساتھ تو تم ہی انکار نہیں کر سکو گی۔"

"ارے۔ اب جا کہاں رہے ہو۔ دیکھو مجھ سے نہیں ہوتی بات وات۔ خود نمبر ملاؤ نا۔" وہ عالمگیر کو جاتا دیکھ کر حواس باختہ سی ہو گئی۔

"منع ہی کرنا ہے نا؟" عالمگیر نے مڑ کر تائید چاہی۔

"نسیمہ نے منہ بسور کر خاموشی سے عالمگیر کو دیکھا پھر کندھے اچکا دیے۔"

"میری کوئی کہاں مان رہا ہے۔ تو کرو تم اور تاج اپنی مرضی۔"

"ہوں۔" عالمگیر پر تو جوان بیٹے کا اتنا پریشر تھا کہ وہ تو بالکل بھی اس کے خلاف نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت باہر نکل کر لڑکی کے باپ کو کال ملا دی۔ اگلے دن ان لوگوں کا یہاں تک چلے آنا اور جواب میں انکار سننا زیادہ شرمندگی کا باعث تھا، اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ فون کال پر انہیں آنے سے منع کر دیا جائے۔ عالمگیر نے اُسی وقت لڑکی کے باپ سے کہہ دیا کہ ابھی ہم ذرا سوچ بچار میں ہیں۔ ہمیں تھوڑا وقت چاہیے۔ جانتا تھا سننے میں برا ہی لگا ہوگا، لیکن بات کے بہت آگے تک بڑھ جانے سے کہیں بہتر تھا۔ اور ایسا جواب دے لینے کے بعد اگلے مرحلے میں پیچھے ہٹ جانا بھی زیادہ تعجب کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔ لڑکی کا باپ ایک سمجھدار آدمی تھا۔ اس ایک کال سے بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہوگا۔

عالمگیر کی ذاتی خواہش بھی یہ تھی کہ اس کی بھانجی بسمینہ اس کی بہو بن کر آ جاتی۔ اور آج تو وہ یہ سن کر بے حد خوش ہوا تھا کہ اس کا بیٹا چھوٹے خان کا بھروسے مند آدمی بن رہا تھا۔ پھر کمانے لگا تھا۔ سب سے بڑھ کر اپنے گاؤں اپنے گھر میں تھا۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ نجانے یہ نسیمہ کے دل میں کیا سمائی تھی کہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو گھر داماد بنا کر دوسرے گاؤں روانہ کرنے والی تھی۔ عالمگیر نے دل میں تہیہ کیا کہ اب نسیمہ چاہے برا منائے یا اچھا۔ تاج کو وہ کسی قیمت پر دوسرے گاؤں نہیں بھیجے گا۔

☆☆☆

میران اور رعنین جب ٹیکسلا کے لیے روانہ ہوئے تو انہوں نے زرگل اور وردہ کو بھی بتا دیا، وہ دونوں پچھلے روز ہی واپس آ گئے تھے۔ راستے میں ہی وردہ کی کال آئی کہ وہ پہلے اُن کی طرف آئیں۔ میران نے بہت کوشش کی جان چھڑوانے کی، جانتا تھا زرگل اہتمام کرنے کے چکر میں ہے لیکن اُن دونوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اور اب وہ دونوں ڈنر کر کے ان کے ہاں سے نکلے تھے۔

رعنین نے نوٹس کیا کہ میران کچھ چپ چپ تھا۔ وجہ تو اسے بھی معلوم تھی۔ حاجی خان کے ڈیرے سے واپسی پر میران نے خود ہی اسے وہاں کا احوال سنایا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان تھا۔ اور وہ تو ٹیکسلا ہی آنا نہیں چاہتا تھا۔ رعنین نے ہی اس کے موڈ کو دیکھتے ضد پکڑ لی کہ وہ ٹیکسلا ضرور جائیں گے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اس پریشان کن سچویشن میں میران کو گھر پہ نہیں رہنا چاہیے۔ ماحول کی تبدیلی اس موقع پر اشد ضروری تھی۔ اس نے بہانہ بنایا کہ بسمینہ کو کچھ ضروری سامان ارجنٹ دینا ہے، اس کے لیے ٹیکسلا کا نیا سامان واپس آئے گا تبھی وہ پرانا سامان بسمینہ کو دے گی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی جو بھی رائیل آپی کو پتا چلا کہ کالج اب نہیں بن رہا تو اس نے اُن دونوں کو شہر آ کر رہنے کی صلاح دی تھی۔ لیکن رعنین ابھی اس حالت میں بالکل میران سے یہ نہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے گھر اور گاؤں سے بھی دور ہو جائے۔

چاروناچار میران نے سفر کا ارادہ باندھ لیا۔ اور اب وہ دیکھ رہی تھی کہ اتنا بہت سارا وقت گزر جانے پر بھی اس کا موڈ تبدیل نہ ہو سکا تھا۔ زرگل

سے ملنے پر اسے یقین تھا کہ میران کے مزاج میں بدلاؤ آئے گا لیکن وہ تو ان کے گھر سے رخصت ہوتے بھی اسی طرح خاموش دکھائی دے رہا تھا۔
جس وقت وہ دونوں اپنے گھر پہنچے، رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ رعنین نے آتے ہی ہلکی جھاڑ پونچھ سے کمرے کو صاف کیا۔ کھانے پینے کا کچھ ضروری سامان انہوں نے راستے میں لے لیا تھا۔ رعنین نے کچن میں آکر دو کپ کافی بنانا شروع کی تو دیکھا کہ میران چھت کی طرف جا رہا تھا۔ رعنین نے بجائے اس کی واپسی کا انتظار کرنے کے کافی کی ٹرے اُٹھائی اور خود بھی چھت پر آگئی۔ یہاں پہلے کی طرح دو چارپائیاں، دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پہ رکھ کر میران کا کپ اٹھایا اور اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ وہ بالکنی میں کھلتے دوسرے دروازے میں کھڑا تھا۔
"کافی۔" اس نے کپ آگے کیا
"ہوں۔" وہ کپ لے کر دوبارہ رخ پھیر گیا۔
"کیا ہوا ہے میران۔ کب تک پریشان رہیں گے۔ ابھی اور کتنے کام ہیں ہمارے لیے۔ ہم ان پر دھیان دیتے ہیں نا۔" ہم اپنا فارم ہاؤس بنواتے ہیں...... یاد ہے آپ نے...... کہا...... تھا۔"
اسے بات کے دوران ہی بریک لگنے لگی کیونکہ میران نے اسے خوب گھور کر دیکھا تھا۔ جانتی تھی وہ بلاوجہ کی عیاشی اور فضول خرچی سے سخت بیزار تھا۔ اور وہ بھی ان سب باتوں پر کہاں سوچ رہی تھی۔ اُسے تو میران کا موڈ ٹھیک کرنا تھا۔
"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا......" وہ ایک گہری آہ بھر کر پہلی بار بہت آہستہ سے بولا تھا۔ "بُرا کرنے والوں کی تم پہنچ دیکھو......" وہ جیسے دور کسی گہرے خیال میں کھویا تھا۔ "ایک سلسلہ ہے رعنا، جو معصوم بچیوں کی تباہی سے شروع ہوتے کتنا طویل ہوتا جا رہا ہے۔ برائی کی جڑیں کیوں اتنے دور تک پھیل جاتی ہیں کہ اچھائی کا ننھا سا پودا چاہ کر بھی وہاں سروائیو نہیں کر سکتا۔ معصوم چھوٹی بچیوں کی اپنی ذاتی زندگی، پھر ان سے جڑی اُن کی فیملیز، پھر خاندان، اور اب پورا ایک گاؤں کا گاؤں کہ جس کو تعلیم کی روشنی سے منور کرنے کا خواب ہمیشہ کے لیے ایک خواب رہ جائے گا۔ صرف اِس لیے کہ ایک بدبخت انسان کے قبیح اعمال اس پر ایک سیاہی ایک دھبہ بن کر پھیل رہے ہیں۔ اظہر جیسے لوگ اگر ناسور ہیں تو... یہ تو نری تباہی ہے رعنا۔ یہ ناسور اگر معاشرے میں پھیلتا چلا گیا تو اس کا انجام۔ کیا راہ میں آنے والے ہر انسان کی بربادی؟" "تو پھر کچھ اچھا ہونے کی امید کیسے لگائیں؟ وہ اب بپھر رہا تھا۔
"اچھا بھی ہوگا میران... اور اچھا ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے بسمینہ کو دیکھو۔ اُس نے کتنے برے حالات دیکھے ہیں۔ پر آج وہ اپنی نئی زندگی جینے کا خواب بُن رہی ہے۔ برائی تباہ حال زندگی سے اگر آج اس کا دامن چھوٹ گیا ہے تو یہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ وردہ کی خوشیوں بھری ہنستی مسکراتی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے۔ جبکہ اس کا ایک طویل اور تکلیف دہ ماضی ہے جسے میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس میں بہتری کے مجھے خود بھی امکان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ لیکن وردہ کی خوشیوں بھری زندگی سوائے ایک معجزے کے کچھ نہیں اور معجزے اللہ پاک دکھاتا ہے... پھر میں ... اور ... تم......" وہ کچھ جھجک سی گئی۔ لیکن پھر آگے آتے پہلے اپنا ہاتھ اور پھر اپنا سر نرمی سے میران کے کندھے پر رکھ دیا۔ "میران تم اگر میری زندگی میں اپنی اہمیت جان لو تو آج ہمارے ایک ہونے کی ہر وجہ تمہیں سمجھ میں آجائے گی۔ بلکہ تمہاری زندگی میں اپنی اہمیت بھی کیا میں نہیں جانتی۔ ہماری زندگی سے اچانک تمام رکاوٹیں کا دور ہٹ جانا، اور قدرت کا اتنے جلد ہم پر مہربان ہونا کیا یہ معجزے سے کم ہے۔"
"لیکن رعنین۔ کیا یہی تھا ہماری زندگی کا مقصد۔ محض ایک دوسرے کو پالینا......" وہ اس کی قربت کے زیر اثر دھیما تو پڑا تھا لیکن اپنے اندر سے یہ احساس نکالنا بہت مشکل تھا کہ اسے اب یہ زندگی

خود پر تنگ لگ رہی تھی۔ "ایسا کیوں لگ رہا ہے عینو۔۔جیسے۔۔جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ جیسے جینے کا اب کوئی جواز نہیں رہا۔ آگے بڑھنے کے لیے نہ راستہ سجھائی دے رہا ہے۔ نہ ہی قدم ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ میں کیا کروں رغنین۔۔۔ میں کیا کروں۔"

وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اور وہ رو رہا تھا۔ سسک سسک کر روتے یوں لگا جیسے وہ چیخنا چاہتا ہے۔ اپنی بے بسی اب خود اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ رغنین اس کی پشت پر تھپکیاں دیتے خود بھی روئے جا رہی تھی۔ اور اس لمحے وہ میران سے زیادہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کا محبوب کتنی ذہنی اور اعصابی اذیت جھیل رہا تھا۔ پر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ کر پا رہی تھی۔ اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے اختیار میں تھا ہی کیا۔

☆☆☆

"کیا کہا۔۔سچ کہو۔" فردوس کی آواز میں پہلے تو اچانک ہی ہنسی شامل ہوئی اور پھر اگلے ہی پل ان کا لہجہ بھیگ سا گیا۔ رابیل نے اگرچہ سوچ سمجھ کر ہی انہیں مطلع کیا تھا لیکن وہ فردوس چاچی کے ایسے ردعمل کی توقع بھی نہیں کر رہی تھی۔ نوریا کے بیٹے کو پیدا ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور انہوں نے ابھی تک اس کے سسرال اطلاع نہیں دی تھی۔ وجہ بھی اگرچہ اسے خوب معلوم تھی اور اُسے کسی سے مشورے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ بچہ نہ تو انصر کا تھا اور نہ ہی ان کے ہاں اس بچے کی ولادت کسی کے لیے باعث خوشی ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر بتانا ضروری نہیں تھا تو چھپانا بھی غلط تھا۔ وردہ کی شادی کے موقع پر سب کی موجودگی کی وجہ سے فردوس چاچی اور اس کے درمیان نوریا کا موضوع نہیں آیا تھا۔ لیکن جس انداز میں انصر اپنی بیوی کو ان کے ہاں پھینک گیا تھا اس کا خیال تھا کہ گھر والوں کو بھی اس تنازع کی ضرور خبر ہو گی۔ لیکن ابھی جو فردوس چاچی کی خوشی تھی، وہ اُلٹا رابیل کو حیرت میں ڈال رہی تھی۔

"آں۔۔جی چاچی۔" وہ مختصراً بس یہی کہہ پائی۔

"اچھا میں تمہارے چاچا کو بتا دوں۔ اور۔۔۔ نام کیا رکھا ہے؟" وہ جاتے جاتے رکی تھیں

"علی احمد۔"

"ماشاء اللہ۔ جیتا رہے۔ رابیل بچے مجھے تصویریں تو بھیجو میرے پوتے کی۔"

"جج۔۔جی جی چاچی۔" اس نے گھبرا کر فوراً ہی کال کاٹ دی۔

وہ اگر اطلاع دینا اپنا فرض سمجھ رہی تھی تو جواباً چاچی کی طرف سے گالیوں کوسنوں کی توقع بھی، جو وہ نوریا کو سنانے والی تھیں۔ لیکن یہ بات اس کے لیے شاکنگ تھی کہ انصر نے اپنے اور نوریا کے بیچ کے اتنے سیریس تنازعہ کی گھر والوں کو ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی۔ اُدھر دوسری طرف فردوس کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔ خان جی اس وقت گھر پر تھے، اور کسی بھی وقت ڈیرے کی طرف جا سکتے تھے، اس لیے وہ سب سے پہلے اندر بھاگیں۔

"خان جی۔ رُکیں گے کچھ دیر۔ بہت خوشی کا خبر ہے۔"

"خوشی کا خبر......" وہ استہزائیہ ہنسے۔ "اِدھر تو مڑا، بم بلاسٹ ہوتے ہیں۔ خوشی کا خبر کون سے آسمان سے ٹپکا ہے۔" وہ اپنی چپل کے بکل بند کر رہے تھے اور آج باقی دنوں کی نسبت قدرے اچھے موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔

"ہم دادا، دادی بن گئے ہیں خان جی۔ ہمارے انصر کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔"

"ہیں۔" ابراہیم خان کا ماتھا ٹھنکا۔ "کیا بول رہی ہو، اتنے جلدی...... بچہ؟؟

"ہوں؟" فردوس ان کی بات پر چونکی اور اب پچھلے کچھ وقت سے انگلی لبوں پہ رکھے خود بھی اسی سوچ میں گم تھیں۔

"یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔۔۔ اور۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل کھولا۔ رغنین نے پچھلے دنوں ہی ماں کو ذاتی موبائل لے دیا تھا تاکہ وہ ان

سے رابطے میں رہے اور اس کا استعمال بھی سکھایا تھا۔
فردوس نے واٹس ایپ کھولا تو رابیل نے بچے کی تصویریں بھیجی تھیں۔
''ائے کنہ۔۔۔ ہمارا بھی دماغ کبھی کبھی بالکل کام نہیں کرتا خان جی......'' فردوس نے ہتھیلی ماتھے پہ ماری۔ ''یہ دیکھو خان جی۔ بچہ تو اس مشین کے اندر رکھا ہے، وہ معلوم ہے نا، جب وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اتنا کمزور، وئی صدقے۔ یہ تو سات ماہ کا ہے۔'' وہ جیسے آپ ہی ساری گتھی سلجھا کر اب اسکرین کو چوم بھی رہی تھیں۔
ابراہیم خان نے موبائل بیوی سے لے کر تصویریں دیکھیں تو وہ بھی تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگے کہ ظاہر ہے اس کے علاوہ بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے بچے کی جلدی پیدائش کی۔ یوں بھی انصر کے فرار کے بعد ان میاں بیوی نے اپنے آپ ہی سمجھ لیا تھا کہ نوریا کے یہاں سے خفا ہو کر جانے کی وجہ بھی یقیناً انصر کے کرتوت رہے ہوں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ انصر نے اپنا اور نوریا کا تنازعہ ان سے شیئر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔
ابراہیم خان کی حالت بھی بچے کو دیکھ کر کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ ان کے گھر میں ایک مدت بعد خوشی آئی ہے۔ ڈیرے جانے کے لیے تو وہ یوں بھی تیار بیٹھے تھے۔ جلدی سے اپنا موبائل ٹوپی اور چھڑی سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جذبات بڑے بے قابو سے ہو رہے تھے۔ کئی دن ہوئے انصر سے ان کی بات چیت بھی نہ ہو پائی تھی۔ آج اتنی بڑی خوشی ہاتھ آنے پر ایکدم پر جوش سے ہو گئے۔ سوچا سب کو ڈیرے سے بھگا کر انصر کو کال ملائیں گے۔ وہ بے چارہ جو یہاں سے میلوں دور برفیلے پہاڑوں پر قید تنہائی کاٹ رہا ہے، اسے خوشی کی خبر سنا کر ذرا اس کی پریشانیاں بھی کم کریں گے۔
وہ اُسی وقت تیز قدموں سے ڈیرے میں داخل ہوئے، وہاں اتفاق سے مہمان کوئی بھی موجود نہ تھا۔ عالمگیر اور خرم لان میں پائپ لگائے پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ مخالف سمت میں ڈیرے کی عمارت اس وقت بالکل خالی پڑی تھی۔ عالمگیر کام چھوڑ کر اِدھر کو بھاگنے لگا لیکن ابراہیم خان نے ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کو کہا جس پر سر ہلاتے وہ واپس پلٹ گیا۔ ابراہیم خان نے موبائل اوپن کر کے انصر کا نیا نمبر جو آج کل بجائے محفوظ رکھنے کے زبانی یاد رکھا ہوا تھا، ڈائل کر کے موبائل کان سے لگایا
''ہیلو، انصر بیٹا۔ میں ہوں بابا۔'' یہ بھی انصر کی خصوصی ہدایات تھیں کہ کال ملا کر وہ خود ہی بات کا آغاز کیا کریں گے تاکہ پہلے اسے ہیلو نہ کرنا پڑے۔
''جی بابا۔ کیسے ہیں؟'' انصر کی آواز میں عاجزی کا عنصر تو مفقود ہی ہوتا تھا، کسی حد تک بیزاری ہی ٹپکتی تھی۔ اس کی ڈھٹائی اسے کبھی بھی شرمندہ نہ ہونے دیتی تھی۔
''بوت خوشی کا خبر ہے بیٹا۔'' ابراہیم کا لہجہ چہکتا ہوا سا تھا۔
''خوشی کی خبر؟'' انصر بری طرح چونکا۔ اپنے فرار سے نجات کے کئی منظر نامے ذہن میں گردش کرنے لگے۔
''اللہ نے کتنی بڑی خوشی دی ہے، نعمت ہے بچے نعمت۔ خدایا تیرا شکر ہم بوڑھوں کو یہ دن دکھایا۔''
''ہوا کیا ہے؟'' انصر کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔
''مڑے، بیٹا ہوا ہے......'' وہ اسے مزید تجسس میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ ''اللہ پاک نے تمہیں بیٹا دیا ہے۔ میں دادا بن گیا ہوں۔''
''کیا؟'' انصر اپنی جگہ سے تو اٹھ ہی کھڑا ہوا، زور سے چلا بھی اُٹھا۔ تو یہ تھی وہ خوشی کی خبر، اس کے نتھنے پھول گئے۔ بابا بھی کتنی بڑی بھول میں تھے۔ وہ مارے طیش نے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے بابا کی غلط فہمی دور کرنی تھی، ابھی اِسی وقت!

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نائلہ عبدالرحمن

کہجا آتش رو

آج ہفتوں ہوئے سیلاب آکر گزر گیا۔ ہمارا گھر اردگرد کی زمین کی نسبت تھوڑا اونچا تھا اس لیے اپنے گھر سے تو جیسے تیسے ہم نے پانی نکال دیا مگر مٹی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ دور دور تک اب بھی پانی ہی پانی نظر آرہا تھا کیونکہ چاروں طرف فصلیں تھیں۔ سیلاب سے پہلے چاول کی فصل سے یہ کھیت سرسبز و شاداب تھے اب ان کی جگہ سیلابی پانی نے لے لی تھی۔

میں کمرے میں جاتی تو چار دیواروں کے سہارے کھڑی بوسیدہ چھت مجھے عجیب لگنے لگتی۔

کیونکہ [illegible] فرش پر بھی تہہ مٹی گیلی تھی۔
پانی ختم ہوتو یہ نمی جائے۔ باہر صحن میں آتی تو سیلابی مٹی گارے کا روپ دھارے میرے ننگے پاؤں کو گندا کردیتی۔

ایسے میں روز باہر آکر کھڑی ہوجاتی کہ شاید کسی امدادی گروہ کو ہم نظر آجائیں۔ کیونکہ اس ڈیرے پر ہمارا اکیلا ہی گھر تھا تو شاید اس طرف کوئی آتا ہی نہیں۔

سب کچھ بہہ گیا۔ بے چارہ موبائل فون تھا وہ بھی اللہ جانے پانی کی نذر ہوگیا۔ لیکن کہتے ہیں نا "اللہ تو پتھر میں کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔" بس اللہ نے ہمارے رزق کا وسیلہ اس بھینس کو بنایا جو ہمارے ساتھ بچ گئی اور اب ذخیرہ شدہ بھوسا کھا کر گزارہ کررہی ہے۔ روکھا سوکھا کھا کر یہ بھی بے چاری کتنا دودھ دے سکتی ہے۔ میں تو اس کا دودھ پی پی کر اکتا گئی ہوں۔ منہ کا ذائقہ بھی اب تو دودھ والا ہی ہوگیا ہے۔ پتا نہیں بچپن میں ہم دو سال کیسے ماں کے دودھ پر گزارا کرلیتے ہیں۔ پر اماں ابا بڑے صبر والے ہیں وہ کہتے ہیں۔

"بھوک میں چار دن کی پڑی سوکھی روٹی بھی لذیذ لگتی ہے۔"

بس انہی خیالات میں گھری تھی کہ مجھے دور سے کسی کی پکار سنائی دی کوئی بہت زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"وہاں کوئی ہے کوئی ہمیں سن رہا ہے۔ ہم آپ کی مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں نے فوراً سے ایک بڑا سا ڈنڈا اٹھایا اور اس پر کپڑا لٹکا کر ہلایا اور زور سے بولی۔ "ہماری مدد کیجیے پلیز۔ ہمیں بہت دنوں سے کچھ کھانے کو نہیں ملا پلیز ہماری مدد کیجیے۔"

"ہماری کشتی پھنس چکی ہے، آگے نہیں جا پا رہی۔ آپ اگر ہمیں سن سکتے ہیں تو ادھر کو آیئے۔"

میں نے پڑھی لکھی ہونے کے باوجود پانی میں اترتے ہوئے ذرا جھجک محسوس نہ کی کیوں کہ بھوکے کو روٹی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

میں نے پانی میں چلنا شروع کیا تقریباً دو دو فٹ تک پانی تھا۔ آج معلوم ہوا کہ تن کو ڈھانپنے کے لیے تو ایک جوڑا بھی کافی ہے۔ لیکن اگر ایک دن روٹی کا فاقہ ہوجائے تو پیٹ ہمارے حلق کو آجاتا ہے۔ میں کافی آگے تک گ ئ تو وہ لوگ مجھے ٹھیک سے دیکھ پائے۔ ان کی کوششوں سے شاید پھنسی کشتی بھی نکل کر چلنے لگی تھی۔ وہ میری طرف آئے تو مجھے بھی کشتی میں سوار کرلیا۔

خیر امدادی گروہ ہمارے گھر تک آیا۔ باہر والی دیوار سیلاب کی زد میں آکر گر چکی تھی جسے میں نے ایک ایک اینٹ جوڑ کر عارضی سی ڈھال بنایا ہوا تھا۔ وہاں میں چارپائی لاکر آرام کرلیتی تھی کچھ دیر میں نے ان کو وہاں کھڑا کیا اور برتن لاکر ان سے کھانا لیا۔

ابا اندر کھانستے ہوئے مجھے آوازیں دینے لگے۔

"پتر! کون آیا اے او ہنو اندر بلا لے۔"

اماں کو اتنی جلدی کوئی بات سنائی نہیں دیتی تھی مگر شاید ابا نے ان کو باہر بھیجا تھا۔

امدادی گروہ نے مجھے کچھ سامان بھی دیا اور کہا کہ ہم ایک ایک ہفتے کا راشن دے رہے ہیں لیکن آپ ایک مہینے کا رکھ لیجیے کیونکہ یہاں پانی بہت ہے اور ایک ہی گھر ہے تو دوبارہ چکر لگانا مشکل ہوگا۔

اماں اس کو اندر لے گئیں، میں نے منع بھی کیا کہ بس ٹھیک ہے جتنا ان سے ہورہا ہے وہ کررہے ہیں کچھ اور نہ مانگیں شاید کوئی اور بھی مستحق ہو۔ لیکن اماں پھر بھی ان میں سے ایک آدمی کو اندر لے گئیں۔ میں باہر کھڑی رہی۔

اماں نے ان کو دکھایا کہ ابا کو بخار اور کھانسی ہے وہ دمہ کے مریض بھی تھے۔

میں نے سنا وہ آدمی اماں سے کہہ رہا تھا۔ "اگر آپ کہیں تو ہم انہیں اور آپ کو یہاں سے اپنے ساتھ کسی محفوظ مقام پر لے جاتے ہیں جہاں ان کا

علاج بھی ڈاکٹرز کی زیرنگرانی ہو جائے گا۔"

مگر اماں نے انہیں بڑے اچھے سے سمجھا دیا کہ یہ اپنا گھر اور زمینیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ اس کو اپنی زمین سے بڑا پیار ہے اور کہتا ہے کہ پانی اترے گا تو وہ دوبارہ یہاں فصل اگائے گا۔ اپنی زمین ہوتی بھی تو ماں جیسی ہے نا پتر!"

اماں کی باتیں سن کر وہ آدمی باہر آیا پھر اندر گیا اور اماں سے کہنے لگا۔

"پھر یہ بخار کے لیے پیناڈول لیں۔ ان شاء اللہ ان کا بخار بہتر ہو جائے گا۔"

اماں اونچا سنتی تھیں تو بولتی بھی اونچا تھیں کہ شاید ان کی نظر میں اگلا بندہ بھی آدھا بہرہ ہو۔ میں نے جب اماں کی آواز سنی تو ہونق کھڑی رہ گئی۔

"پتر! اس کی بیماری ان دواؤں سے نہیں جائے گی"

تو پھر ماں جی......؟" اس آدمی نے بھی اماں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"پتر! اس کی بیماری کی وجہ تو باہر کھڑی ہے۔ ہم دونوں کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے اور تو نے دیکھ لی ہے نا ہماری حالت۔ جب سے سیلاب آ کر گزرا ہے اسی کا سوچ سوچ کر اس نے روگ لگا لیا ہے۔

"پتر! کوئی چنگا جیا رشتہ ہوئے تے میری دھی دا نکاح کروا دے بڑا احسان ہوئے گا۔"

ابا نے بھی کھانستے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

وہ اماں ابا کو تسلی دے کر ہاتھ میں کچھ گولیاں تھامے چپ چاپ باہر آیا اور مجھے سمجھانے لگا۔

"یہ گولیاں انہیں کھانے کے بعد دیجیے گا ایک نیناڈول صبح اور......"

وہ بولتا جا رہا تھا مگر میں شاید دوا سمجھنے کے بجائے اسے سمجھنے لگی۔

چہرے پر داڑھی تھی جس کے بال کافی جگہوں سے سفید ہو چکے تھے بالوں پر بھی چاندی اتری ہوئی تھی۔ خوب صورت تیکھے نین نقوش اور پھر خدمت خلق کا جذبہ۔

وہ واپس جانے کے لیے آگے بڑھا تو میری آواز سن کر مڑا۔

"مجھ سے شادی کر لیں آپ......" میں دو چار اینٹوں پر پاؤں رکھتی تھوڑا قریب ہوئی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ مجبوری انسان سے سب کہلوا لیتی ہے۔ ایک نظر ان دو بوڑھی ہڈیوں پر ڈالیں اور پھر میری بے باکی پر۔" ان کی ساری جمع پونجی میری پڑھائی کھا گئی یونیورسٹی سے ایم فل کر چکی ہوں جب تک ان کے خواب پورے کرنے کا وقت آیا تو میری ساری ڈگریاں پانی کی نذر ہو گئیں۔ ایک یہ ہی میں ان کے لیے کر سکتی ہوں کہ ان کو اپنے لیے پریشان ہوتا نہ دیکھوں ورنہ ان کا حق تو میں کبھی ادا نہیں کر سکتی لیکن آپ مجھے اپنا نام دے دیجیے۔

"لیکن میری اور آپ کی عمر میں کافی فرق ہے آپ ایک نوجوان شخص کی مستحق ہیں۔"

"جس طرح کا آج کل دور چل رہا ہے کون سا جوان شخص آئے گا یہاں اس جگہ پر؟ اب تو تعلیم کا ثبوت بھی نہیں میرے پاس اور پھر اس سانولی رنگت والی لڑکی سے کون کرے گا شادی۔ مجھے آپ کی عمر سے فرق نہیں پڑتا اور اگر آپ کے بیوی بچے بھی ہیں تب بھی مجھے اعتراض نہیں۔ بھلے ہی مجھے اسی جگہ پر پڑی رہنے دیں۔ آپ خدمت خلق کے متولی ہیں اور مجھ میں بھی یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اسی لیے میں نے یہ فیصلہ چند لمحوں میں کر لیا آپ کو کچھ اور پوچھنا ہو تو آپ پوچھ سکتے ہیں۔"

جانے کیا بات تھی وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا اپنے آس پاس کے پانی کو نظر انداز کرتے میں نے اس کی آنکھوں میں سمندر اترتا دیکھا۔ میں اب اس کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ مجھ سے دو قدم پیچھے ہٹا اس نے گال تک آتے اپنے آنسوؤں کو اپنی پوروں سے صاف کیا اور بھیگتی آواز میں صرف اتنا کہا

"مجھے پانچ کی اجازت نہیں"۔

☆☆

اُمِ ہانی

ترقی والی بیگم

"خالہ جی کے پاؤں میں بھی ناپہیے لگے ہیں
مجال ہے کہ ہفتہ بھی گھر پہ ٹک جائیں۔ جب آؤں
کسی نا کسی دورے پہ نکلی ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کسی
عورت کو اتنا گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔"

ندا ساتھ ساتھ فرنیچر کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔
اس کی عادت نہیں تھی کہ سارا گھر ماسی کے حوالے کر
دے۔ اسی لیے ساتھ میں خود بھی چیزیں ہٹاتی رہتی،
جھاڑ پونچھ کرتی رہتی۔

"ذرا خیال نہیں ہے کہ پوتی اتنی چھوٹی ہے اور
بہو کے لیے مشکل وقت ہے۔ بس سامان باندھا اور
چل دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتیں تک نہیں کہ کوئی مرتا
ہے یا جیتا ہے۔"

"مبین! یہ میٹ بھی جھاڑ دو باہر لے جا کر۔
مٹی مٹی ہو رہا ہے۔ اگلی بار مشین لگاؤں گی تو ڈال
دوں گی تاکہ دھل جائے۔" ندا نے ان سنا کر دیا
حالانکہ یہ دہائیاں اس کا دل کتنی شدت سے دیتا تھا،
یہ وہی جانتی تھی۔

"وہ نیچے ڈھلوان پہ ایک باجی ہے نا طیبہ۔ ان
کی ساس جی ایسے پوتے کو سنبھالے پھرتی ہیں کہ بس
۔ ماں کو تو پاس نہیں آنے دیتیں کہ تم آرام کرو۔ بس
جب بچے کو دودھ پلانا ہو تو ماں کو دس پندرہ منٹ تھمایا
کہ بچہ بھوکا ہے اور پھر لے گئیں۔ نہلانا دھلانا، مالش
کرنا، سلانا سب خود دیکھتی ہیں۔ ایسی ساسیں بھی
ہوتی ہیں باجی، جن کے لیے بہو اور پوتے پوتیاں
ہتھیلی کا چھالا ہوتے ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ بہو کے
اس مشکل دور میں اگر وہ ساتھ دیں گی تو ان کے
مشکل دور میں بہو ان کا خیال رکھے گی۔ کرنے والی
کرتی ہیں اور نہ کرنے والی نہیں کرتیں......" اس نے
منہ بنایا۔ "آپ کی ساس جیسی۔"

ندا خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔ کوئی ہوں
ہاں تک نہ کی۔

مبین صفائی کرتی جاتی اور بولے چلی جاتی۔ ندا
اس کی سنتی ضرور تھی لیکن جواب میں کچھ نہیں کہتی تھی
حالانکہ کہنے کو بہت کچھ ہوتا تھا لیکن وہ بخوبی جانتی تھی کہ
مبین دس گھروں میں کام کرتی ہے۔ ادھر سن کر ادھر
بتاتی ہے۔ جب دوسروں کے قصے اسے آ کر سناتی ہے تو
کیا اس کے گھر کے قصے کسی کو نہیں سناتی ہو گی۔ اسی
بات کا سوچ کر ندا نے کبھی اسے اپنے گھریلو حالات
نہیں بتائے۔ لیکن بہت کچھ تو صاف دکھائی بھی دیتا ہے
اور بچے بچے کو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نہ کہنے سے
حقیقت چھپ تھوڑا ہی جاتی تھی۔

"خیر سے اب ڈولا کہاں اٹھا ہے۔؟ کس بہن
بھائی کے گھر گئی ہیں۔؟" مبین میٹ جھاڑ کر اپنی جگہ
رکھ چکی تھی۔ اب پونچھا لگا رہی تھی۔

"بڑی باجی کے یہاں گئی ہیں۔ وہ گری ہیں تو
بستر سے لگ گئی ہیں۔ انہیں ہی سنبھالنے گئی ہیں۔"

"کیوں؟ ان کی اپنی بیٹیاں کہاں ہیں۔؟ خالہ تو
بتاتی ہیں کہ ان کی ماشاءاللہ سات بھانجیاں ہیں۔ اب
ماں گری ہے تو سب کہاں جا کر چھپ گئی ہیں کہ یہ نوبت
آ گئی کہ اس عمر میں بہن کو سنبھال رہی ہیں۔"

ہائے مبین ظالم کیسے اس کی دل کی ساری باتیں
کہہ جاتی تھی۔ ندا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"مجھے نہیں پتا مبین۔ تم ذرا ہاتھ جلدی چلاؤ۔ حور
جاگ گئی تو پھر میں صفائی نہیں دیکھ سکوں گی۔" ایک پیر

کچن میں حور کے لیے سوجی کی کھیر بنانے کے لیے تھا تو دوسرا پیر مبین کو تاکید کرنے میں کہ یہاں سے بھی اچھے سے پونچھا لگاؤ اور وہاں سے بھی۔ اس کا سارا دن بچی کی وجہ سے ایسے ہی گھن چکر بن کر گزرتا تھا۔

"باجی! آپ سادہ ہو نا۔ کچھ کہتی جو نہیں ہو ساس کو۔ اسی لیے وہ بھی جہاں دل کیا چل پڑیں۔ ایک بار قسم سے منہ کھول لیں پھر دیکھنا کہیں نہیں جانے کی۔"

ندا نے خاموشی سے یہ سب بھی سنا اور نظر انداز کیا۔

"ویسے کڑوی بات ہے لیکن سچ ہے کہ جو بہو پسند نہیں ہوتی نا اس کی اولاد بھی پیاری نہیں ہوتی۔"

ندا کے کام کرتے ہاتھ تھم گئے اور یہی تو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ وہ امی کو ناپسند کیوں تھی۔؟ یا شاید دیگر رشتے انہیں کچھ اتنے پسند تھے کہ ان کے سامنے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

مبین تو کام کر کے چلی گئی لیکن اس کی باتوں سے دل جو الجھا تو وہ سارا دن برے دل سے کام کرتی چیزوں کو اٹھا پٹخ کرتی رہی۔

رات حمزہ گھر لوٹا تو اس کی اتری شکل دیکھ کر، بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے محبت سے پوچھنے لگا۔

"لگتا ہے ہماری بیٹی نے آج بہت ستایا ہے۔

ماما کا موڈ خراب ہے۔"
"موڈ نہیں قسمت خراب ہے۔" وہ منہ بنا کر کچن میں چلی گئی۔
حمزہ کے لیے چائے بنا کر لائی تو وہ بیٹی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ابھی تک اس نے چینج نہیں کیا تھا۔ ندا نے حور کو اس کی گود سے لیا۔
"چینج کرلیں اور چائے پی لیں۔"
"وہ تو میں پی لوں گا۔ تمہیں کیا ہوا۔؟" وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا گا کیونکہ امی اسے گھر میں دکھائی جو نہیں دیں۔
"میرے لیے کتنا مشکل ہے حور کے ساتھ گھر مینج کرنا آپ کو نظر آرہا ہے نا۔ بچی چھوٹی ہے۔ مدر فیڈ ہے۔ گھر کی سو ذمہ داریاں ہیں۔ ابھی مجھے کھانا بھی بنانا ہے اور نو بجے گیس چلی جائے گی۔ اسے کوئی دیکھنے والا ہو تو میں اس کے پاس سے اٹھ کر کام کروں۔ جب سے اس نے کروٹ لینا شروع کی ہے۔ جتنے بھی تکیے اس کے اردگرد رکھو یہ بستر سے گر ہی جاتی ہے اور نیچے میں اسے لٹا نہیں سکتی کہ سرعام فرش پہ چھپکلیاں اور چوہے دندناتے پھرتے ہیں۔ لیکن مجال ہے کہ آپ کی امی کو ذرا بھی احساس ہو۔ بہو تو چلو سب کو بری ہی لگتی ہے لیکن وہ تو پوتی کا احساس بھی نہیں کرتیں۔ نجانے کون کہتا ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ ان کے تو سگے ان کے بہن بھائی اور بھانجیاں بھتیجے ہی ہیں۔" آخر تک کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔
حمزہ نے اسے بولنے دیا۔ جانتا تھا کہ وہ کسی کے سامنے گھر کی بات نہیں کرتی لیکن اگر وہ اس کے سامنے بھی نہ کرتی تو اس کے اندر کا غبار کہاں نکلتا؟ انسان اپنے اندر اتنا کچھ جمع کرلے تو نتیجہ ڈپریشن کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کچھ ہو اسی لیے وہ اسے بولنے دیتا تھا۔
"میں امی سے بات کرتا ہوں۔"
"پہلے تو جیسے آپ نے کبھی بات نہیں کی نا۔ وہ کسی کی نہیں سنتیں۔ ان کے لیے بہن بھائی اور ان کے بچے سب سے پہلے آتے ہیں۔ اپنی اولاد سے بھی پہلے۔" حور کو بب پہنا کر وہ سوجی کی کھیر کھلانے لگ گئی۔ وہ ابھی پانچ مہینے کی تھی لیکن ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اسے پیٹ کی گیس کا مسئلہ زیادہ ہے اور صرف دودھ پیتے رہنے سے مزید زیادہ ہوجاتا ہے اسی لیے انہوں نے چوتھے مہینے سے اسے ٹھوس غذا پہ ڈال دیا تھا۔
"کیا کروں یار پھر میں تم بتاؤ۔؟ پیار سے بھی سمجھایا ہے۔ لاسٹ ٹائم انہیں ٹھیک ٹھاک سنا ڈالا تھا۔ جب کرکے سب سنتی رہیں اور دو دن بعد پھر رحمت بھائی کی کال آنے کی دیر تھی کہ بیگ لے کر چل پڑیں۔ اب میں کہتے ہوئے خود شرم محسوس کرتا ہوں کہ یار کتنی بار بولوں۔ خود انسان میں احساس ہونا چاہیے کہ پیچھے گھر والوں کو آپ کی ضرورت ہے اور آپ خدمت خلق پہ نکلی ہوئی ہیں۔"
"بس یہی تو بات ہے۔ ادھر کال آئی کسی بھانجے بھانجی کی ادھر آپ کی امی تیار ہوجاتی ہیں۔"
حمزہ تو خود امی کے اس روز روز کے آنے جانے سے تنگ تھا۔ سمجھا بھی چکا تھا لیکن وہ تو جیسے کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔

☆☆☆

اور یہ ابھی کا سلسلہ نہیں تھا کہ زیتون بیگم جب دل کیا بیگ اٹھا کر اپنے بہن بھائیوں کے گھر قیام کرنے چل پڑتیں بلکہ یہ سلسلہ تو ندا نے اپنی شادی کے بعد سے ہی دیکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ سے نوٹ کیا تھا کہ وہ گھر کو گھر سمجھ کر نہیں بلکہ ریسٹ ہاؤس سمجھ کر رہا کرتی تھیں۔ نجانے نے یہ وتیرہ اس کی شادی کے بعد ہی اپنایا گیا تھا کہ اب بہو آگئی ہے تو گھر اس کے حوالے اور میں تو بس گھومنے پھرنے کا کام کروں گی یا ہمیشہ سے انہوں نے ایسی زندگی ہی گزاری تھی۔ جب وہ حمزہ سے پوچھتی تو وہ کہہ دیتا کہ امی کو آگے پیچھے آنے جانے کا بہت شوق ہے۔ انہیں گھر بیٹھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔
لیکن ندا نے خاص طور سے نوٹ کیا تھا کہ

انہیں گھر رہ کر بھی کسی چیز پہ دھیان نہیں ہوتا تھا، کئی دن صفائی نہ ہوئی ہو تو انہیں کوئی پروا نہیں۔ کچھ کھانے کو نہیں بنا ہوا تو جھٹ پٹ آلو کاٹے اور ہلکے سے نمک مرچ کے ساتھ آئل میں تل کر گلا لیے ،زیادہ کھانے پکانے کا تردد وہ نہیں کرتی تھیں البتہ دوسروں کے ہاتھ کے پکائے کھانے بڑے شوق سے کھا لیتی تھیں۔ فریج گندا ہے، اندر سب پڑے پڑے سڑ بھی رہا ہے تو انہوں نے کھول کر نہیں دیکھنا کہ کس چیز کی بدبو آرہی ہے۔ چولہا گندا ہے، کچن تلپٹ ہے، چیزیں مٹی سے اٹی پڑی ہیں، ان کی بلا سے پڑی رہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ بس سارا دھیان ایک بات پہ ہوتا کہ وہ دن میں کہیں نہ کہیں کا چکر لگا کر آئی ہیں یا نہیں۔

''اچھا ندا، میں ذرا ساتھ والوں کے یہاں جا رہی ہوں۔ چائے مت بنانا میرے لیے۔'' تیار ہو کر وہ بتانے کا تردد کرتیں اور چائے انہی کے گھر پی کر آتیں۔

''میں سامنے والی عتیقہ کے یہاں جا رہی ہوں ۔ کافی دنوں سے ان کے یہاں جانا نہیں ہوا۔'' اور گھنٹوں کے حساب سے ان کے ہاں گزار کر گھر لوٹتیں۔ نجانے وہ بھی کیسے اتنے گھنٹے ان کو برداشت کر لیتی تھیں۔

ویک اینڈ تو آنے کی دیر ہی ہوتی کہ بیگ تیار ہوتا اور حمزہ کو کہا جاتا۔

''مجھے بڑے ماموں کے ہاں چھوڑ آؤ۔ میں کچھ دن وہاں رہوں گی۔ ان کی کال آئی تھی بہت بلا رہے ہیں۔''

''تمہارے چھوٹے ماموں کا فون آیا تھا، بہت یاد کر رہے ہیں۔ میں کچھ عرصے چھوٹے بھائی صاحب کے پاس لاہور جانا چاہتی ہوں، گاڑی پہ سوار کر دو تو آگے سے وہ لے لیں گے۔''

حتیٰ کہ ندا کا پیر بھاری ہوا تو بھی وہ چھوٹے بھائی کی طرف لاہور ہی پائی جاتی تھیں۔ حمزہ نے خوشی خوشی ماں کو فون کیا کہ انہیں اتنی بڑی خوش خبری دے۔ خود وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

''وہ اس کی طبیعت نہیں ٹھیک تھی تو ہم نے چیک اپ کروایا ہے۔ اس نے کنسیو کیا ہوا ہے۔''

وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ پہلا بچہ تھا۔ ندا پاس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اسے حمزہ کا اولاد اور اس کے لیے ایسا پاگل پن اچھا لگ رہا تھا۔

''مبارک ہو تم دونوں کو۔ اللہ ساتھ خیریت کے وقت لائے۔'' آواز میں خوشی کی رمق تھی۔

''اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دل بہت خراب رہتا ہے۔ کچھ بھی نہیں کھا رہی پچھلے تین دن سے۔ بس بسکٹ چکھ لیتی ہے۔ کچھ پکایا بھی نہیں جا رہا۔'' وہ بیوی کی حالت کا بتانے لگا جس کا پچھلے تین دن سے بستر سے اٹھنا محال تھا۔ وہ تو کچھ کھا نہیں رہی تھی۔ اپنے لیے روٹیاں وہ خود بیل رہا تھا، ساتھ کبھی انڈا فرائی کر لیتا تو کبھی فریز کیے گئے کباب نکال لیتا۔ کسی طرح اپنا گزارا چلا رہا تھا۔

''ہاں ایسے وقت میں تو ہوتا ہی ہے۔''

''آپ کب آرہی ہیں۔؟'' حالانکہ اسے کہنا چاہیے تھا کہ اب آپ آجائیں، ہمیں گھر میں کسی بڑے بزرگ کی ضرورت ہے لیکن اس نے بس یہی پوچھا تو آگے سے صاف جواب ملا۔

''دیکھو کب آنا ہو۔ ابھی تو چھوٹے بھائی صاحب ہی جانے نہیں دے رہے۔ پھر یہاں سے تمہاری پھوپھو کے گھر جاؤں گی وہ کب سے بلا رہی ہیں۔ پھر کچھ عرصہ وہاں ٹھہروں گی تو تمہارے چچا کے یہاں جاؤں گی۔ گھر اتنے دور ہیں یہاں کہ اکیلی جا نہیں سکتی جب تک کوئی چھوڑ کر نہ آئے اور لڑکے آفس سے آتے ہی اتنی دیر سے ہیں کہ ویک اینڈ کے علاوہ تو جانا ہو ہی نہیں سکتا۔'' گویا ان کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

حمزہ جسے لگا تھا کہ ماں کو فون کروں گا تو وہ دوڑی دوڑی چلی آئیں گی اس خوش خبری پہ وہ غلط ثابت ہوا۔ منہ بناتے اس نے فون رکھ دیا۔

ندا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو حمزہ نے

ساس کے کہنے پہ اس کا سامان پیک کیا اور اسے میکے لے گیا۔ ساس نے بیٹی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بستر پہ بٹھا دیا۔

"بیٹا تم اکیلے کیسے گھر میں رہو گے؟ کھانے پینے کا خیال کون رکھے گا؟ آفس جاتے ہو تو ناشتا کون بنائے گا؟ ندا بتاتی ہے کہ تم کھانا پکانا نہیں جانتے؟"

ساس نے فکرمندی سے داماد کے سامنے چائے اور اس کے ساتھ سموسے، رولز فرائی کر کے رکھے جو وہ رغبت سے کھانے لگا کہ آج دوپہر میں آفس کا کام اتنا تھا کہ لنچ کا وقت ہی نہیں مل سکا اور صبح کا ناشتا تو کب کا ہضم ہو چکا تھا۔

"آنٹی کر لوں گا کچھ نا کچھ۔" وہ بس اتنا کہہ کر کھانے لگ گیا۔

زبیدہ کو داماد پہ ترس آیا جو ایسے کھا رہا تھا کہ بہت بھوکا ہو۔ جانتی تھیں کہ بیٹی نے ناسازی طبیعت کے باعث کئی دنوں سے کچھ پکا کر نہیں دیا تھا۔

ندا کی طبیعت نے سنبھلنا کیا تھا اس کی تو الٹیاں ہی نہیں رکنے کا نام لے رہی تھیں۔ پانی تک ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں پانی پیا اور ابھی معدے تک بھی نہ پہنچا کہ الٹی کی صورت باہر۔ کھانا تو جسم میں جاتا ہی نہیں تھا۔ پوری پوری رات وہ ٹیک لگا کر بیٹھی رہتی اور الٹیاں کرتی رہتی۔ مجبوراً حمزہ نے اپنا سامان بھی پیک کیا اور ضرورت کی دیگر اشیاء بھی گاڑی میں رکھیں اور سسرال آ کر بیٹھ گیا تا کہ خود ندا کا خیال رکھ سکے۔ اسے ساس پہ اتنا بار ڈالنا ٹھیک نہیں لگا۔ اتنا ہی تھا کہ وہ اس کی خوراک اور ادویات کا خیال رکھ رہی تھیں۔

امی کو فون کر کے بتایا کہ ندا کی طبیعت کا یہ حال ہے تو انہوں نے تاکید کی۔

"اچھا کیا کہ اسے امی کی طرف لے گئے۔ اکیلے پریشان ہوتی رہتی۔ بس اسے کہو کہ کچھ نا کچھ کھاتی رہے۔ بھوکی نہ رہا کرے۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے آنے کا؟"

"تمہاری پھوپھو تو مجھے جانے ہی نہیں دے رہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ کون سا روز روز آنا ہوتا ہے۔ اب آئی ہیں تو کچھ عرصہ تو رہیں۔" حمزہ نے بے بسی سے لب بھینچے۔

"دیکھ لیں امی۔ ندا کی طبیعت سخت خراب ہے۔ آپ کی ضرورت ہے یہاں۔"

"تو وہ کون سا اکیلی ہے۔ سب ہیں تو اسکے پاس خیال رکھنے والے۔ میں بھی آ جاؤں گی۔"

حمزہ اب کیا کہتا کہ وہ ہماری ذمہ داری ہے، اپنے گھر والوں کی نہیں۔

☆☆☆

ندا کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو اسی وجہ سے ڈاکٹر نے اسے ایڈمٹ کر لیا۔ دن میں پندرہ بیس الٹیاں تو کہیں نہیں گئی تھیں۔

"ان کو ہائپر ایمسز ہے۔ اس لیے یہ الٹیاں اتنی زیادہ ہیں۔" ڈاکٹر کچھ لکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"وہ کیا ہوتا ہے ڈاکٹر؟" حمزہ نے ہی پوچھا کہ ندا میں تو بولنے کی ہمت بھی نہیں بچی تھی۔

"اس میں پیشنٹ کو وامٹس (الٹیاں) بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ دن کی بیس پچیس تو کہیں نہیں گئیں۔ کچھ انہیں ڈپریشن بھی شروع ہو گیا ہے تو بھی وامٹس نہیں رک رہیں۔ انہیں ہم ایڈمٹ کر کے ڈرپس لگائیں گے لیکن اگر پھر بھی آرام نہ آیا تو لاسٹ چوائس ہمارے پاس انہیں اسٹیرائڈز لگانے کی ہے۔ اس کے بغیر یہ کنٹرول نہیں ہوں گی۔"

حمزہ نے اسے ایڈمٹ ہو جانے دیا۔ اس کے سارے ٹیسٹ میں جگر کے ٹیسٹ کچھ ٹھیک نہیں تھے باقی سب ٹھیک تھا۔ دن کی چار ڈرپس اسے لگتی تھیں۔ وہ آفس سے دو دن کی چھٹی لے کر اس کے پاس رہا۔ پھر جب اسے آفس جانا پڑا تو صبح میں اس کی بہنیں چلی آتیں۔ باری باری سب نے ڈیوٹی نبھائی۔ رات میں حمزہ ہی اس کے پاس رہتا۔

الٹیاں نہ رکیں تو ڈاکٹرز نے اسٹیرائڈز ہی لگائے۔ پانچ دن ڈرپس کی صورت اسٹیرائڈز لگے تو

الٹیوں کا سلسلہ کچھ رکا۔ باقی اسٹیرائڈز اسے کھانے کے لیے دیے گئے جو اگلے پندرہ دن کھانا تھے۔ یوں وہ آٹھ دن ہسپتال رہ کر گھر آ گئی۔ طبیعت اب کچھ سنبھل گئی تھی۔

امی اس کی خوراک کا بے حد خیال رکھتی تھیں کہ اس کا وزن بارہ کلو ایک ماہ میں ہی گر چکا تھا۔ پہلے سے آدھی رہ گئی تھی۔ ہڈیاں جگہ جگہ سے نکل رہی تھیں۔ گال اندر کو پچک چکے تھے۔ پیلا رنگ ہو چکا تھا کہ کچھ اندر جاتا تو جان بنتی۔ سارا دن بس لیموں پانی، کھیرے، چند بسکٹ کھا کر گزارہ کرتی۔ چلو اب یہ ہضم تو ہو رہا تھا۔ پہلے تو پانی تک اندر نہیں رک رہا تھا۔ معدہ بالکل خالی ہوتا تو معدے کا تیزاب الٹی کی صورت میں باہر آنے لگتا۔ اب شکر تھا کہ کچھ افاقہ ہوا تھا۔ حمزہ بھی اس کا بہت خیال رکھنے کی کوشش کرتا لیکن امی کی بے حسی پہ اسے بہت غصہ آتا جو واپس لوٹنے کا نام تک نہیں لے رہی تھیں۔

"سارا خاندان باتیں کر رہا ہے کہ اتنی طبیعت خراب ہے تو سسرال والے کہاں ہیں۔ کوئی پوچھتا نہیں ہے تمہیں وہاں؟" حمزہ نے اگلی بار فون پہ شادی شدہ بہن سے شکایت کی۔ ماں کی شکایت بھی کیوں برداشت کرتی۔

"سسرال میں ہے ہی کون۔ ایک میں ہوں جو اتنے دور بیٹھی ہوں اور ایک امی ہیں بس۔ اب میں اپنا سسرال چھوڑ کر بھابھی کو سنبھالنے وہاں آ کر تو بیٹھ نہیں سکتی۔"

اسے بھائی کا یہ جملہ کہنا برا لگا تھا لیکن وہ یہ اندازہ نہیں کر رہی تھی کہ بھائی جو سسرال میں ہر کسی کے منہ سے اس قسم کے جملے سنتا ہے تو اسے کیسا لگتا ہے۔ اور ندا کو کیسا لگتا ہوگا کہ کسی نے سسرال میں سے اسے پوچھا تک نہیں۔

"یہ وہی لڑکی ہے جس کو تم اور امی مل کر میرے لیے پسند کر کے لائے تھے۔ میں نے کوئی لو میرج نہیں کی جو تم لوگوں نے ہمیں لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اب کسی کی بیٹی گھر لا کر تم لوگ اس کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو۔"

"تو کیا کریں تم بتاؤ؟ ساری لڑکیاں ہی اس فیز سے گزرتی ہیں۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو کہ جیسے دنیا میں نیارا بچہ پیدا کرنے جا رہی ہے۔ اگر اتنی ہی لوگوں کی باتیں بن رہی ہیں تو نہ میکے جا کر بیٹھتی۔ رہتی اپنے گھر پہ۔"

"اچھا اپنے گھر پہ اس حالت میں اکیلی رہتی۔ اور جو ہسپتال آٹھ دن رہ کر آئی ہے وہ کس کھاتے میں جاتے ہیں؟ وہاں بھی نہ داخل کرواتا کہ میرے گھر میں سے کوئی ساتھ رہنے والا نہیں ہے۔"

اسے بہن کی بات پہ سخت غصہ آ گیا۔

"تو پھر اب مشکل وقت ہے، صبر سے کاٹنا تو پڑے گا۔"

"مجھے بس اتنا پتا ہے ثریا، کہ ایک لڑکی کی زندگی کا مشکل ترین وقت بھی ہوتا ہے جب اس کا پہلا بچہ پیدا ہونے جا رہا ہو۔ اس وقت میں اگر تم لوگ اس کے ساتھ نہیں کھڑے تو آئندہ کسی بھلائی کی امید اس سے بھی نہ رکھنا۔"

حمزہ نے غصے سے فون رکھ دیا۔ اس کے گھر والے اس معاملے میں اتنی بے حسی دکھائیں گے اسے اندازہ نہیں تھا۔

☆☆☆

امی دو مہینے گزار کر گھر واپس آئیں تو ندا کو دیکھنے آئیں۔ وہ بالکل بے سدھ بستر پہ پڑی تھی۔ اتنی کمزور صورت دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس کی طبیعت اتنی خراب رہی ہوگی۔ سننے اور آنکھوں دیکھی میں فرق ہوتا ہے نا۔

امی کے لوٹنے پہ وہ سامان باندھ کر حمزہ کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ چار دن امی نے اس کا خیال رکھا۔ اسے مکمل آرام دیا اور پانچویں دن ہی بھانجے کی کال آ گئی۔

"خالہ! امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ فوراً یہاں آ جائیں۔" یہ حمزہ کی وہی خالہ امی تھیں جو

سب سے بڑی تھیں۔

حمزہ بتاتے تھے کہ تقسیم کے وقت خالہ امی آٹھ سال کی بچی تھیں۔ انہوں نے پاکستان بنتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اپنی سات بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا لیکن زیتون بیگم انہیں بہت پیاری تھیں کہ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ والدہ جلد دنیا سے رخصت ہو گئیں تو انہی خالہ امی نے دیگر بہن بھائیوں کو سنبھالا تھا۔ وہ سب بہن بھائیوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ زیتون بیگم کو ان سے اور ان کے بچوں سے خاص ہی انسیت تھی۔ جب تک زیتون بیگم کی شادی نہیں ہوگئی، بھانجے بھانجیوں کے ساتھ بھتیجے بھتیجیوں کو بھی خود سنبھالتی تھیں۔ ان کی مائیں بےفکر رہتیں کہ خالہ، پھپھو ہے نا بچوں کو دیکھنے کے لیے۔ بھائیوں نے زیتون بیگم کو پڑھایا اور شادی کی۔ خالہ امی نے اپنے ہاتھوں سے بہن کو ماں بن کر رخصت کیا۔ نیئر مزاج کے سخت تھے تو زیتون بیگم کو میکے آنے جانے کی آزادی نہیں تھی۔ ویسے بھی مردان سے سیالکوٹ تک کا سفر اس دور میں روز روز تھوڑا ہی طے ہو سکتا تھا۔ بس صرف خط لکھنے کی اجازت تھی۔ یوں زیتون بیگم بہن بھائیوں کو خط لکھ دیا کرتیں اور آدھی ملاقات ہو جایا کرتی۔ نیئر کی وفات کے بعد ان کے گھر والوں نے زیتون بیگم کو زیادہ نہیں پوچھا تو بھائیوں نے سیالکوٹ بلوا لیا۔ خالہ امی کے اپنے گھر کے قریب ہی ایک مکان کرائے پہ لے دیا۔ بس تب سے وہیں رہ رہی تھیں۔ خالہ امی کا بہت ساتھ رہا تھا۔ اسی لیے جب ان کے گھر سے بلاوا آتا زیتون بیگم جھٹ پٹ جانے کے لیے تیار ہو جاتیں۔

”ندا! میں جا رہی ہوں کچھ دن باجی کے گھر رہنے۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہوگی تو آؤں گی۔ تم اپنا خیال رکھنا اور کچھ نا کچھ کھاتی پیتی رہنا۔ خود سے صفائی وغیرہ نہ کرنا۔ کوئی کام والی ملے تو رکھ لینا۔“

زبانی کلامی تاکید کرنا کتنا آسان کام ہے نا یہ ندا کو اس روز پتا چلا تھا۔ حمزہ جب شام کو گھر لوٹا تو ندا صوفے پہ پڑی تھی۔ نیچے فرش پہ الٹیوں کے ڈھیر تھے اور امی گھر سے غائب تھیں۔ اس نے امی کو آوازیں دیں تو ندا نے نقاہت سے بتایا۔

”وہ خالہ امی کے چلی گئی ہیں۔“ اسٹیرائڈز

سٹیرائڈز کے بعد بھی اسے دن میں دو تین بار تو الٹی ہو ہی جاتی تھی۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ شاید یہ سلسلہ اس کی ڈلیوری تک چلے اسی لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن حمزہ کو ندا کو اس حالت میں پڑا دیکھ کر بہت غصہ آیا کہ امی کیسے اسے اس حال میں چھوڑ کر چلی گئیں۔

”اپنا گھر دیکھنا نہیں ہے۔ دوسروں کی زیادہ پرواہ ہے۔“ آفس کے کپڑے تبدیل کیے بنا ہی اس نے باہر سے پونچھا اٹھا کر فرش صاف کیا۔ لیموں پانی بنا کر ندا کو پلایا کہ اس کا دل کچھ سنبھلے۔

”میں سامان پیک کر رہا ہوں۔ ہم تمہاری طرف جا رہے ہیں۔ میں تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ سارا دن میں آفس میں ہوتا ہوں، پیچھے سے تمہیں کچھ ہو جائے تو کس کی ذمہ داری بنتی ہے۔“

وہ ایسے بیوی کو اکیلا گھر چھوڑ کر روزانہ آفس جاتا تو دل گھر پہ ہی لگا رہتا۔ بہتر تھا کہ وہ اسے میکے چھوڑ دیتا تاکہ خود بھی ذہنی اذیت سے بچا رہے اور ندا کو بھی سہولت رہے۔

”اتنے عرصے کے لیے تو نہیں گئی تھی کہ تم سامان اٹھا کر یہاں چلے آئے۔“ ہفتے بعد امی گھر لوٹیں تو سیدھا ندا کے گھر پہنچی تھیں۔

”اس کی حالت خراب تھی۔ میں گھر لوٹا تو صوفے پہ گری پڑی تھی اور الٹیوں سے برا حال تھا۔ ایسے کیسے اکیلے چھوڑ دیتا۔“

”تو ہر لڑکی اس دور سے گزرتی ہے۔“ انہیں بیٹے کا یوں بیوی کی حمایت میں بولنا برا لگا۔

”اس کا کیس الگ ہے۔ آٹھ دن ہسپتال میں لگا کر آئی ہے۔ وزن دیکھیں اس کا، شکل دیکھیں اس کی۔ کیا اب میں کوئی رسک لے سکتا ہوں۔“

بحث کو طول دینے کی بجائے زیتون بیگم نے بات ختم کرنا چاہی۔
''چلو اب گھر چلتے ہیں۔ اب تو میں واپس آ گئی ہوں۔'' انہوں نے حمزہ سے کہا تو حمزہ نے سہولت سے منع کر دیا۔
''ہم یہاں ٹھیک ہیں امی۔ یہاں اسے ہر طرح کا آرام ہے۔ آپ کا کیا ہے آپ کو تو ایک فون کال آئے گی اور آپ اسے پھر سے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ ہم روز روز سامان اٹھا کر یہاں وہاں نہیں ہو سکتے۔ اب اسے یہیں رہنے دیں۔''
ندا کو کمزوری اتنی تھی کہ بستر سے اٹھا نہیں جاتا تھا۔ ماں کا اسے اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ ہر ہفتے ہی بیگ اٹھا کر کہیں نا کہیں نکل جایا کریں گی اور پیچھے ندا اکیلی گھر میں پڑی ہو گی۔ پھر وہ کس امید پہ اسے گھر واپس لاتا۔
نو مہینے وہ اپنے میکے ہی رہی اور حمزہ بھی اس کے ساتھ وہیں رہا۔ خاندان میں کیا کیا باتیں مشہور ہوئیں اس کی اسے اب پروا نہیں تھی۔ جب مشکل وقت میں خاندان کے کسی فرد نے احساس نہ کیا تو اب وہ ان کی باتوں کی پروا کیوں کرتا۔

☆☆☆

ڈلیوری کا وقت قریب آیا تو زیتون بیگم ان دنوں بیٹی کے پاس لالہ موسیٰ گئی ہوئی تھیں۔ حمزہ نے بتا دیا کہ تاریخ قریب ہے اور پہلے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو یہاں آ جانا چاہیے۔
''جہاں اتنا وقت سب سنبھالا ہے وہاں یہ بھی ہو جائے گا۔'' جواب ثریا نے دیا تھا لیکن امی اس کے جواب پہ خاموش تھیں گو کہ یہ جواب ان کا بھی تھا۔ حمزہ نے کال بند کر دی۔ اگر ایسا تھا تو ایسا ہی سہی۔ جہاں سب کچھ اتنے عرصے ندا کی ماں بہنوں نے دیکھا تھا وہاں اب بھی دیکھ لیں گی۔ وہ پہلے ہی ان کے احسانات کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اب سر مزید جھک گیا تھا۔
سب کچھ خیریت سے ہو گیا۔ جب حمزہ ندا اور حور کو ہسپتال سے گھر لایا تو بہنوں نے کمرا ننھی پری کے استقبال میں سجا رکھا تھا۔ سب کی موجودگی میں کیک کاٹا گیا۔ یہ سب حمزہ کی والدہ اور بہن کو کرنا چاہیے تھا کہ حور ان کے خاندان کا خون تھی، ان کی نسل سے تھی لیکن وہاں سے تو کسی کو بروقت آنا تک گوارا نہ ہوا۔
کیک کاٹنے کے بعد جب دونوں میاں بیوی اپنی پری کے ساتھ کمرے میں اکیلے ہوئے تو حمزہ حور کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے رو دیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ تیرہ مہینوں میں ندا نے حمزہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔
''حمزہ کیا ہوا؟ آپ تو بیٹی کی پیدائش پہ بہت خوش تھے کہ ہمارے گھر رحمت آئی ہے۔'' وہ سچ مچ پریشان ہو گئی تھی۔
''تمہارے سامنے ہیں جو حالات ہیں۔ یار میں تو اپنی بیٹی کی خوشی ٹھیک سے منا ہی نہیں پا رہا۔ میں خوش ہو ہی نہیں پا رہا کہ میں باپ بنا ہوں اور یہ ہمارے گھر کی پہلی خوشی ہے۔ میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ امی پہ خاندان والوں کے احسانات کا بہت بوجھ ہے۔ بہنوں نے انہیں چھوٹی عمر سے پالا ہے۔ بھائیوں نے پڑھایا لکھایا شادی کی تو امی ان کے احسانات تلے دبی ہوئی ہیں، اسی لیے کسی کے بلانے پہ انہیں منع نہیں کر پاتیں اور دوڑی چلی جاتی ہیں لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مسئلہ تو میری ماں کا ہی ہے۔ انہیں خود بھی گھر میں نہ رہنے کا خبط ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانا ہی نہیں چاہتیں۔'' امی کے ہنوز نہ آنے سے اس کا دل شدید دکھا ہوا تھا کہ اس کے گھر کی پہلی خوشی تھی اور امی کو پروا ہی نہیں تھی کہ انہیں اپنے بیٹے کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ انہیں بہو کی نہ سہی اب آنے والی پوتی کی تو پروا کرنا چاہیے تھی۔ ندا کا اپنا دل شوہر کو روتا دیکھ کر بھر آ گیا۔
''سب ٹھیک سے ہو گیا ہے نا۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ آگے بھی سب ٹھیک سے ہو گا۔ کوئی ہمارے ساتھ نہ ہو حمزہ۔ ہم تو ایک دوسرے

کے ساتھ ہیں نا۔ یہ ہمارے گھر کی حور ہے اور ہم دونوں اس کے لیے کافی ہیں۔"

زیتون بیگم ہفتے بعد واپس لوٹیں اور واپس لوٹتے ہی گھر لے جانے کی ضد کرنے لگیں۔ سامان باندھ کر وہ ساس اور شوہر کے ساتھ گھر تو آ گئی لیکن بچی کے ساتھ اب گھر دیکھنا بڑا مشکل کام لگ رہا تھا کہ ابھی بچی دو مہینے کی ہوئی تھی اور رمضان شروع تھا۔ افطاری سحری بنانا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا کہ بچی ماں کے دودھ پہ تھی، ہر چالیس منٹ بعد بھوک سے رو دیتی۔ رات میں بھی بار بار بے چین رہتی۔ اسی سبب ندا کی تو نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ کبھی اتنے زوروں کا چکر آتا کہ اسے لگتا کہ بچی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس پہ مستزاد زیتون بیگم نے اعتکاف بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی وہ بھی دس دن کے لیے۔ ندا تو روہانسی ہو گئی۔

"امی بچی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ابھی یہ مت کریں۔ اگلے سال بیٹھ جایئے گا۔ ندا کے لیے اس وقت سب دیکھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔" حمزہ نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں نیت کر چکی ہوں دس دن کی۔ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ ندا کو جب کچن میں کام کرنا ہو تو حور کو مجھے تھما جایا کرے۔ میں دیکھ لیا کروں گی۔"

اور وہ یہ نہیں سمجھ رہی تھیں کہ اتنا سخت حمل کا دورانیہ گزارنے اور آپریشن کے بعد ندا میں طاقت ہی نہیں بچی تھی کہ وہ اکیلے سارا گھر دیکھے۔

سچ کہتے ہیں لوگ عورت کو عورت ہی نہیں سمجھتی جبکہ ان کے مسائل بھی سانجھے ہی ہوتے ہیں۔

زیتون بیگم اعتکاف بیٹھ گئیں اور پیچھے ندا کاموں کو سمیٹ کر بچی کے ساتھ ہلکان ہو گئی۔ اپنی گری گری طبیعت، جوڑوں کے درد اوپر سے رمضان کی روٹین۔ وہ چڑ کر بچی کو ہی جھنجوڑ کر رکھ دیتی کہ کسی اور پہ تو بس چلتا نہیں تھا ایسے میں غصہ اسی ننھی جان پہ نکل جاتا جو جانتی تک نہ تھی کہ اس سے کیا خطا ہوئی۔ جیسے تیسے کر کے دس دن گزرے۔

اعتکاف سے اٹھیں تو خالہ امی اپنے ساتھ لے گئیں کہ اتنے دن سے ان کے ساتھ وقت نہیں گزرا اور زیتون بیگم بھی کوئی کم وقت تھوڑا ہی گزارنے جاتی تھیں، کہیں جاتیں تو ہفتوں ہی رہ جاتیں۔ حمزہ کالز کرتا رہا کہ ندا کو پیچھے مشکل ہو رہی ہے تو وہ اپنے دکھڑے سنانے لگیں۔

"باجی بہت اداس ہیں۔ اکیلی ہوتی ہیں نا۔ بیٹا بہو کام پہ چلے جاتے ہیں۔ بچیاں کبھی آئیں، کبھی نہ آ سکیں۔ میرے ساتھ خوب دل لگا ہوا ہے اسی لیے مجھے جانے نہیں دے رہیں۔" حمزہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

غصے سے فون کاٹا اور ندا پہ برس پڑا۔

"جیسے تیسے ہوتا ہے گھر خود دیکھو۔ آئندہ مجھے مت کہنا کہ امی کو کال کر کے واپس بلائیں۔ میرے کال کرنے سے وہ بھی آتی ہیں! سمجھ لو کہ سسرالی رشتوں میں کوئی نہیں تمہارے آگے پیچھے۔ خود ہمت کرو اور سب دیکھو۔ عورتیں خود ہی اپنا سب کچھ سنبھالتی ہیں۔" ندا روہانسی ہو کر شوہر کو چلاتا سن رہی تھی۔

"اب مجھے اس عورت سے کوئی امید نہیں رکھنی۔ سسرال کے نام پہ میرا کوئی نہیں ہے سوائے شوہر کے۔ جہاں جاتی ہیں جائیں۔ مجھے کوئی امید نہیں رکھنی۔"

ندا غصے سے چڑ جاتی لیکن جب تک انسان ایک چھت تلے رہتا ہے تو امیدیں بھی اسی چھت تلے زندہ ہی رہتی ہیں۔

وہ گھر لوٹ بھی آتیں تو بھی ٹی وی یا کتابوں میں مگن رہتیں۔ کبھی کبھار حور کو دیکھ لیا، بہلا لیا، کچھ کھلا دیا۔ اکثر حور اسی طرح پڑی روتی رہتی اور جب سے کروٹ لینا شروع کیا تھا، آئے دن گرنے لگ گئی تھی۔ کبھی کہاں چوٹ تو کبھی کہاں۔ ندا کا دل حور کو گود میں اٹھائے بھر آتا۔

"کیا غضب ہو جائے گا اللہ اگر اپنی پوتی کا یہ خیال رکھ لیں لیکن پوتی کو اپنا خون سمجھیں تو نا۔ ان

کے کے لیے یہ صرف بہو کی اولاد ہے اور جب بہو سے کوئی لگاؤ نہیں تو پوتی سے کیوں ہونے لگا۔"

وہ دل ہی دل میں شکوہ کرتی لیکن کبھی زیتون بیگم کو کچھ نہ کہا۔ ہاں یہ تھا کہ غصہ دبانے کے لیے وہ ان کو مخاطب نہیں کرتی تھی مبادا وہ بولے اور کوئی غلط لفظ منہ سے نکال ڈالے۔

☆☆☆

انہی دنوں خالہ امی فجر کی نماز کے لیے جاگیں تو روشنی کم ہونے کی وجہ سے کہیں غسل خانے میں پاؤں پھسلا اور گرنے سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جلدی میں ہسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹرز نے آپریشن ہی حل بتایا تھا۔ جب سے خالہ امی گری تھیں، رحمت بھائی نے تو زیتون بیگم کو وہیں روک لیا تھا۔

"خالہ! آپ امی کے ساتھ رہیں گی تو انہیں تسلی رہے گی۔ ورنہ بے چینی سے بار بار اٹھنے کی کوشش کریں گی۔"

ان کے ذہن کا مسئلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتیں، کبھی کہتیں کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ بچوں کی شناخت تک نہیں کر پاتی تھیں۔ کبھی بیٹیوں کو آپا جی بلاتیں اور بیٹے کو ماموں جی۔ کبھی کہتیں کہ مجھے بچوں کو اسکول بھیجنا ہے دیر ہو رہی ہے کبھی کہتیں کہ میرے شوہر کہاں گئے، ابھی تک آفس سے نہیں لوٹے۔ وہ ماضی میں پہنچ گئی تھیں اور حال انہیں بھول چکا تھا۔ ایسے وقت میں زیتون بیگم ان کا سایہ بن گئیں۔

رحمت اور سعد یہ دونوں نوکری پیشہ تھے، صبح صبح اپنی اپنی نوکریوں پہ چلے جاتے۔ پیچھے ماں کو سنبھالنے کے لیے بجائے کسی عورت کو رکھتے، انہیں مفت کی زیتون بیگم مل گئیں۔ بیٹیاں باری باری آ کر رہتیں اور اپنے گھر کی مجبوریاں بتا کر لوٹ جاتیں۔ ایک زیتون بیگم ہی تھیں جن کے پیچھے کوئی مجبوری نہیں تھی کیونکہ گھر اور بچوں کو انہوں نے کبھی پاؤں کی زنجیر سمجھا ہی نہیں تھا جو ان کو کسی ایسے کام سے روک پاتیں۔

خالہ امی کا آپریشن بھی ہو گیا اور وہ گھر بھی آ گئیں۔ ان کے کمرے میں ان کا بستر اٹھا کر ہسپتال والا بستر لگا دیا گیا تاکہ انہیں اٹھانا بٹھانا آسان رہے کہ خود تو اب بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھیں۔ عمر بھی اسی سے اوپر تھی اور پھر بڑھاپے کی چوٹ کہاں ٹھیک ہوتی ہے۔ پیشاب کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ زیتون بیگم انہیں پیمپر خود لگاتی تھیں، وہیں بستر پہ صاف بھی کر ڈالتیں۔ ان کی اپنی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں تھا لیکن پھر بھی بہن کو سنبھال رہی تھیں۔ ایک بار رحمت سے کہا بھی کہ کوئی نرس رکھ لو تو انہوں نے کہا۔

"اپنی ماں کو میں نرس کے حوالے نہیں کر سکتا خالہ۔ سات بیٹیاں ہیں ان کی اور آٹھویں آپ ہیں۔ آپ کو بھی تو امی نے پالا ہے نا خالہ۔ سب مل کر سنبھال لیں گے۔ ہم سب پہ ماں بھاری تھوڑا ہی ہے۔" زیتون بیگم بھی چپ ہو گئیں۔

سات بیٹیاں سات دن چکر لگا جاتیں۔ کچھ کھلا دیا، بال بنا دیے، منہ ہاتھ صاف کرا دیا، ناخن تراش دیے اور بس۔ رفع حاجت سے متعلق کسی کام کو سات بیٹیاں ہاتھ تک نہ لگاتیں۔ اس کام کے لیے آٹھویں بیٹی زیتون تھی نا جو تھی تو سب کی خالہ لیکن بھانجیاں اکثر پیار سے کہتیں کہ ہماری امی کی آٹھ بیٹیاں ہیں جن کو انہوں نے پالا ہے۔ اسی ایک جملے کے بار تلے زیتون بیگم کبھی سر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔

جب تک خالہ امی بستر پہ تھیں، زیتون بیگم بھی انہی کے گھر رہیں۔ اپنے گھر آتیں بھی تو ساتھ ہی کسی نہ کسی کی کال آ جاتی اور بلا لیا جاتا۔ نئے کپڑے بیگ میں ڈالے، ضرورت کا سامان اٹھایا اور واپس چل پڑیں۔ ندا خاموشی سے سب ہوتا دیکھتی رہتی۔ احساس تو انہیں پہلے بھی نہیں تھا کہ بہو کے لیے بچی کے ساتھ کا وقت مشکل ہے۔ اب تو پھر ان کے پاس ٹھوس وجہ تھی احساس نہ کرنے کی۔

☆☆☆

''امی! آپ بہت دنوں سے وہاں ہیں۔ اب ان کی بیٹیوں کو دیکھنے دیں۔ وہ ان کی ماں ہے۔''

اس دن وہ گھر آئی تھیں کہ نہا سکیں۔ سردیاں تھیں اور رحمت بھائی کے گھر گیس نہیں تھی اسی لیے انہیں نہانے کے لیے گھر آنا پڑا تھا۔ تب ہی حمزہ نے نرمی سے ماں سے کہا کہ وہ تو ان کی ہمدردی میں کہہ رہا تھا۔ اپنی ماں کا کسی دوسرے کے گھریوں کیئر ٹیکر کی طرح کام کرنا اسے ناگوار گزرتا تھا۔

''کوثر کو تو اس کا شوہر ایک دن بھی نہیں چھوڑ کر گیا۔ بس اتوار کو لاتا ہے اور ساتھ ہی لے کر جاتا ہے۔ سخت مزاج ہے نا، تمہیں تو پتا ہے۔ زہرہ کا کمر کا مسئلہ ہے تو وہ زیادہ نہیں کر سکتی، اٹھانا بٹھانا اس سے نہیں ہو سکتا۔ زرینہ حفیظہ ہی زیادہ دیر رکتی ہیں۔ باقی اسماء کا اپنا شوہر اتنا بیمار ہے کہ بھاگم بھاگ آئی، ماں کو دیکھا اور واپس۔ عطیہ اور فاطمہ کے بچے ابھی اتنے بڑے نہیں کہ سب گھر سنبھال سکیں۔ یہاں آتی ہیں تو سو مسئلے پیچھے کھڑے ملتے ہیں۔ بار بار گھر سے کالز آتی ہیں کہ اب یہ ہو گیا اب وہ ہو گیا۔ سسرال میں رہتی ہیں تو ذمہ داریاں بہت ہیں۔'' امی کے پاس سب کی مجبوریاں گنوانے کے لیے موجود تھیں۔ ایک اپنے گھر اور اس کے مسئلے بھی نظر نہیں آئے۔

''سب مل کر ڈیوٹیاں لگا لیں تو کسی کو مسئلہ نہ ہو۔ ایک ہی شہر میں تو ہیں ساری بیٹیاں۔ دو دو مل کر آجایا کریں۔'' حمزہ کا خون کھول رہا تھا ایسی توجیہات سن کر۔ نہ بیٹیاں مکمل ذمہ داری لینے کو تیار نہ کل وقتی کوئی کیئر ٹیکر یا نرس رکھنے کو تیار۔ بس لے دے کر زیتون بیگم ہی ملی ہوئی تھیں سب کو۔ اور وہ بھی بے غرض لگی ہوئی تھیں۔

''لڑکیاں ان کا پاخانہ صاف نہیں کر سکتیں، پیمپر بھی ایک بندہ نہیں بدل سکتا۔ میں ہوتی ہوں اور ساتھ سعدیہ یا کوئی بیٹی ہوتی ہے تو ہم مل کر پیمپر تبدیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے باجی نے تو اپنا سارا جسم چھوڑ رکھا ہے۔ خود سے تو کچھ بھی نہیں کرتیں۔''

''تو سات بیٹیاں ہیں، مل کر نہیں کر سکتیں۔ کچھ دن تو آپ کو بھی ریسٹ دیں۔ آپ کون سا جوان ہیں۔''

وہ ساتھ ساتھ اپنے کپڑے تہ لگاتی بیگ میں رکھ رہی تھیں۔

''ریسٹ ہی ہوتا ہے۔ میں کون سا وہاں بہت ہل جوت رہی ہوں۔ بس یہ کام ہر کوئی نہیں کر سکتا تو مجھے کرنا پڑتا ہے۔ باجی ہیں میری، ماں کی جگہ ہیں، ان کی خدمت مجھ پہ فرض ہے۔''

''وہ ہر کوئی نہیں ہے امی۔ ان کی بیٹیاں ہیں۔ اپنے بھی بچے ہیں ان کے جن کے پیمپر زبدلے ہیں انہوں نے۔ ماں کی آلائش صاف نہیں کر سکتیں؟''

حمزہ نے طریقے سے ماں کو سمجھایا لیکن انہیں نہیں سمجھنا تھا۔

''اچھا چھوڑ دو یہ سب اور مجھے چھوڑ آؤ۔ حفیظہ انتظار کر رہی ہوگی میرا۔ اسے گھر واپس جانا تھا۔''

تاسف سے سر ہلاتے حمزہ نے ماں کو دیکھا جنھوں نے کرنا وہی ہوتا تھا جس کا باجی کے گھر سے آرڈر ملتا تھا۔

☆☆☆

''ایک بات کہوں آپ کو۔ برا مت منائیے گا۔'' اس رات کھانے پہ حور کو کیلا کھلاتے اور خود روٹی کھاتے ہوئے ندا نے حمزہ سے کہا جو ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ حمزہ نے ایک نظر ندا کو دیکھا۔

''آپ کی خالہ کی ساری اولاد آپ کی امی کو بہترین طریقے سے استعمال کر رہی ہے۔''

حمزہ نے ٹی وی سے رخ موڑ کر بیوی کی طرف کر لیا۔

''رحمت بھائی چند پیسے بچانے کے لیے کہ انہیں نرس نہ رکھنی پڑے، امی کو لے جاتے ہیں تاکہ وہ خالہ کو سنبھالیں۔ جب بھی غلطی سے تھوڑی دیر گھر آتی ہیں تو پیچھے سے کسی نہ کسی بیٹی کی کال آجاتی ہے کہ خالہ جلدی آجائیں، ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ سات بیٹیاں مل کر ایک ماں کو نہیں سنبھال پارہیں اور امی کو جذباتی طور پہ کھیر کر اس کام پہ لگایا ہوا ہے کہ وہ

بہن کو سنبھالے۔ امی بھی بہن کی محبت میں کچھ دیکھ نہیں رہیں اور بس لگی ہوئی ہیں۔''

''یہ لوگ ہمیشہ امی کے ساتھ یہی کرتے ہیں اسپیشلی رحمت بھائی۔ خالہ خالہ کر کے اتنے میٹھے بنتے ہیں کہ حد نہیں اور سارے کام نکلوا لیتے ہیں۔ لیکن امی کو کبھی نظر نہیں آیا کہ وہ انہیں استعمال کر رہے ہیں۔ میں نے امی کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن امی نے تو جیسے خالہ امی اور ان کے گھر والوں کو اپنا قبلہ کعبہ بنا رکھا ہے کہ وہ تو غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ الٹا اپنی اولاد کو ہی غلط سمجھنے لگتی ہیں۔''

''جب مطلب نکل جائے گا تو کون پوچھے گا؟''

حمزہ نے سر ہلایا۔ وہ اس بات سے متفق تھا۔

''اور ایک بات میں کلیئر کر دوں کہ ابھی میرا مشکل وقت ہے اپنی بیٹی کے ساتھ اور امی نے میرا بالکل ساتھ نہیں دیا۔ جب بھی امی پہ مشکل وقت آئے گا تو مجھ سے اعلیٰ ظرفی کی امید مت رکھیے گا۔ اگر ان پہ میرا خیال رکھنا واجب نہیں تو مجھ پہ بھی نہیں ہے۔ انسانیت کے تحت کر لوں تو ٹھیک ہے لیکن میں اتنی اعلیٰ ظرف ہوں نہیں کہ انسانیت کے لیے اپنے زخم بھول جاؤں اور اگلے کے زخم صاف کرنے لگ جاؤں۔ ماں کی خدمت فرض آپ کا ہے اور آپ نوکری چھوڑ کر ماں کے پاس بیٹھنے سے تو رہے۔ اس لیے یاد رکھیے گا کہ وقت آنے پہ مجھے آگے مت کریے گا۔ میں نے بھی اب دل سخت کر لیا ہے کہ میرا کوئی سسرال نہیں ہے، کوئی سسرالی رشتہ نہیں ہے۔''

حمزہ بیوی کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ کیا کہتا کہ بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ حور کی پیدائش سے پہلے اور بعد اس نے کبھی امی کی ندا کے لیے حمایت نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے لیے ہی بھاگتی رہی تھیں۔ اصول تو یہی بنتا تھا کہ اپنے بڑھاپے میں بھی وہ بہو کی طرف مت دیکھتیں لیکن اس دنیا میں ایسی انصاف بھری باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ لوگ اپنا فرض نہیں پہچانتے لیکن دوسرے پہ حق جتانا نہیں بھولتے۔

☆☆☆

خالہ امی کی وفات پہ وہ بچی کو ماں کی طرف چھوڑ کر گئی تھی۔ سب سے زیادہ زیتون بیگم ہی رو رہی تھیں۔

''میری تو ماں تھیں۔ اپنی ماں تو میں نے دیکھی نہیں۔ مجھے تو باجی نے ہی پالا تھا۔ میری ماں چلی گئی۔'' وہ ہر کسی کے گلے لگ کر یہی کہتیں۔

خالہ امی کی وفات کے بعد مہینہ زیتون بیگم وہیں رہیں کہ کوئی نہ کوئی افسوس کے لیے چلا آتا ہے تو ایسے میں کسی بڑے بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔ رحمت بھائی نے بھی روک لیا تھا۔

''امی تو چلی گئیں خالہ، لیکن آپ ہی اب ہماری چھوٹی امی ہیں۔ آپ یہیں رہیں گی تو ہمیں امی کے جانے کا کم احساس ہوگا۔''

ان کی ایسی باتوں سے زیتون بیگم کو بڑی ڈھارس ملتی تھی کہ بھانجا کتنا مان دیتا ہے۔ اس کی بیوی کتنا آگے پیچھے گھومتی خالہ خالہ کرتی ہے۔ اپنے بیٹے اور بہو سے اچھے تو بھانجا اور اس کی بیوی ہیں۔

''خالہ! اب امی نہیں رہیں تو سوچ رہا ہوں کہ بہنوں کو ان کا حصہ دے دوں۔'' اس دن وہ سب وہاں رحمت ہاؤس میں اکٹھے تھے۔ خالہ امی کا ختم دلایا جا رہا تھا۔

''ہائے بیٹا۔ اتنی رقم کا انتظام کدھر سے کرو گے۔؟ سات بہنوں کا حصہ کم رقم نہیں بنتی۔'' زیتون بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

رحمت نے سعدیہ کو دیکھا تو انہوں نے پھیکا سا مسکرا کر خالہ کو دیکھا۔

''گھر بیچنے کا سوچا ہے خالہ۔''

زیتون بیگم کو تو جیسے کرنٹ لگا۔

''یہ گھر تو بھائی صاحب نے بہت محبت سے بنایا تھا کہ اس میں ان کی ساری اولادیں رہیں گی۔ اس کو کیسے بیچ سکتے ہو۔ بڑی یادیں جڑی ہیں گھر سے۔'' انہوں نے گھر کی در و دیوار کو نظر اٹھا کر

دیکھا۔

"خالہ! سب بہنوں کو ان کا حصہ تو دینا ہی ہے۔ ابھی نہ سہی بعد میں سہی۔ بہتر ہے ابھی دے دوں۔ ثریا، اسما، حفیظہ کرائے کے گھروں میں بیٹھی ہیں۔ اچھا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ لے لیں گی۔ باقیوں کے بھی سو مسئلے ہیں، حل ہو جائیں گے۔"

زیتون بیگم نے سر ہلایا۔ وہ جو انہیں خالہ امی کی آٹھویں بیٹی کہتے تھے، وہ کہاں جائیں گی اپنی یادیں لے کر اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"چلو جو بہتر سمجھو بیٹا۔ جیسے تم لوگ خوش۔"

پراپرٹی ڈیلر نے تو بہت کم ریٹ لگایا تھا۔ گاہک بھی وہ ایسے لاتا جو آدھی قیمت بتاتے۔ اتنا بڑا بارہ مرلے کا گھر اتنی کم قیمت کا تو ہو نہیں سکتا تھا۔

رحمت بھائی کے ایک افسر تھے۔ ان کے بڑے بھائی بزنس مین تھے، انہوں نے گھر خریدنے میں دلچسپی کا اظہار کیا اور قیمت بھی اچھی بتائی۔ رحمت بھائی نے حامی بھرلی اور یوں گھر چٹ پٹ بک کر سب کے چیک ان کے اکاؤنٹ میں پہنچ گئے۔ ساتھ ہی رحمت بھائی نے اپنی اور سعدیہ کی سیونگز سے کسی نئی سوسائٹی میں گھر خرید بھی لیا۔ گو کہ سوسائٹی دور تھی لیکن گھر نیا اور مناسب قیمت میں مل رہا تھا۔ ثریا، حفیظہ اور اسماء نے بھی اسی سوسائٹی میں فلیٹس خرید لیے۔ یوں تینوں بہنیں آپس میں بھی قریب ہو گئیں اور بھائی کے گھر کے پاس بھی ہو گئیں۔

زیتون بیگم خوب گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر روئیں۔ بڑی یادیں تھیں اس گھر سے جڑی ہوئی۔ اس گھر میں اپنے بھانجے بھانجیوں کو گود دوں کھلایا تھا۔ اس گھر سے ان کی باجی نے انہیں رخصت کیا تھا۔ اس گھر میں وہ بیوہ ہونے کے بعد لوٹی تھیں۔

"یہاں باجی ہر سیزن میں سبزیاں لگایا کرتی تھیں۔ تازہ پالک، ساگ، میتھی، دھنیا، پودینہ، سبز مرچیں۔ سب گھر کی تازہ پیداوار۔ ہائے میری باجی۔ جاتے جاتے سارا گھر سونا کر گئیں۔ اب تو گھر بھی نہ رہا۔ گھر تو مکینوں سے ہوتا ہے۔ بڑے چلے جائیں تو کیا گھر، بس دیواریں رہ جاتی ہیں۔" گھر کے باہر کی کھلی کچی زمین کے سامنے بیٹھیں وہ یاد کرتے روئے چلی جا رہی تھیں۔ اندر ساتوں بہنیں آپس میں گلے لگی رو رہی تھیں۔

"یہاں بھائی صاحب نے مرغیوں کے ڈربے بنوائے تھے۔ انہیں بڑا شوق تھا مرغیاں رکھنے کا۔ کیسے تم مرغیوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے نا رحمت اور میں تمہارے پیچھے پیچھے۔" وہ رحمت کے گلے لگ گئیں۔

"تم لوگ دور چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گی۔ میرا تو دل ہی نہیں لگے گا۔ نجانے اب کب ملاقات ہو گی۔ پہلے تو بھاگی بھاگی پہنچ جایا کرتی تھی۔ اپنے گھر سے زیادہ وقت یہاں اس گھر میں گزرتا تھا۔" زیتون بیگم بھانجے کے گلے لگی رو رہی تھیں۔

"تو آپ بھی اپنا سامان باندھیں خالہ، اور ہمارے ساتھ چلیں۔ اتنا بڑا گھر ہے، کمی کس چیز کی ہے۔"

زیتون بیگم کی آنکھیں چمکیں۔ بھانجا اتنی محبت سے کہہ رہا تھا۔ پھر تین بھانجیاں بھی تو قریب ہی ہوں گی۔ آنا جانا لگا رہے گا تو ان کا دل بھی لگا رہے گا اور دل لگائے رکھنا ہی تو ان کا مسئلہ تھا۔

"سچ میں؟" انہیں یقین نہیں آیا۔

"جیسے امی کا ایک کمرا الگ سے تھا، وہاں اب آپ کا ایک کمرا الگ سے ہو گا۔" چلو بھانجے کو اتنا خیال تھا تو وہ کیوں اس کا دل توڑتیں۔

گھر لوٹ کر وہ اپنا سامان باندھنے لگیں۔ بیگ کے بیگ بھرنے لگیں۔ یہ چیز بھی لے جاتی ہوں، وہ بھی لے جاتی ہوں۔ یہ نہ ضرورت پڑ جائے اسے بھی رکھ لیتی ہوں۔

"امی! آپ اپنا گھر چھوڑ کر بھانجے کے پاس رہنے جا رہی ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" حمزہ کا تو صدمہ ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"ارے تو کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں

۔ کچھ مہینے وہاں رہ کر واپس لوٹ آؤں گی۔ ابھی ان بچوں کا بھی نیا گھر ہے۔ سیٹ کریں گے، مشکل سے دل لگائیں گے۔ میرا بھی دل یہاں اداس رہے گا ان کے بغیر۔ ایسے میں وہاں میری ضرورت ہوگی۔ پتا ہے رحمت پورا گھر اسیٹ کرے گا وہاں میرا۔"

حمزہ شاکڈ سا ماں کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے بچوں جیسی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ نئے گھر میں جا رہی ہیں۔ اور پیچھے اپنا بیٹا، بہو، پوتی کا کیا تھا۔؟

وہ منہ بنا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا دل بہت بجھ گیا تھا۔ ماں کے لیے پہلی اولاد کا درجہ بہن کی اولادیں ہی تھیں جنہیں انہوں نے خود ماں بننے سے پہلے ماں کی طرح ہی پالا تھا۔ اس کا درجہ بعد میں تھا۔

"آپ کیوں روک رہے ہیں انہیں۔ جانے دیں اگر جانا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی ان کا بچوں والا حال ہی ہے کہ انہیں گھومنے پھرنے میں خوشی ملتی ہے۔ یہاں گھر میں بند رہنے، ذمہ داریاں نبھانے، ہمارے کسی کام کو ہاتھ لگانا انہیں پسند نہیں ہے۔ یہ سب انہیں قید لگتا ہے۔ جانے دیں انہیں۔ میں اب ویسے بھی ان کے بغیر رہنے کی عادی ہو چکی ہوں حمزہ۔ پہلے ان کا نہ ہونا مجھے ڈسٹرب کرتا تھا کہ میں اکیلے سب کیسے دیکھوں گی۔ اب جب میں نے سب خود ہینڈل کرنا سیکھ لیا ہے تو ان کا ہونا مجھے ڈسٹرب کرتا ہے۔ لگتا ہے گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے جس کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں سوچ سمجھ کر رہنا پڑ رہا ہے۔ جانے دیں انہیں یہی بہتر ہے۔"

حمزہ کے کمرے میں کسی چیز کے لیے آتی زیتون بیگم کے کانوں سے بہو کے جملے ٹکرائے تو وہ اسی خاموشی سے واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

سامان باندھ کر وہ رحمت ہاؤس پہنچی تھیں۔ گیٹ کھلا تھا، سامان لوڈ ہو کر جا رہا تھا۔ مزدور بڑی احتیاط سے ڈبوں میں بند سامان گاڑیوں میں بھر رہے تھے۔ وہ اپنا سامان بھی انہی مزدوروں کے حوالے کر کے انہیں تاکید کر کے اندر چلی گئیں۔ لاؤنج کا سارا سامان جا چکا تھا۔ کیسے خالی خالی در و دیوار تھے۔

وہ لاؤنج سے ہوتے ہوئے باجی کے کمرے میں گئیں جہاں کی ہر چیز جا چکی تھی۔ اب یہی چیزیں باجی کی وہ استعمال کریں گی۔ باجی کی جگہ بھانجا انہیں دے رہا تھا۔ وہ اب ان کی ماں بن کر رہیں گی۔

وہ باجی کے کمرے سے پیچھے بھانجے کے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

"کیا ضرورت تھی خالہ کو ساتھ لے کر جانے کی رحمت؟ اب امی نہیں رہیں تو ان کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے تو وہ امی کو دیکھنے ان کو سنبھالنے آتی تھیں تو چلو اچھا لگتا تھا۔ اب کیا کریں گی وہاں جا کر۔؟" یہ سعدیہ کے جملے تھے جس پہ وہ ٹھٹکی تھیں۔

"تو اب بھی یہی کریں گی۔"

"میں نہیں سمجھ پا رہی آپ کی بات۔؟"

"یار امی نہیں رہیں تو خالہ کی صورت ان کی موجودگی کا احساس بھی رہے گا۔ ویسے بھی اتنے دور گھر لے رہے ہیں۔ کوئی ہیلپر ملے نہ ملے، خالہ تو ہوں گی نا۔ بہت پھرتیلی ہیں، ہمیشہ سے ہمارے سارے کام دیکھ لیتی ہیں۔ اب بھی دیکھ لیں گی۔ تمہیں بھی آسانی ہو جائے گی۔ جاب سے لوٹو گی تو سو کام ہوئے ملیں گے۔ یہ بھی تو سوچو کہ ان کے ہونے سے کتنی آسانی رہے گی۔" زیتون بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

"اور جب کبھی آپ کی امی کی طرح گر گئیں، بیمار پڑ گئیں تو؟ ان کی تو سات بیٹیاں تھیں، چلی آتی تھیں۔ ان کا کیا کریں گے؟ کون سنبھالے گا پھر یہ نہیں سوچا۔"

"تو حمزہ اور اس کی بیگم ہیں نا۔ ان کی اپنی اولاد۔ وہ لے جائیں گے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو یار۔ جب تک رہ سکتی ہیں رہنے دو۔" زیتون بیگم کے منہ سے سسکی نکلی جسے انہوں نے دبا لیا۔

دو دو گھر ہونے کے باوجود ان کا کوئی ٹھکانا نہ بچا تھا۔ جو اپنا تھا، اسے ہاتھوں سے کھو دیا اور جو تھامنے چلی تھیں، وہ تو اپنا تھا ہی نہیں۔

☆☆

صنم ملک

طائر آشیانہ

"طائر آشیاں گم کردہ راہ......!"

دیوار پر نصب سنہری و نارنجی امتزاج کی اس خوبصورت پینٹنگ پر یہ حروف موتیوں جیسی طرز کی خطاطی میں تحریر کیے ہوئے تھے۔ اس کی زبان نے پہلی بار ان حروف کا غیر مانوس اور اجنبی سا ذائقہ چکھا، اور دل تے یہ غیر آرام دہ سا بوجھ سہا۔ وہ کتنی دیر تک ان الفاظ میں اُلجھی کھڑی رہ گئی۔

خطاطی میں لکھی اس عبارت والی پینٹنگ کا فریم شیشے کا تھا۔ اور اس فریم میں اس کی صورت اُبھر رہی تھی...... وہ الفاظ عین اس کی پیشانی پر یوں چمک رہے تھے گویا اس کی ماتھے کی لکیروں میں ثبت کر دیے گئے ہوں۔ وہ اس کی اب تک کی زندگی کا حوالہ بن گئے تھے۔ ایک ٹیگ، ایک بیان۔

پورے وثوق سے اس کے چہرے پر لہرا رہے تھے......!!

یہ نامعلوم سا مفہوم۔ غیر فہم سے حرف...... مغموم سے معنی...... کبھی سنے ہی تو نہ تھے اُس نے۔ پھر بھی کچھ اسرار تھا، اُن اجنبی حروف میں کہ جکڑ لی گئی تھی وہ۔

کوئی کشش سی تھی جو اس کی ذات سے جڑی اسے بتا رہی تھی کہ، وہ کئی لمحے ٹھہر کر ان حروف کو پڑھتی رہے۔

"طائر آشیاں گم کردہ راہ......"

یہ ساحر مصوری اور اس کی منظر کشی خود بول رہی تھی کہ میں تمہارے لیے دیوار پر آراستہ ہوئی ہوں۔ میں یہاں نصب ہوں کہ میں تمہارے اندر کی آواز ہوں۔ تم منظر ہو تو تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہوں۔ تمہارا دل ایک دیوار ہے اور میں اس کے اندر گونجتی صدا...... ایک بازگشت۔

تمہارا وجود ایک قلعہ ہے اور میں اس میں دفن ایک سزا یافتہ قیدی!!

آئینہ میں ہوں، تم فقط اس میں جھلملاتی ایک جھلک......

بے ساختہ اس نے ہاتھ کی اُنگلیاں کھول کر ان حروف کو چھونا چاہا تو اُوپر پڑی ہلکی سی دھول اس کی اُنگلیوں کی پوروں پر اُتر آئی تھی۔ اس سوغات کی صورت، جو پینٹنگ میں نظر آتے دو پرندوں کے پروں میں نظر آ رہی تھی۔ بنانے والے ماہر ہاتھوں کا کمال تھا کہ اس ساکت و بے جان تصویر میں بھی کچھ چیزیں واضح محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک مایوسی...... ایک بے وقعتی...... کچھ گم مائیگی...... ان کہا دکھ اور بے پناہ ان سنا کرب۔

آج سے پہلے کوئی بے جان منظر اسے اس طرح بے بس نہیں کر پایا تھا۔ اسے تو چلتے پھرتے لوگ تسخیر کرنے سے قاصر رہے تھے، تاہم ایک بے جان نظارہ...... اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے نمی پھیلنے لگی تھی۔ اور وہ سامنے ایستادہ تصویر دھندلانے لگی۔ اس کے باوجود اس مصوری کا نقش نقش اس کے ذہن پر طاری تھا۔

یہ ایک ڈوبتے سورج کا منظر تھا۔ سورج کے آتشی وجود سے تکان ظاہر تھی۔ ایک جھکے وجود والی بڑھیا، جس کے چند بال کپڑے کے چھوٹے سے ٹکڑے سے بندھے تھے اور چہرے کی جھریوں سے نااُمیدی کی کرب آمیز کیفیت...... تمام دکھ کیفیت...... وہ اپنی کٹیا کے باہر جیسے کسی کا انتظار کرتے کرتے نڈھال ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ

سے اس کی لاٹھی چھوٹ کر گر چکی تھی۔ اس کی کمر میں مزید خم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور کنیا سے اُوپر دور آسمان کی وسعتوں میں پنکھ کھول کر مخالف سمت میں اُڑتے دو پرندے...... جنہیں دیکھتے ہوئے آس و نراش کے عالم نے اس کی آنکھوں کو بھر ڈالا تھا۔ اُن کی اُڑان ایسی بے جان تھی کہ اس کا دل بے ساختہ مٹھی میں مسل گیا تھا۔ وہ دور کی اُڑان لگتی تھی، جیسے آخری ہجرت کی پرواز...... جیسے واپسی بھی اس نگر کو نہیں ہوگی۔ ڈوبتی شام کے اداس کن منظر اور یہ عبارت......

"طائر آشیاں گم کردہ راہ......"

"تم اب تک یہاں کھڑی ہو؟" اس کی دوست جس کے گھر میں یہ پینٹنگ لگی ہوئی تھی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی اس کے قریب آگئی تھی۔ اس نے چونک کر بہت سارے آنسو اپنے اندر اُتار لیے۔ چپکے سے آنکھوں کی نمی آنکھوں نے واپس اندر سمیٹ لی۔

"تمہیں اچھی لگی یہ پینٹنگ؟" وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے سارا وقت اس کو یہیں پر ساکت کھڑا دیکھ لیا تھا۔ اس کی ہاتھ میں کافی کے دو مگ تھے۔ وہ خاص طور پر اس کے لیے تیار کر کے لائی تھی۔ اسے بلیک کافی پسند تھی ہمیشہ سے...... انتہائی تلخ اور کڑوی...... زندگی جیسی۔ اس کی پسندیدہ کافی۔ اسے مٹھاس راس نہیں رہی تھی۔

"یہ پینٹنگ کون لایا ہے پلوشہ؟" وہ پہلے یہاں آئی تھی تو یہ اس جگہ پر موجود نہیں تھی۔ کافی کی خوشبو، اُڑتی خوشبودار بھاپ، اور تلخ سا ذائقہ کچھ بھی اس کی توجہ مبذول نہیں کروا پایا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ حالانکہ اس نے چند لمحے قبل خود کو سنبھال لیا تھا۔ قید کر لیا تھا۔

"یہ...... پاپا لائے تھے۔ اچھی ہے ناں؟" پلوشہ نے کافی کا مگ اسے تھمایا۔ اور اپنے پاپا کی پسند پر داد چاہی۔

"ہوں! اس کا مطلب جانتی ہو؟"

"پرندوں نے اپنے آشیانے کھو دیے......" اس نے فوراً اس کو مطلب بتایا تھا۔ پھر اس کی خاموشی محسوس کر کے اس نے سوچا شاید وہ سمجھی نہیں ہوگی۔ "پرندوں نے اپنے گھر کو جاتے راستے گنوا دیے...... ان کا ٹھکانہ ان سے گم ہو گیا۔"

وہ ہنوز چپ رہی۔

"پاپا نے اس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ انہیں اس پینٹنگ نے اور اس منظر میں چھپی گہرائی نے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک منظر نہیں ہے، احساس ہے۔ ایک دکھ ہے، ایک داستان ہے۔ جیسے کوئی بچہ ایک دروازے کی طرف بار بار دیکھتا ہے۔ اُمید سے، رحم کی توقع سے، مگر ایک دن وہ مایوس ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے ٹھکانے سے لوٹ جاتا ہے۔ اسے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اسے یہاں سے وہ نہیں ملنے والا جس کی اسے چاہ تھی۔ اور جس وقت اسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس چیز کے لیے ہمیشہ ترستا ہے...... اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اسے وہ چیز ملنے والی ہو۔ مگر تب تک اتنی دیر ہو چکی ہے کہ وہ مڑ کر بھی دیکھنا نہیں چاہتا کہ کوئی اب اسے تھامنے کے لیے منتظر کھڑا ہے مگر بے سود...... اس کے لیے اپنا وہ آشیانہ اور اس کی راہ گم کردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔"

پلوشہ نے جوش میں وہ ساری کہانی اس کے گوش گزار کی جو خود کبھی اس نے بھی دلچسپی سے نہیں سنی تھی۔ مگر اس کی گھر آئی دوست اگر اس کے بابا کے ذوق سے متاثر ہو رہی تھی تو وہ اس جتنی کئی اور باتیں بھی اپنے سے سنا سکتی تھی۔

"جیسے تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ بوڑھی خاتون ایک آس لے کر کسی کے جان لیوا انتظار میں مبتلا ہے۔ مگر وہ دور جاتے پرندے...... جو شاید اب کبھی اپنے ٹھکانوں کو واپس نہیں آئیں گے۔ وہ دور، بہت دور نکل گئے ہیں......"

"پلوشہ۔" اس نے کافی کا مگ رکھ دیا تھا۔ پلوشہ کی زبان اٹک گئی۔

"کیا ہوا کافی پسند نہیں آئی تمہیں......؟"

"میں تم سے کچھ مانگ سکتی ہوں؟"

اس کی اگلی بات نے پلوشہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی حیرانی کی ڈوریوں پر اس نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے اگلی بات کر کے خود سے بھی شرمندہ ہو جائے گی۔ مگر پلوشہ کے لیے مقامِ حیرت اس کے منہ سے نکلی یہ بات تھی۔ وہ اتنی وضع دار، اتنی رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی کہ جتنی دیر اس کے گھر رہتی تھی، کسی ایک چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی تھی، کجا کہ ایسی بات کر دینا۔ اس کا حیران ہونا جائز تھا۔

"یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہیں اجازت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"میں......"

اس کے ہاتھ کپکپائے تھے۔ اور اس کے لب اس کے لفظوں سے ہاتھ چھڑانے لگے۔ اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔ اس کو یہ پینٹنگ چاہیے تھی۔ اس کی گھنی پلکیں آنکھوں پر سایہ کر رہی تھیں اور نگاہیں جھکی تھیں۔

پلوشہ کو ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ یعنی سیریسلی؟ حیرت انگیز۔ اس نے اس کو متاثر کرنے کے لیے اتنا سب کچھ بول دیا تھا۔ کچھ اس پر اپنا علم جھاڑنے کے لیے، کچھ اپنی معلومات سے متاثر کرنے کے لیے...... وگرنہ یہ پینٹنگ اتنی تو اچھی نہ تھی کہ وہ زندگی میں پہلی بار کچھ فرمائش بھی کرتی تو محض اس ساکت سے ایک منظر کی......؟ ایک بے جان سی ایک تصویر کی؟ اس کو کبھی بھی ان سب میں دلچسپی نہیں رہی تھی، پلوشہ یہ اچھے سے جانتی تھی۔ مگر اس کی خواہش نے اسے ایک الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسے میں اس کی نگاہیں اٹھیں اور ہونٹوں پر ایک پُراسراری مسکراہٹ کھلنے لگی۔ ایسی مسکراہٹ کہ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ پلوشہ اس کا نام جانتی تھی اور یہ بھی کہ...... وہ لوگوں کو حیران کم...... اور پریشان زیادہ کر دیتی ہے۔

اس کا خمیر ہی اسی طرح کا اُٹھایا گیا ہے...... وہ سراپا حیران کن ہے۔ قدم قدم پر حیرت میں ڈالتی...... نا سمجھ میں آنے والی۔ جیسے پلوشہ کے لیے یہ بات نا سمجھ میں آنے والی تھی کہ محض ایک بے جان منظر کی بات نہیں تھی۔ یہ کبھی بھی صرف ایک نظارہ تک محدود نہیں ہے۔ اس پینٹنگ کا حصہ صرف آتشی سورج، مایوس بڑھیا، اور وہ دو پرندے نہیں ہیں۔ اس ساکت پینٹنگ کا ایک جاندار ٹکڑا وہ خود ہے...... اس منظر کا وہ ایک بچھڑا ہوا حصہ ہے۔

"گلِ رعنا عباس۔"

یہ ہماری کہانی کی ہیروئن کا پہلا تعارف ہے......!!

☆☆☆

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے
کہاں ہو تم، یہ دل بے قرار آج بھی ہے

سنگھار میز کے سامنے مرر میں جھلملاتے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ خوشبوؤں کے دیس سے لوٹی قلوپطرہ دکھتی تھی، جس کا سارا سحر اس کے سیاہ لباس اور کمر سے نیچے گرتے سیاہ چمکیلے بالوں میں پنہاں ہو کر آج آشکار ہو گیا تھا۔ مسکارا لگا کر اُس نے چہرہ مرر سے دور ہٹایا...... اور ہلکا سا مسکرا دی۔ پھر ایک ہی لمحے میں کچھ غیر مطمئن ہو کر اُس نے لپ سٹک دوبارہ اُٹھالی اور...... اگلے تین منٹ تک کبھی ڈارک اور کبھی لائٹ سوچ کر لپ اسٹک سے کھیلتی رہی......

ہلکی سردیوں کے مختصر دن تھے۔ اُس کے چہرے کو خوشی کا پسینہ چھو کر گزرتا تھا۔ اور عطر بیز ہو جاتا تھا۔ ایک پھوار اُس نے کی...... اور ساری خوشبودار فوگ سیاہ ساڑھی پر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے کانوں میں تچی کلیوں جیسے نازک موتی لٹکتے تھے اور گلے میں سفید منکوں کی مالا پڑی چمک رہی تھی...... اس نے بالوں کو دونوں طرف سے

تھوڑے تھوڑے علیحدہ کر کے کچھ پیچھے، کچھ آگے کی طرف ڈالے۔ اتنی سی تبدیلی اسے نہایت پیاری لگی۔ کتنے عرصے بعد وہ آج دل سے تیار تھی۔

وہ خود ایک ہیرا تھی..... مگر اس کے لبوں سے پھوٹتی ہنسی کی روشنی ہیروں سے زیادہ بیش قیمتی تھی۔ اس کی آنکھیں اُداسی سے خالی تھیں اور گرم جوشی سے بھری ہوئیں چہرے پر سے معصومیت کی تہ ہٹ چکی تھی۔ وہ اپنے آپ میں مکمل تھی۔ حسن اگر سوگواریت لیے ہوئے ہو تو بڑھ کر دکھتا ہے۔ اتنے سارے سالوں بعد بھی وہ خوب صورت تھی۔ بلکہ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ہے۔

ایک..... تین..... چار..... ساڑھے پانچ..... وہ دلکشی سے دل میں اندازے لگاتی رہی۔
"نہیں چھ..... پورے چھ سال....."

☆☆☆

یقیں نہیں ہے مگر آج بھی یہ لگتا ہے
میری تلاش میں وہ خوار آج بھی ہے

کمرے کی کھڑکی سے نیچے پودوں کی کیاروں سے مٹی کریدی جا رہی تھی اور اس پر گھونٹ گھونٹ پڑتے پانی سے سوندھی سی خوشبو سارے میں پھیلنے لگی۔ کمرے کے اندر آئینے کے سامنے کھڑے اس شخص کے ایک ایک انگ سے لگتا تھا کہ وہ معمول سے ہٹ کر کسی اور ترنگ میں ہے۔ ڈریس پینٹ اور ہلکے رنگ کی شرٹ پہنے اُس کے بال گیلے ہو کر ایک مخصوص اسٹائل میں ترتیب سے جمے ہوئے تھے۔ پہلی نظر پڑنے پر وہ ایک وجیہہ مرد نظر آتا تھا..... جس کی کامیابیوں نے اتنے سالوں بعد اُس میں مزید نکھار پیدا کر دیا تھا۔

اُس نے خود پر اسپرے کیا تو لبوں پر کسی انگلش سونگ کی دھن سُر بکھیرنے لگی۔ اس کی بیوی..... وہ اندر داخل ہوئی، تو اس کی اتنی بے فکری اور طمانیت محسوس کر کے میکانکی انداز میں دیکھتی رہ گئی۔ خوشبوؤں کی مہکاریں، اور منہ زور لہریں کھڑکی کے باہر اُس تک پہنچ گئی تھیں کہ پورا کمرا اس کی تیز اور مہنگی پرفیومز سے بھر چکا تھا۔ وہ حیران نظر نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن بات اس کی نہیں تھی۔ اسے اس کمرے میں دو چیزیں کھٹک رہی تھیں۔ وہ دو چیزیں کہ جو چھپائے نہیں چھپتیں..... عیاں رہتی ہیں اور اپنی زبان آپ بولتی ہیں۔

ایک مشک تھی۔ جو اتنی ظاہر تھی کہ کیا ہی روزِ روشن..... اور دوسرا..... کیا وہ عشق تھا؟..... ممنوع..... قابل جرم.....!

وہ چور نظروں سے اور ایک ٹرانس کی کیفیت میں اُسے دیکھے گئی۔ مگر وہ تو اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

وہ جیسے سب فراموش کیے جا رہا تھا۔ ایک بھرپور نظر خود پر ڈال کر، وہ ایسے مسکرایا کہ کسی کا بھی دل لبھا دے۔ وہ عورت نظریں چرا گئی۔

دو پل اُس کی نظریں مرر پر ٹھہریں، پھر ڈریسنگ ٹیبل کی سائیڈ سے چابی اُٹھا کر اوپر اُچھالی..... کیچ کی۔
اُس کی حیرانی دو چند ہوئی۔ پر وہ اُسے کہاں دیکھ رہا تھا.....!
"ایک دو نہیں..... چھ..... پورے چھ....."
وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلا تھا۔
وہ مضطرب سی چوکھٹ تک کھنچی چلی آئی تھی..... یہ گنتی آخر کس قسم کی تھی؟ کسی کے حصے میں ڈالی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ وادیاں وہ فضائیں کہ ہم ملے تھے جہاں
مری وفا کا وہیں پر مزار آج بھی ہے

وہ خوشبوئیں پھیلاتی۔ مہک اُڑاتی۔ ایک ہاتھ سے سیاہ ساڑھی کا پلو سنبھالے۔ دوسرے ہاتھ کی مرمریں اُنگلیوں سے اپنی سفید گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی۔ جو اس کے انتظار میں کب سے کھڑی تپ رہی تھی۔ وہ اندر بیٹھی تو ایک ٹھنڈک کا احساس اس کے روم روم میں سما گیا تھا۔ وہ عجیب سی دھن میں تھی کہ اپنی کلائی میں پڑے بریسلٹ سے دھیرے دھیرے کھیلنے لگی۔

گاڑی جانے پہچانے راستے پر رواں دواں تھی۔ اور اس کی سوچ کا دھارا کسی اور سمت بہہ رہا تھا۔ کتنے موسم بیتے تھے، کتنے جذبات بدلے، وقت گزرا اور عمریں بدلیں۔ مگر دل کسی تغیر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ آج تک نہیں لا پایا۔ اس کی اپنی دنیا ہے، اور اپنے اصول۔ وہ ضدی ہوتا ہے اور بس اپنی شرائط پر دھڑکتا ہے۔ اسے خبر تھی کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ اس کے دل کو معلوم تھا کہ وہ کس سے ملنے جا رہی ہے۔ اس لمحے کا اس نے انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی دسترس میں آ گیا تھا۔ کھوئے ہوئے سالوں بعد بھی مل جایا کرتے ہیں، یہ راز آج اس نے پالیا تھا۔ وہ پلکوں کو جنبش دیے بغیر سوچتی رہی، یہاں تک کہ اس کی مختلف راستوں پر بھاگتی دوڑتی، مناظر اور لوگوں کو پیچھے چھوڑتی گاڑی ایک دراز قد اور شیشوں کے شفاف باکس میں بند پُرشکوہ عمارت کے سامنے آکر رُک گئی تھی۔

☆☆☆

یقین نہیں ہے مگر آج بھی یہ لگتا ہے
مری تلاش میں شاید بہار آج بھی ہے

وہ گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہو رہی تھی...... تب وہ ایک سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ اس نے نامحسوس انداز میں کوٹ کا درمیانی بٹن کھولا اور کندھوں سے درست کیا (اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی)۔ ہاہ! کیسی اپنائیت بھری مسکراہٹ اُبھر آئی تھی اس کے لبوں پر...... سامنے سے آتی لڑکی، جس کے گلے میں چمکتی نازک موتیوں کی لڑیوں جیسی مسکان چہرے کو ضیا بار کر رہی تھی۔ اس نے دور سے ہاتھ لہرا کر اسے ہیلو کیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا، اور سر کو خم دے کر یہ آداب قبول کیا۔

وہ شاہانہ چال چلتی ہوئی فاصلہ ختم کرنے لگی۔ وہ آج بھی ویسی لگ رہی تھی۔ مغرور، پُراعتماد، اُٹھی گردن اور روشن پیشانی والی...... جس کے دامن میں کچھ کھونے کے پچھتاوے نہیں تھے۔ جس کے چہرے پر تھکن کی شکنیں نہیں تھیں...... اور جس کی چال میں گزرے برسوں کی کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ وہ آج بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ اُس نے دور سے بھی اس کی "وائب" پالی تھی۔ اور نجانے کیوں وہ سب کچھ بھول گیا۔ سب کچھ یکسر فراموش......!!

یہ آج تک کی سب سے غیر متوقع ملاقات تھی۔ جتنی غیر متوقع اتنی ہی غیر روایتی...... نہ شکوہ شکایت، نہ رنج، نہ دل میں اُبھرتے احساسِ زیاں۔ صرف موجودہ لمحہ قیمتی تھا اور اس ملاقات کی اہمیت!!

وہ لمبی ہیل کی ٹک ٹک کرتی اس کے قریب آئی تو اس کے وجود کی ساری خوشبوئیں کھو گئیں اور ساری رونقیں کہیں مسدود ہو گئیں۔ اس سے پھوٹتی مہک اور سیاہ لباس سے چھلکتی روشنیاں اس پر، اور ہر منظر پر حاوی ہوتی چلی گئی تھیں۔

وہ سامنے کھڑی لب ہلا رہی تھی۔ شاید اس نے چٹکی بھی بجائی...... وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر منظر سارے دھندلاتے چلے گئے۔ آوازیں ساری سلوموشن کی زد میں آئیں۔ ایک ایک چیز سامنے سے اُڑتی گئی اور پس منظر میں غائب ہوتی گئی۔ اس کے وجود کے سارے نظام نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ محبت شاید کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ پرانی ہو بھی جائے تو کبھی باسی نہیں ہوتی۔ وہ ایک مدت بعد بھی سارے سالوں کی ریاضتیں، آپ کا مقام، رتبہ و حیثیت، تعلق، اور جگہ جہاں آپ کھڑے ہیں...... ایک پل میں فراموش کرا دیتی ہے۔

جیسا کہ......

☆☆☆

ڈسکہ کے ایک نواحی گاؤں کا سورج دن کی منڈیر سے پھسلتا ہوا شام کے گہرے کنویں میں اوندھے منہ جا گرا تھا۔ شام نے پورا کا پورا سورج نگل لیا تھا اور اس کی تپش سے جل کر سانولی پڑ گئی تھی۔ شام کے کنویں میں گرا یہ سورج اب آہستہ آہستہ بہتا ہوا رات کے حلق میں جانے والا تھا۔ جہاں سے اگلے دن کی صبح سے قبل اس کی رہائی ممکن نہیں تھی۔

شام کے سائے میں سورج کے گرفتار ہونے پر چرند پرند نے سکھ کا سانس لیا، اور زمین بھڑاس اُگلنے لگی۔ حبس کچھ دیر کا، دم توڑ جاتا۔ دھوپ ناقابل برداشت!

یہ سورج ڈوبا تو ڈسکہ کے اس نواحی گاؤں کی باسی اس لڑکی کی زندگی کا ایک نیا باب کھول کر ڈوبا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کی زندگی نے اتنی شدت سے کروٹ بدلی تھی کہ اپنے تمام مدوجزر ہلا کر رکھ گئی تھی۔ ہر چیز نئے زاویوں میں ڈھل گئی تھی۔

فضا میں سسکاریوں کی سی سوگواریت پھیلی تھی۔ گھر کی چار دیواری میں میت پر ڈالے گئے پھولوں کی کچھ پتیاں پیروں تلے مسلیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلے بھی محافظ نامی احساس بھی نہیں پایا تھا۔ اب تو بے سائبانی کا یقین حد سے سوا ہو گیا تھا۔ رو رو کر آنکھیں جل رہی تھیں۔ حلق خشک اور ہونٹ سفید۔ دکھ تھا کہ بے عمیق، تمام ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس کے آنسو اتنے تواتر سے بہہ رہے تھے کہ لگتا تھا جسم کا سارا پانی نچڑ جائے گا۔ آج سے قبل احساس نہ ہوا تھا کہ وہ اس انسان کا دکھ اس قدر تڑپ تڑپ کر روئے گی۔ وہ انسان جو اس کے لیے موجود ہو کر بھی کبھی میسر نہیں رہا تھا......

وہ خود...... جس کا وجود، اس انسان کے آگے کسی ناکارہ بے جان شے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ وہ ہوتی یا نہ ہوتی ایک برابر...... نظروں میں بھی آ جاتی تو نظر نہ آتی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ اس انسان کے لیے اس کی آنکھیں دریا بہائیں گی۔

ہاں لیکن کچھ رشتوں کی حقیقتیں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ آپ ان سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ان کے وجود سے آپ کو کچھ نہ مل رہا ہو پھر بھی وہ جو ایک ''موجود'' ہونے کا احساس ہے۔ اور رشتہ بھی وہ جو...... جو آپ کے وجود کا حصہ ہو۔ جس سے آپ بنے ہوں۔

میت والے گھر سے ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے تھے۔ وہ اندھیرے کمرے میں اکڑوں بیٹھی تھی۔ بال الجھے ہوئے اور بے ترتیب۔ پسینے اور آنسوؤں سے شرابور۔ اسے اپنا آپ دھیرے دھیرے تاریک پڑتی شام کی مانند لگ رہا تھا۔ اس نے تو سورج نہیں نگلا تھا پھر یہ کیسی گرمائش تھی جو اسے جلا رہی تھی۔ وہ تو رات جیسی بھی نہیں تھی کہ چار پہر بعد سورج اگل دیتی تو ایک نئی صبح طلوع ہو جاتی۔ اور اس کی ذات روشنیوں کے حصار میں آ جاتی۔

یہ سوچ اس کی زندگی کو دھیرے دھیرے تاریک کر رہی تھی۔ اس نے کبھی اپنی بنیادی ضرورت سے بڑھ کر کچھ نہیں چاہا تھا، وہ بنیادی ضرورتیں بھی اسے نہیں ملیں۔ اسے کسی شے کی چاہ نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ چھینتی نہیں تھی، پھر یہ زندگی اس کے اندر موجود چند روشنیاں بجھانے پر کیوں تل گئی تھی۔ اس تاریک کمرے کے باہر صحن میں چارپائیاں بچھائی جا چکی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ درختوں کے پتے ہل رہے تھے۔ وہ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ سب اس لیے جمع تھے۔ اور شاید اس کے لیے...... یہ لمحہ تو آنا تھا۔ لیکن یہ اس قدر جلدی آنا تھا؟ اس کے ساتھ کس قدر ظلم ہو رہا تھا۔

"بابا...... یہ آپ نے کیا کیا۔"
آنسو ایک بار پھر سلسلہ وار بہنا شروع ہوئے۔ اس کی گردن تک ڈھلکتے چلے گئے۔ جو شکوہ وہ کبھی ان کے منہ سامنے کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ آج ان کے دور چلے جانے پر نوک زبان پر مچل گیا تھا۔
"بھائی صاحب نے جانے میں جلدی کی۔ بڑے اللہ والے تھے۔ کبھی دنیا داری نہیں دیکھی...... کبھی آگے پیچھے کا نہیں سوچا یہاں تک کہ......"
اس کے تایا نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بات کہنی شروع کی تھی۔ اور ایک گہرے سانس پر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ان کی ادھوری بات مکمل تھی۔ اس میں کئی بے چینیاں پوشیدہ تھیں۔ کئی تحفظات تھے۔ وہ ان سے دور بیٹھ کر بھی محسوس کر رہی تھی۔
"زندگی کسی انسان کو اس کی ذمہ داری کی بنا پر مہلت نہیں دیتی۔ ان کا اتنا ہی وقت لکھا تھا۔ اللہ نے واپس بلانے میں دیر نہیں کی۔"
یہ اس کی پھپھو کی آواز تھی۔ ان کی بات سن کر اس کے دل میں ایسا کرب اُبھرا کہ نینوں کے کٹورے سمندر ہو گئے تھے۔ وہ سوگوار تھیں۔ وہ آبدیدہ لگ رہی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ دکھی تھیں اس کی طرح۔ وہ اس کو لے کر سب سے زیادہ فکر مند تھیں، اس کی طرح۔ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔
پھپھو کتنی زیادہ اس کے "جیسی" تھیں۔
"آپا! ہم نے ان کی رہتی زندگی انہیں بہت سمجھانے کی کوشش تھی۔ آپ تو گواہ ہیں مگر وہ من موجی تھے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ زندگی میں کوئی خوشی اور دیکھی نہیں۔ بیٹی کو ہی گھر کا کر جاتے۔"
چچی نے نہایت بے صبری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ شاید کسی کو بھی اس جلد بازی کی توقع نہیں تھی۔ کئی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ گھوری۔ سرزنش۔ خبردار۔ تنبیہہ۔ کچھ کو چپ لگ گئی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نشانے پر جا کر لگ چکا تھا۔ کھب چکا تھا۔
"ایک انسان کے جانے سے سارے رشتے ختم تو نہیں ہو جاتے بھابھی۔ کیا ہم سب اس کے لیے اسی دنیا میں موجود نہیں ہیں؟" پھپھو نے اس کے حق میں ایک بات کی تھی۔ نہ شکایت سے نہ تلخی سے۔ لوگ ہک دک رہ گئے۔ بان کی چارپائیاں پہلو بدلنے پر چٹخنے لگ گئی تھیں۔
"باپ کا تو الگ مقام ہوتا ہے ناں۔" چچی زچ سی ہونے لگیں۔ غمگین اور پژمردہ۔
"آپ کیا کہہ رہے تھے بھائی صاحب!" انہوں نے اپنے بڑے بھائی کو مخاطب کیا تھا۔ شاید انہیں اندازہ تھا اس فیصلے کی گھڑی کا۔ شاید وہ جانتی تھیں کہ جس طرح ساری زندگی ان کے چھوٹے بھائی کی قدر نہیں کی گئی۔ اہمیت نہیں دی گئی۔ آج اس کی بیٹی کی ساتھ بھی سب یہی کریں گے۔
وہ تاریک کمرے میں بیٹھی زمین کو انگلی سے کھرچتی، خود اذیتی سے سوچے جا رہی تھی۔
"کیا یہ گھر اس کا نہیں ہے جس طرح آپ سب کے بچوں کا......؟ کیا آپ سب اس کے ماں باپ جیسے نہیں ہیں، جس طرح اپنے بچوں کے......؟"
"کیوں نہیں سیما......" تایا جی لمبے بھر کو گڑبڑا گئے۔ انہیں اس قدر جذباتی حملے کی امید نہیں تھی۔
"لیکن سیما آپا! یہ وقت جذباتیت کا نہیں ہے......" ان کی بیوی انہیں کمزور پڑتا دیکھ کر پیچھے نہیں رہ سکی تھیں۔ "ہمارے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ اور پھر ایک جوان لڑکی کی ذمہ داری...... اپنی اولاد کی دفعہ اونچ نیچ زمانہ معاف کر بھی دے۔ ایک یتیمی بھتیجی کے لیے بساط سے بڑھ کر بھی کر لیا جائے تو لوگ بات بات پر طعنے مارنے سے باز نہیں آتے۔ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے اٹھانے کا

اہل ہے۔“
فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ انہوں نے بات کھول کر اور پھر لپیٹ کر جیسے ان کی گود میں ڈال دی۔ سب کی خاموشی بتا رہی تھی کہ پس پردہ سب رضامند ہیں۔ یا پھر یہ بیٹھک بٹھانے سے قبل سب طے کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ اپنے بھاری دل کو بوجھ سے آزاد کیا۔
وہ سب ایسے بیٹھے تھے کہ وہ کچھ مزید کہیں اور وہ سب اس بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دہلیز سے باہر کریں۔ انہیں بے حد رنج ہوا۔
”آپ سب کو اس کی فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی آ کر آپ کو دس باتیں نہیں سنائے گا۔ کسی کو اپنی نیندیں اس کے لیے حرام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے زندہ ہوتے ہوئے اور میرے مرنے کے بعد بھی۔“ انہوں نے یہ لپیٹی بات اٹھا کر بغل میں دبالی۔ ایک ٹھوس بات کہہ کر بیٹھک برخاست کر دی۔
خواتین نے ہول کر دل پر ہاتھ رکھا۔
”آپا! خدارا موت کی باتیں۔“
مگر انہوں نے ایک ملامتی نگاہ کے قابل بھی نہیں گردانا تھا انہیں۔ وہ اٹھیں اور متوازن قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس جانے لگیں۔ اس تاریک کمرے کے سامنے، جس کی ٹھوس دیواروں کے پیچھے وہ قیدیوں کی طرح سانس کی بندش میں مبتلا تھی۔
”ماریہ......“
دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے پر ایک چرچراہٹ سے دروازہ وا ہوتا چلا گیا تھا۔ ملگجا سا اُجالا اندر کودا، تاریکی ڈر کر کونوں کدروں میں چھپنے لگی۔ اندر بیٹھی لڑکی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح تھی۔ دکھ سے نڈھال۔ اور حال سے بے حال۔
پھپھو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف والہانہ بڑھی تھیں۔
”میری جان میری بچی ماریہ!“
آواز تھی کہ مرہم۔ لہجہ تھا کہ شہد۔ تڑپ تھی تو شدت سمیت۔ اور محبت تھی تو خالص ترین۔ وہ ان کی بانہوں میں سما گئی تھی۔ ان کے حصار میں ڈوبی اتنے لمحے ساکت رہی کہ زوردار ہچکی بندھ گئی تھی۔ سکون کی حرارت ہو تو ایسی...... کوئی جائے پناہ ہو تو ٹھیک ایسی۔ بالکل ممتا جیسی!
”بس کرو میری جان خود کو اتنا ہلکان مت کرو۔ تمہارے بابا چلے گئے ہیں پر ہم سب تو ہیں۔ تم جانتی ہو نا تم میری سب سے پیاری بیٹی ہو۔ اور تمہارا دکھ مجھے تکلیف دیتا ہے۔“ وہ ان کرب زدہ سرخ آنکھوں میں درد ہلکورے لیتا دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ احساس اور شدت میں مبتلا کر رہا تھا کہ اس کے پاس دنیا میں سہارے نام کو کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اس اذیت کا ازالہ چاہ کر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔
”پھپھو! بابا...... آپ کو پتا ہے۔“ وہ ہچکیوں کے درمیان کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔
سیما پھپھو نے اس کے آنسو پونچھے۔ اسے پیار سے پچکارا اور لگاوٹ سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔ انہیں ماریہ سے فطری پیار تھا۔ یہ انسیت اور لگاؤ ان کے بھائیوں کے باقی بچوں کے حصے میں نہیں آسکا تھا۔ شاید اس لیے کہ ماریہ ہمیشہ ماں اور باپ دونوں کے التفات کو ترسی تھی۔ انہیں اس سے دلی ہمدردی تھی۔ انہیں اس سے الوہی محبت تھی۔ ان کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ قدرت نے سیما کی ایک بیٹی والی ممتا ماریہ کے نصیب میں لکھ دی تھی۔
”رونا بند کرو۔ اور مجھ سے بات کرو شاباش۔ میں ہوں نا تمہارے پاس، اللہ کی رضا ماننی پڑتی ہے بچے۔“

''پھپھو! مجھے خبر نہیں تھی کہ بابا کا میرے ساتھ یہ آخری دن ہے۔ کل رات انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اور مجھے کہنے لگے میرے پاس بیٹھو۔ وہ کبھی اتنا پیار نہیں جتاتے تھے۔ وہ تو بولتے بھی مشکل سے تھے مجھ سے...... انہیں تو یہ بھی خبر نہیں رہتی تھی کہ ماریہ کہاں ہے اور کس بستر پر سو رہی ہے یا زمین پر۔''

ہچکیاں لے کر بتاتے ہوئے اس کے چہرے پر ڈھیر سارا کرب اُمڈا تھا۔ وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ وہ شکایت نہیں کر رہی تھی۔ پھر بھی سیما کا دل چھلنی سا ہو گیا۔

بھائی...... ان کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے شخص سے کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر انہوں نے اس ننھی جان پر کتنا ظلم کر دیا تھا۔

''میں ان کے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے ان کے پاؤں دبائے۔ اور پتا ہے پھپھو انہوں نے......'' رونے میں مزید روانی آ گئی۔ ''انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا پھپھو، آپ سمجھ رہی ہیں انہوں نے نم آنکھوں سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اب کیوں پھپھو...... جاتے جاتے کیوں؟...... مجھے ساری رات حیرت رہی۔ مجھے کیا خبر تھی انہوں نے پہلی اور آخری بار محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ ان کا یہ آخری لمس ساری زندگی مجھے رلاتا رہے گا۔''

وہ ششدر سی بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ کون کون سے غم لے کر بیٹھی تھی۔ اور کس کس جذبے کا دکھ رو رہی تھی۔ ان کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ تمام الفاظ گم ہو گئے تھے۔ یہ اتنی حساس ہو سکتی ہے؟ انہوں نے اتنی گہرائی میں نہیں سوچا تھا۔

''میں اٹھنا چاہتی تھی۔ میں بے حسی سے ان کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹانا چاہتی تھی کہ اب کیوں؟ ساری عمر آپ نے ایک نرم نگاہ، مہربان مسکراہٹ اور شفقت بھرے ہاتھ سے محروم رکھا تو یہ احسان آج اچانک کیوں؟...... لیکن میں ہاتھ نہیں جھٹک سکی پھپھو۔ میں ہل نہیں سکی، بول نہیں سکی۔ سوچتی ہوں انہوں نے کیا سوچ کر سر پر ہاتھ پھیرا ہو گا پھوپھو...... کس جذبے کے تحت ان کی آنکھ نم ہوئی ہو گی۔ کیا ایک بیٹی کے احساس سے......''

''چپ۔ بس خاموش!''

وہ خود کو پھوٹ پھوٹ کر رونے سے بچا سکیں اس کے لیے یہی حل تھا کہ وہ اسے خود میں بھینچ لیں۔ کتنی دیر تک وہ اسے تھپکتی رہیں یہاں تک کہ ماریہ کی سانسیں بوجھل ہو چلی تھیں۔

''ماریہ! میرے بچے، خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ میں ہوں نا تمہاری ماں...... تمہیں خود کو سنبھالنا ہے۔ مجھے فی الحال شاید واپس جانا پڑے۔ مگر......''

''پھپھو!'' اس کی سیاہ آنکھیں خوف و ہراس سے پھیل گئیں۔ اس نے التجائیہ انداز میں بے ساختہ ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ مبادا وہ بھاگ نہ جائیں۔ اب جیسے وہ انہیں اٹھنے نہیں دے گی۔ صد شکر انہوں نے اسے بتا دیا تھا۔ ورنہ وہ کس کے سہارے یہاں پر رہتی۔

''گھبراؤ مت میں نے کہا نا۔ میں تمہارے لیے ہوں۔ مجھ پر یقین ہے نا؟'' انہوں نے اس کے ہاتھ سہلائے۔

وہ پھر بھی بے یقینی سے تکتی رہی۔ وہ کیسے ان کے فقط ایک بار کہے پر یقین کر سکتی تھی۔ اس کی تو اب تک کی ساری زندگی گمان سی گزری تھی۔

''میری بات غور سے سننا......'' انہوں نے نرمی سے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''تم میری بیٹی ہو۔ کنول کے پھولوں جیسی نازک اور پیاری۔ تمہیں میرے آنگن کی رونق بننا ہے۔ تم

میرے گھر میں میک بن کر اترو گی ماریہ۔"
وہ کہہ رہی تھیں اور ماریہ ٹکٹکی باندھے ناسمجھی کے عالم میں ان کی صورت تک رہی تھی۔ وہ ان پر اعتبار کرتی تھی۔ وہ ان کی باتوں پر ایمان لاسکتی تھی۔
"دستور کے مطابق تمہیں کچھ دن یہاں رہنا چاہیے۔ لوگ تمہیں پرسا دینے آتے جاتے رہیں گے۔ پھر میں بھیا سے کہوں گی تمہیں میرے پاس بھیج دیں گے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں تمہیں اس گھر سے بارات کے ساتھ رخصت کرا کے لے جاتی مگر......"
وہ نم آنکھوں سے مسکرا رہی تھیں۔ ماریہ کے چہرے پر تحیر پھیلا۔ پھر بے یقینی سے ناقابل فہم سا تاثر اُبھرا۔ وہ یہ بول رہی تھیں۔ جو اس کی سماعتیں سن رہی تھیں؟ کیا واقعی؟
اس نے دبے لفظوں میں، کچھ سرگوشیوں میں، سالوں سے سن رکھا تھا کہ سیما اسے اپنے بیٹے کے لیے منتخب کر لے۔ کچھ وثوق سے کہا کرتے تھے کہ سیما اتنی محبت ماریہ پر ہی کیوں نچھاور کرتی ہے۔ اس کے دل میں یقیناً یہ بات چھپی ہے کہ وہ اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھتی ہے۔ پھپھو بہت کم کم میکے آیا کرتی تھیں۔ وہ اپنے گھر میں واحد خاتون تھیں۔ اور باقی تین مرد۔ ان کے بغیر گھر کا نظام چلنا بند ہو جاتا تھا۔ وہ بہت خاص موقعوں پر گھر سے نکلتی تھیں۔ اس نے بچپن میں صرف چند ایک بار ان کے بیٹوں کو دیکھا تھا۔ وہ شاید ان کے ساتھ آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ماریہ کو تو ان کی شکلیں بھی یاد نہیں تھیں۔ جس شخص کو وہ جانتی نہیں تھی۔ جسے بھیڑ میں یا تنہائی میں وہ پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس شخص کے حوالے سے اس کا نام لیا جاتا تھا۔ پھپھو جب بھی یہ بات سنتی تھیں صرف مسکرانے پر اکتفا کرتی تھیں۔ انہوں نے بھی تردید کرنا ضروری نہیں سمجھی۔ نہ ہی تصدیق کرنا۔ آج وہ پہلی بار نہایت پیار سے...... اپنائیت سے، اس سے دل کی بات کر رہی تھیں۔ کیا یہ بات انہوں نے بابا سے بھی کی ہوگی؟ اس کے دماغ کی اٹکی سوئیاں اسے چبھنے لگیں۔
"اس کی یونیورسٹی ختم ہونے میں تھوڑی دیر باقی ہے......" وہ یقیناً بیٹے کے حوالے سے کہہ رہی تھیں۔ "تم تب تک میرے پاس آ کر رہو گی۔ وہاں تم کالج میں داخلہ لے لینا، خوب سارا پڑھنا۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے اُس کے بعد اپنے گھر میں......" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوئیں۔ یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ بار بار اس کی شادی کی بات دہراتیں۔ "کیونکہ یہاں فی الحال کے لیے بھی تمہیں اب شاید کوئی رکھنے کو تیار نہیں۔ پہلے تمہارا باپ تھا تو چلو اور بات تھی۔" ان کا لہجہ بے حد ملامتی ہوا۔ پھر اس میں گہرے رنج کی آمیزش ہوئی۔
ماریہ کو سن کر حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس گھر کے لوگوں کے رویے بچپن سے سہنے کی عادی تھی۔
"تمہاری ماں بھی میں ہوں اور باپ بھی...... صرف پھپھو نہیں رہی ہوں۔ یا تم اپنی ماں کے پاس......"
"نہیں......" اس نے سے کا توقف کیے بغیر ان کی بات رد کر دی تھی۔ اس کے دل میں کوئی جذبات نہیں اُبھرے تھے۔ اتنے سال جس کے بغیر گزر گئے تھے۔ اب اس کو کیا اس کی ضرورت ہو سکتی تھی۔
پھپھو خاموش نظروں سے اسے دیکھے گئیں۔ وہ اس کی نفسیات کو عام بچوں کے نفسیاتی پیمانے پر پرکھنے کی بھول نہیں کر سکتی تھیں۔
"اللہ تمہیں خوش رکھے۔" وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے ساکت و صامت چھوڑے چپ چاپ اٹھ آئی تھیں۔ وہ باہر جا رہی تھیں تو قدموں سے ایک شکستہ سی خاموشی لپٹی ہوئی تھی۔ کوئی اعصاب شکن سے لمحے تھے۔ مدوجزر بل کر رہ گئے تھے۔ زاویے تبدیل ہو گئے۔ چیزیں اپنے مدار سے ہٹ گئیں۔
آج کا سورج دن کی منڈیر سے پھسلتے پھسلتے اس کی زندگی کا ایک نیا باب کھول کر شام کے کنویں میں جا گرا تھا۔ اپنی زندگی کے اس نئے باب کے نشیب و فراز سے بے خبر...... مضمون کے متن سے ناواقف...... وہ فقط اس کا

''عنوان'' سن کر ہی گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھی......!!

☆☆☆

شاہراہ کنارے کھڑی گورنمنٹ کالج کی اونچی عمارت سخت دھوپ میں جھلس رہی تھی۔ سالہا سال کے موسمی اتار چڑھاؤ نے اس کی رنگت کو مٹیالا کر دیا تھا۔ سنہری دھوپ کی رنگت آج آگ جیسی تھی۔ گرما زوروں پہ تھا۔ سورج سوا نیزے پہ۔ گاڑیوں تلے بچھی سڑک بھاپ اگل رہی تھی۔ عمارت کے اندر آؤ تو کمرے بھی اسی حدت کا سامنا کر رہے تھے۔ راہداری میں گھومتی پھرتی سفید یونیفارم میں لڑکیاں پسینے پونچھتیں ہلکی سی پڑ رہی تھیں۔ اُونچی پونی ٹیل، پیروں میں اسنیکرز، صاف شفاف چہرے۔ ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی کی بوتلیں۔ چہرے پر رگڑتے ٹشو پیپرز۔ اور ہونٹوں پر رازدارانہ سرگوشیاں۔ سیکنڈ ایئر کی کلاس دو رویہ کمروں کی قطار میں سے دائیں جانب تیسرے روم میں ہو رہی تھی۔ کلاس روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چھت پر لٹکے دو سیلنگ فین پوری آواز میں احتجاج کر رہے تھے۔ عقبی دیوار پر لگا نام کا اے۔ سی جیسے اُونگھ رہا تھا۔

اسٹوڈنٹس کی اتنی تعداد نے کلاس روم کا ماحول کچھ اور زیادہ گھٹن زدہ کر دیا تھا۔ جس کے باعث کنجوسی سے اسپرے کیا گیا روم فریشنر ایک سانس لینے پر دوسری سانس میں دم توڑ جاتا تھا۔ پھر وہی حبس اور گھمسان۔

کرسیوں کی دوسری قطار میں تیسری کرسی پر بیٹھی ڈھلے منہ اور سادہ سے حلیے میں وہ واحد لڑکی تھی جو اس گرمی سے بے نیاز تھی۔

اس کی سفید یونیفارم کا ہم رنگ دوپٹا پسینے سے گالوں کو چپکا ہوا تھا۔ لڑکیاں اسی گرمی کے سبب اکثر غیر حاضر رہتی تھیں۔ مگر وہ اپنی باقی ہم جماعت لڑکیوں کی طرح بار بار چہرے کا پسینہ صاف کرنے کے بجائے اپنا نم ہاتھ کھولتی تھی اور ہتھیلی رگڑتی تھی۔

ہاتھ کا پسینہ صاف ہو جاتا تو وہ دوبارہ سے پین پکڑتی اور اپنے موٹے رجسٹر کے صفحے پر قلم گھسیٹنے لگتی۔ اس طرح بار بار قلم ہاتھ سے پھسلتا نہیں تھا۔ اور صفحے پر بھی داغ نہ چھوڑتا۔ کلاس کی باقی لڑکیاں جنہوں نے میم کی بات کو زیادہ توجہ نہ دی تھی، اور باتوں میں مگن ہو گئی تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کے بیچ بیٹھ کر پورے انہماک سے کلاس ایکٹیویٹی کر رہی تھی، جو میم نے کچھ دیر پہلے دی تھی۔

اس نے کیلکولیٹر کا ''آن'' بٹن پریس کیا تو وہ ایکٹیو نہیں ہوا۔ اس نے کیلکولیٹر الٹا کر کے دو تین بار اپنی ہاتھ پر مارا تو کیلکولیٹر کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ وہاں نمبرز چمکنے لگے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ڈیوائسز اس کو دھوکا نہیں دیتیں۔ بس انہیں ہنٹرے مار کر نیند سے جگانا پڑتا ہے۔ غنودگی سے ہوش میں لانا پڑتا ہے۔ اس نے چند منٹ میں اس میں ویلیوز ڈال کے انرجی، ویو لینگتھ، اور فریکوئنسی کیلکولیٹ کی اور سلوشن میم کو جا کر دکھایا۔ حسب معمول میم کے لبوں پر ستائشی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ کلاس میں یہ ان کی واحد اسٹوڈنٹ تھی، جو انہیں کبھی مایوس نہیں کرتی تھی۔

وہ کہہ دیتیں کہ خالی صفحے پر دس لکیریں کھینچ کر دکھاؤ۔ جہاں باقی کلاس وہ بات مذاق میں ہنس کر اڑا دیتی۔ یہ لڑکی وہ دس لکیریں بیس طریقوں سے کھینچ کر دکھانے آ سکتی تھی۔

''ویل ڈن بیٹے!'' انہوں نے اس کے صفحے پر بڑے بڑے شاباشی کے ریمارکس لکھے تھے۔ انہیں اس سے بہت اُمیدیں تھیں۔

ایسے بچوں سے ہر ایک کو اُمیدیں ہوتی ہیں۔ جو مضمون سب کو مشکل لگتا تھا۔ وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کتراتی نہیں تھی۔ وہ محنتی تھی۔ ذہین تھی۔ اور عام لوگوں سے مختلف تھی۔

''آپ بہت شارپ ہیں۔ اس فیلڈ میں بہت نام کمائیں گی۔'' وہ میم سے سن کر دھیرے سے مسکرا دی۔

ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ۔اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"خاموش کلاس......!" وہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تو میم نے اونچی آواز میں سب کو متوجہ کیا تھا۔ لمحے بھر کو ساری سرگوشیاں تھم گئیں۔کامل سکوت چھا گیا۔

"آپ سب کو پتا ہے کہ یہ آپ کا انٹر کا آخری سال ہے۔اب تک آپ سب کے پاس اپنے اپنے فیوچر گولز ہوں گے۔اپنے پلانز واضح ہوں گے۔کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کے بعد آپ لوگوں نے کس طرف جانا ہے؟"

یہ ایک دلچسپ موضوع ہوتا ہے۔ ہر استاد کے لیے،اپنے طالب علموں سے ان کے منفرد آئیڈیاز جاننے کا......ہر طالب علم کا اپنے مینٹور کے سامنے اپنے خوابوں کو زبان دینے کا......!!

"میم!شادی کرنی ہے اور عیش۔"

کسی کونے سے مدھم سی آواز آئی تھی۔کلاس کے سکوت کو اونچی ہنسی کی آوازوں نے مجروح کر ڈالا تھا۔میم نیم نما مسکراتی رہیں۔ایسے کومنٹس کا انہیں اندازہ ہوتا تھا۔اکثر لڑکیاں کہتی تھیں اور اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

"گڈ......اور؟"

"میم ڈاکٹر بننا ہے۔"

"میڈیکل......"

"پولیس میں......"

"میم یہ پاپا ڈیسائیڈ کریں گے۔"

"میں آرام کروں گی۔"

"پائلٹ......!"

"مجھے ڈرماٹالوجسٹ بننے کا شوق ہے۔"

"مجھے بینک کی جاب بہت فیسینیٹ کرتی ہے۔"

وہ سب کی بات پر سر ہلاتی رہی تھیں۔آدھی کلاس میں چند لوگ پائلٹ،پولیس آفیسر،اور بینکر،جبکہ باقی آدھی کلاس میڈیکل سے منسلک شعبوں کا انتخاب کرنا چاہتی تھی۔شاید یہ کہنا سہل لگتا تھا اس لیے۔بے شمار شعبوں کی آگاہی نہ ہونے کے باعث اس عمر میں ہر بچے کی دنیا میڈیکل کے گرد گھوم کر وہیں آ رکتی ہے۔ڈاکٹر بننا زندگی موت کا مسئلہ۔کچھ کو شوق اور کچھ دیکھا دیکھی میں یہ شعبہ پر کشش لگتا ہے۔

"پریشے آپ......" ان کی آواز پر ان کی پسندیدہ اسٹوڈنٹ نے سر اٹھایا تھا۔انہوں نے جان بوجھ کر اس کو آخر میں موقع دیا کیونکہ وہ اسے فرصت سے سننا چاہتی تھی۔

صرف ایک پل کے لیے پریشے کے چہرے پر شائستہ سی مسکراہٹ لہرائی۔وہ جواب دینے کے لیے ان کے احترام میں اپنی نشست سے کھڑی ہو رہی تھی۔

"ڈاکٹر،انجینئر،پائلٹ......آپ تو کسی بھی فیلڈ میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ فزکس تک آپ کی بہت اسٹرونگ ہے۔آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوگی۔" وہ اس کے لیے اکثر یہ کہتی تھیں۔وہ ہر مضمون میں یکساں ماہر تھی۔پریشے کے چہرے پر سپاس گزار سی مسکراہٹ آئی۔مگر اگلے پل اس نے نرم لہجے میں ان کی بات کی تردید کر دی تھی۔

"نہیں میم!میں نے ان سب فیلڈز میں جانے کا کبھی نہیں سوچا۔" اس کا اشارہ ان تین شعبوں کی طرف تھا

جو میم نے اس کے لیے بولے تھے۔ اس کی یہ بات انہیں حیرت میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔
"یعنی آپ نے میڈیکل میں نہیں جانا۔ اور نہ ہی......" انہوں نے تصدیق چاہی کہ ان کے سامنے کھڑی نفی میں سر ہلاتی یہ خود اعتمادی سی لڑکی یہی کہہ رہی ہے نا۔
"تو پھر کیا سوچا ہے؟" وہ تجسس میں بولیں۔ پوری کلاس متجسس ہوئی۔
"چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ......!"
ایک دلفریب سی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کا احاطہ کرلیا۔ پوری کلاس دم بخود رہ گئی تھی۔ بہت سے چہرے وہ نام بھی پہلی بار سن رہے تھے۔
"میں School of Accountancy (اسکول آف اکاؤنٹینسی) میں جانا چاہتی ہوں میم!"
وہ مشکل ترین فیلڈ کا انتخاب کررہی تھی۔ وہ یہ کرسکتی تھی۔ وہ خشک ترین مضامین پڑھ سکتی تھی۔ اس کے شوق عام بچوں جیسے نہیں تھے۔ وہ اپنے تمام کلاس فیلوز کی طرح سائنسی مضامین کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میڈیکل اس کے لیے پوری دنیا نہیں تھی۔ ڈاکٹر بننا اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ نہیں تھا۔
"چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ......" میم کے چہرے پر بے یقینی سی پھیل گئی۔ "آپ پری میڈیکل کررہی ہیں۔ لیکن آپ کو بزنس اسکول جانا ہے؟" ان کی حیرانی بے جا نہیں تھی۔ یہ کیسا مضامین کا عجیب سا امتزاج تھا؟
"میں جانتی ہوں میم! لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس کے لیے مجھے کوئی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ میں اسمارٹ ورک کی قائل ہوں اور ہارڈ ورک سے ڈرتی نہیں ہوں۔"
"پھر بھی جن چیلنجز سے آپ پہلے ہی یوز ٹو ہیں۔ آپ کو نہیں لگتا وہ ہمارا اسپلا کمفرٹ ہوتے ہیں؟"
"ایگری میم! (متفق)۔" اس نے کھلے دل سے ان کی بات قبول کی۔ "لیکن مجھے ایم بی بی ایس میں وہ چارم محسوس نہیں ہوتا۔"
کیا شانِ بے نیازی سے اس نے کندھے جھٹکے تھے۔ میم کا دل چاہا وہ اس کی بات پر قہقہہ لگائیں۔ تاہم انہوں نے محظوظ ہونے پر اکتفا کیا۔ وہ اس گفتگو سے لطف اندوز ہورہی تھیں۔
"مجھے ہمیشہ سے بڑی بڑی کمپنیاں پرکشش لگتی ہیں۔ اٹریکٹو اینڈ اپیلنگ۔ شاید میں وہاں سروس کرنے کے لیے بنی ہوں۔ میری Decision making (فیصلہ لینے کی قوت) اور اسٹرونگ پلاننگز کے لیے یقیناً انہیں میری ضرورت ہے۔"
اس نے فخر سے کہا۔ پھر اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "پہلے میں وسائل بناؤں گی۔ پھر ایک دن اپنی کمپنی کھڑی کروں گی۔"
آخر میں وہ خود شناسی کے عالم میں مسکرائی تھی۔ کوئی اور نہیں مسکرایا۔ وہ اپنی جن صلاحیتوں کا ذکر کررہی تھی۔ وہ کہاں استعمال ہونی تھیں اور ان کا کیا فائدہ تھا۔ وہاں بہت ساری لڑکیوں کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا۔
"کیا آپ کے اردگرد کوئی انسان اس فیلڈ میں ہے؟" میم اپنے چہرے پر متاثر کن تاثرات چھپانے میں بری طرح سے ناکام رہی تھیں۔ وہ بیک وقت دو جذبات کا شکار ہوئی تھیں۔
"یس میم......!" اس نے اسی اٹھے سر، تمتماتے چہرے اور خوشگوار لہجے کے ساتھ پورے اعتماد سے جواب دیا۔ "میرا ایک بہت قریبی انسان اسکول آف اکاؤنٹینسی میں پڑھ رہا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو بھی وہیں دیکھتی ہوں۔"
کلاس میں پن ڈراپ سائلنس چھایا ہوا تھا۔ سب نے میم کے چہرے پر فخریہ تاثر ابھرتے پایا۔ سب لڑکیاں سر اٹھائے پریشے کو تک رہی تھیں۔ پریشے اب انہیں مطمئن کرکے اپنا دوپٹا سنبھالتی اپنی نشست پر بیٹھ

رہی تھی۔اس کے چہرے پر کئی رنگ تھے۔جو عین اس کی شخصیت کا عکس تھے۔اس کے اعتماد کا مظہر تھے۔وہ ہر ایک کو متاثر اور لاجواب بیک وقت کر سکتی تھی۔

اساتذہ اس کے بارے میں درست رائے رکھتے تھے۔وہ صرف قابل نہیں تھی۔وہ انداز و اطوار میں، سب سے مختلف تھی۔بول چال میں، سوچ میں سب سے الگ۔

☆☆☆

ذکر ہے فرید آباد (جو بولنے میں فریدہ آباد مشہور ہے) کالونی کا......اس کالونی کی کچھ تنگ، کچھ وسیع بے شمار گلیاں......اور ان گلیوں میں سے ایک گلی میں بنا وہ ڈھائی مرلے کا ایک مکان۔مکان کا آہنی گیٹ عرصہ دراز سے نیلا آسمانی۔

ذکر چلا ہے تو سنو یہ مکان فقط مکان نہیں تھا۔اس میں بستے پانچ مکینوں کے لیے امان تھا۔

کہانی سڑک اُتر کر لیڈی ڈاکٹرز کے کلینک، بجلی کی الجھی تاریں، اور سیلون کے بورڈز نظر انداز کرتی کئی گلیاں پھیلانگے گی، اشیاء خوردونوش کی دکانیں اور اسٹالز سے گزرے گی۔چوک عبور کرے گی، یہاں تک کہ گلی کے سرے پر بنے دوسرے نمبر والے اس ڈھائی مرلہ گھر میں جا گھسے گی۔جس کی کہانی سنائی جانے لگی ہے۔گیٹ پر کوئی نیم پلیٹ نہیں لگی۔اگر لگتی تو وہ "رقیہ اقبال ولا" کہلاتا ورنہ یقیناً "رقیہ اقبال پیلس"......!! گھر مختصر تھا مگر اپنے مکینوں کے عمدہ ذوق کا منہ بولتا ثبوت۔نیلے آسمانی گیٹ سے اندر آؤ تو دو قدموں کے فاصلے پر برآمدہ تھا۔برآمدے کے پیچھے دو کمرے۔ایک کمرے کے باہر برآمدے میں ہی رکھا فریج، اور اس فریج کی سیدھ میں چلتے جاؤ تو وہ کمرے سے ملحقہ کچن تھا۔برآمدے کے سامنے صحن کے نام پر دو گز جتنا پلستر شدہ فرش تھا۔جس کی دیوار کے ساتھ گملے رکھے جاتے تھے۔اور یہیں سے بارش برستی......تو برآمدے میں بیٹھ کر چائے اور پکوڑوں کے ساتھ بارش کا نظارہ ایک دلچسپ منظر ہوتا تھا۔بارش کی سوندھی سوندھی سی خوشبو پکوانوں کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔اسی پلستر شدہ فرش نما صحن کے آخری سرے پر چھوٹا سا واش روم تھا۔واش روم کے بالکل سامنے بنی تنگ سیڑھیاں چھت کو لے کر جاتی تھیں۔

باہر کڑکتی دھوپ اس گلی میں بھی بسیرا کیے ہوئی تھی۔جو دور دراز تک ویران تھی۔یہ فرید آباد کالونی کی اسی گلی کا ذکر ہے۔جو تپتی دوپہر کے اس پہر ویران ہے۔ایسے میں دور سے کسی گھر سے ایک وجود نکلا اور چلتا ہوا قریب آتا دکھائی دینے لگا۔اس وجود کا رخ اسی گلی اور ڈھائی مرلہ گھر کی جانب تھا۔تپتی دھوپ میں لان کا سادہ مگر قدرے بہتر سوٹ پہنے، نیوی بلیو کلر کی چھوٹے پھولوں والی لمبی چادر سے پورے بدن کو ڈھانپے، اور پیروں میں آرام دہ جوتے۔ان کا جسم فربہ تھا۔شخصیت پُر وقار۔وہ ایک محنت کش عورت تھیں۔ہانپتا ہوا مگر زمانے کی سختیاں اور موسموں کے تغیر حوصلے سے جھیلنے والا باہمت وجود۔شدید گرمی کی وجہ سے پسینہ، اور سانس پھولا ہوا تھا۔ان کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا۔جس کو وہ کبھی ہاتھ میں پکڑ لیتیں۔کبھی کمر پر لٹکا لیتیں اور تھک جاتیں تو سر پر رکھ لیتی تھیں۔فرید آباد کالونی کے کئی گھر ان کی پہچان رکھتے تھے۔ان کی بھی اور ان کے ہاتھ میں موجود تھیلے کی بھی۔

وہ ایک "بزنس وومن" تھیں۔عزت و خودداری سے رزق کمانے والی خاتون۔

ان سے بھی اپنی غربت کا رونا نہیں رویا گیا۔کسی نے بھی ان کا حلیہ غریبوں والا نہیں دیکھا۔

سالوں پہلے انہوں نے چھوٹے پیمانے سے بزنس شروع کیا تھا۔سالوں بعد بھی وہ مستقل مزاجی سے کپڑا خرید کر لاتی تھیں اور گھر میں بیٹھ کر فروخت کرتی تھیں۔

چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی اوقات، سے اور حالات سے عاری۔ان کو کپڑے کے رنگ کی، اسٹف کی، پرنٹ کی اور برینڈ کی شناس تھی۔آہستہ آہستہ یہ پیمانہ وسیع ہوتا گیا۔دور پاس کے تمام گھرانے ان کے گاہکوں میں آتے

تھے۔ جوان کے گھر نہیں آتے تھے وہ خود ان کے گھر جا کر سروس دیتی تھیں۔ اونچے گھروں کی بیگمات، اسکول کی ٹیچرز و پرنسپل، اٹامک انرجی، اور شعبہ صحت سے منسلک لوگ...... جاب ہولڈر خواتین جنہیں وہ ہر دفعہ نئے ڈیزائن آنے پر گھر جا کر دکھا آتی تھیں اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

اتنے سالوں کے ساتھ نے انہیں یہ بھروسا اور اعتماد عطا کر دیا تھا کہ اب تو انہیں یاد رہنے لگا تھا کہ کون سا کپڑا کس گھر جانا چاہیے......اور کس کی نگاہ پسند اس پر ٹھہر جائے گی۔ اکثر خود فرمائش کرلی تھیں ورنہ کہہ دیتیں۔

”رقیہ آنٹی! آپ کو تو پتہ ہی ہے میرا...... بس اپنی پسند کا اور میرے حساب کا کپڑا لے آنا۔“

دراصل فرید آباد میں ہر طبقہ آباد ہے۔ غریب، سفید پوش، امیر، بہت امیر، اور اچھی اچھی پوسٹ پر تعینات گھرانے، اس لیے ان کے پاس ہر طرح کے کسٹمر تھے۔

واپس اس سنسان اور پتلی گلی میں آئیں تو وہ چوک عبور کر کے گلی کے سرے پر اس دوسرے نمبر والے ڈھائی مرلہ گھر کے گیٹ پر ٹھہر گئی تھیں۔ جس پر کوئی نیم پلیٹ نہیں لگی ہوئی۔ اور جو اگر لگتی تو وہ ”رقیہ اقبال ولا“ ہوتا...... ورنہ یقیناً ”رقیہ اقبال پیلس“...... یہ تھیں رقیہ بی بی۔ اس گھر کی مالکن۔ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتیں ایک محنت کش بہادر عورت۔ چار بیٹیوں سمیت اس گھر کی پانچویں عورت۔

دو گھڑی سانس درست کرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر لوہے کے گرم دروازے پر دستک دی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنا نقاب ڈھیلا کرتیں جو گرمی کے باعث بہت تنگ کر رہا تھا، انتہائی سرعت سے ایک جھٹکے میں دروازہ کھولا گیا تھا کہ ان کا متحرک ہاتھ حرکت کرنا بھول گیا۔

”امی وہ......“ متغیر رنگت کے ساتھ جو باہر نکلی تھی زویا...... ان کی چھوٹی بیٹی، جو یقیناً ابھی ابھی اسکول سے واپس آئی تھی۔ اور اسی اسکول یونیفارم والے حلیے میں تھی۔ ہراساں چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔

رقیہ بی بی کے چہرے کا رنگ پلک جھپکتے بدلا۔ چہرے کے نقوش تن گئے۔ جسم جو منزل پر پہنچ کر آرام کے خوش کن خیال سے گزر رہا تھا۔ اس مرجھائے اور سست وجود میں یک بیک کرنٹ دوڑ گیا تھا۔

”اللہ خیر کرے...... کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے اپنی مضبوط آواز سے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”امی اندر کب سے......“ زویا بے چارگی وسہمے تاثرات میں اپنی پشت کے پیچھے کمروں کی طرف اشارہ کرتی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی۔ یعنی آج پھر ان کی غیر موجودگی میں وہ لوگ موجود تھے۔ انہوں نے پیشانی چھوئی۔ وہ یہ کیسے بھول گئی تھیں۔ وہ تھیلا اٹھائے۔ اس کو آگے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے اندر آئی تھیں۔ کپڑوں کا تھیلا وہیں پلستر شدہ فرش پر چھوڑا اور مڑ کر زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا۔

اپنے اندر مضبوطی پیدا کرتیں، متحرک قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں صرف ایک ہی استفسار کیا تھا۔

”وہ کہاں ہے......؟“

☆☆☆

اس شام کا سورج مقبرہ جہانگیر، آصف جاہ اور ملکہ نور جہاں سمیت تمام مقبروں اور قلعوں کے اندر سے جھانکتا ہوا راوی کے پانیوں پر پیچے رنگ بکھیرتا ہوا آخر مغرب کو جھک رہا ہے۔ اُفقی کناروں کے در وا ہوئے ہیں۔

اور شہر لاہور کے در و بام پُر ہجوم!

یہ شہر لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا منظر ہے۔ وسیع و عریض، ہجوم سے اٹا، طرز تعمیر میں شاہی قلعہ جیسا دلکش اور مغلیہ فنِ تعمیر کا نمونہ۔ پلیٹ فارم، ٹکٹ گھر، سائن بورڈ، ٹرین کی سیٹی اور اشیاء خورد و نوش کے اسٹال۔ یہ ایک

اپنی ہی مختصر سی بسی بسائی دنیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے آسمان کا سینہ کسی بھٹی کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کے خدوخال میں لالی چھائی ہوئی تھی۔ فضا پرندوں سے عاری تھی۔ طائر اپنے آشیانوں کو لوٹ گئے تھے۔ اور لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے کو بے تاب۔ بھانت بھانت کی آوازیں آرہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر مختلف شکلوں اور رنگ برنگی ملبوسات کے لوگ تھے جو اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے سے نکل رہے تھے۔ کچھ اس سے ٹکرا رہے تھے۔

ٹرین دس منٹ پہلے آکر سٹاپ پر رکی تھی۔ اور وہ آدھا گھنٹہ پہلے اس کے انتظار میں پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ چہل قدمی...... یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسے چہل قدمی کے دوران بہت اچھی اچھی سوچیں آتی تھیں۔ وہ کئی خواب چلتے پھرتا دیکھتا تھا۔ اس کو یہ عجیب سی بیماری تھی۔ اور یہ بیماری اسے محبوب تھی۔

جب ٹرین اسے دور سے نظر آئی تھی اسے یہ مشغلہ بھی ترک کرنا پڑا تھا۔ چہل قدمی چھوڑ کر وہ اس کے انتظار میں مؤدب سا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ جیسے ٹرین سے اترے گی اور اسے دیکھے گی تو وہ ایک دوستانہ مسکراہٹ سے اسے نوازے گا۔ اور وہ مسکراہٹ ایسی ہوگی کہ اسے خوش آمدید لگے گی۔ وہ بلا کا خوش مزاج تھا۔ وہ اگلے کو کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ چاہے وہ پہلی ملاقات کے ابتدائی لمحات کیوں نہ ہوں۔

لیکن اس کا یہ منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا جب نہ تو اس کی مطلوبہ شخصیت اُتری۔ نہ اس نے اسے مسکراہٹ پیش کرنے کا موقع دیا۔ اسے گمان گزرا جیسے وہ ٹرین سے اُتری ہی نہیں! اب وہ بے چینی سے اس کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر اُدھر جا رہا تھا۔ یہ کسی کی تلاش میں عجلت میں اٹھتے پڑتے قدم تھے، چہل قدمی نہیں۔ اس لیے اسے کوفت کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔

ممی نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ وقت سے پہلے جا کر اس کا انتظار کرے۔ ٹرین کے وقت کا کون سا پتا ہے، دیر ہو جائے یا سویر۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرا جاتی ہے۔ پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ پہلی بار اتنے بڑے شہر آ رہی ہے۔ ڈرنے کی کوئی ایسی ضرورت تو نہیں مگر وہ سارا راستہ سہمی رہے گی۔ اب ممی کی چہیتی نجانے کہاں سہمی ہی رہ گئی تھی کہ اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ معاً ایک لڑکی پر اس کی نگاہ ٹھٹکی۔ وہ تیسری بار اس کے سامنے گزر رہی تھی۔ بولائی بولائی سی۔ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی۔ اتنی ڈھکی ہوئی کہ لمبی سیاہ چادر میں کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اندر کوئی انسان ہوگا یا کپڑوں میں لپٹی کوئی عجیب مخلوق۔

ممی نے اُسے کہا تھا کہ وہ اسے دیکھے گا تو پہچان لے گا۔ اسے نجانے کیوں گمان گزرا کہ اس نے واقعی اسے پہچان لیا ہے۔ وہ چوکنی ہو کر آگے بڑھ رہی تھی۔ یقیناً گہری اور تیکھی چتونوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتی ہوئی (اس کی آنکھیں واضح نہیں تھیں یہ محض اس کا اپنا قیاس تھا)۔ اس سے قبل کہ وہ آگے نکل جاتی وہ بے ساختہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”ایکسکیوز می......!“ اس کی پکار پر چلتے قدم تھم گئے۔ سیاہ چادر نما وجود مڑا۔ چادر پر گرفت مضبوط ہوئی۔ شکل نموادر نہ ہوئی۔ فقط ایک لمبا سا سیاہ ہیولا۔ وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

”آپ ممی کی بیجی...... میرا مطلب ہے ماریہ ہیں آپ؟“ اس کے منہ سے پھسل گیا تھا۔ فوراً احساس ہونے پر اس نے گڑبڑا کر تصحیح کی۔ کتنا غیر مناسب لگتا تھا نا ایسے مخاطب کرنا۔ یا اس طرح متعارف ہونا۔ وہ ڈر رہا تھا کہیں برا نہ منا یا جائے۔ وہ خوش مزاج تھا۔ اگر اگلے کا خوش اخلاقی سے واسطہ نہ ہوا تو؟

”جی......“ سیاہ ہیولے سے بے یقین سی پھنسی پھنسی آواز اُبھری۔ یوں جیسے ایک اطمینان بھرا سانس لیا گیا تھا۔ وہ کہیں سے ڈری نہیں لگ رہی تھی۔ صرف پریشان نظر آتی تھی۔ لیکن اس کی آواز نے آشکار کر دیا کہ وہ کتنی گھبراہٹ کا شکار ہو چکی تھی اتنے سے وقت میں۔

''آپ عباد ہیں، آپ نے اتنی دیر کر دی مجھے پہچاننے میں......؟'' اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''پھپھو نے تو کہا تھا آپ دیکھتے ہی پہچان لیں گے، خاک پہچانا آپ نے!'' سیاہ ہیولے کے اندر سے ماریہ بی بی خفا ہو کر بول رہی تھی۔ خفگی سے تھوڑا آگے ڈپٹنے والا انداز۔ وہ یقیناً بہت پریشان ہو چکی تھی ورنہ کبھی اس طرح کا رویہ اختیار نہ کرتی۔ عباد ہکلا گیا۔

''آپ کی پھپھو نے تو یہ بھی کہا تھا کہ آپ بھی مجھے دیکھتے ہوئے پہچان لیں گی؟''

اسے صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ کیسے ایک مہمان سے...... وہ بھی لڑکی سے...... وہ بھی چند گھڑیاں پہلے ملنے والی انسان سے جھڑکیاں کھا رہا تھا۔ کوئی اس کو کیسے ڈانٹ سکتا تھا۔ کیا اسے اس کی معصومیت نظر نہیں آ رہی؟ کیسے آئے گی جو اس نے شامیانے جیسی لمبی چادر لپیٹ رکھی ہے۔ اس نے سوچ کر خود کو تسلی دی۔ مگر کہنے والی کہہ رہی تھی۔

''ہاں تو اس کے لیے آپ کا سامنے آنا ضروری تھا۔ اب پہچان لیا ہے میں نے آپ کو۔ آپ نجانے کہاں چھپ کر کھڑے تھے۔'' اس کا صدمہ مزید گہرا ہوا۔ یعنی سارا قصور اس کا تھا۔

''کیسے پہچانا آپ نے؟'' اس نے ضبط کا دامن تھامتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''وہ......'' وہ لحہ بھر کو ٹھہری۔ ''اول تو پھپھو سے کافی مشابہت رکھتی ہے آپ کی شکل اور......'' ایک بار پھر رکی۔ ''آپ کی یہ ڈاڑھی کا اسٹائل۔''

ماریہ کے بے لاگ تبصرے پر عباد سٹپٹایا۔ پھر خجل ہو کر رہ گیا۔ وہ اسے بتا نہیں سکا کہ یہ اس کا سٹائل نہیں تھا۔ اس کی داڑھی قدرتی ہی ایسی تھی۔ کہیں سے اُگی ہوئی...... کہیں سے اڑی ہوئی۔ ممی بھی نجانے اس کے حلیے کا کیسا نقشہ کھینچ کر آئی تھیں......!!

''اور میں آپ کو کیسے پہچانتا ذرا یہ بھی بتا دیں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اطمینان سے پوچھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس لڑکی کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ گھر چلنے کی بات کرنا سرے سے بھول گئی ہے۔

''نہ تو میں آپ کی شکل سے پہچان سکتا تھا جو کہ اس لمبی سی چادر میں ڈھکی ہوئی ہے......'' عباد نے گول گول انگلی گھمائی۔ ''نہ آپ نے کہیں ٹیگ لگا رکھا ہے کہ آپ ماریہ ہیں۔ اوپر سے آپ مجھے چھپے رہنے کا الزام دے رہی ہیں۔ جبکہ اصولاً تو آپ چھپی ہوئی ہیں۔ نہیں؟'' اس کا اشارہ ایک بار پھر اس کی چادر کی طرف تھا۔ ماریہ کو یکدم احساس ہوا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ اسے اس کی مبہم سی مسکراہٹ بھی نظر آئی تھی۔

''ہاں تو......'' وہ کھسیا سی گئی۔ جواب میں کوئی بات نہیں بن پڑی تھی۔ اس لیے خوب صورتی سے بات بدل دی۔ ''اچھا وہ...... پھپھو کہیں نظر نہیں آ رہیں؟''

اس نے یہ بات بنا سوچے سمجھے اپنی خفت مٹانے کی خاطر کہی تھی۔ لیکن جواب میں عباد کے بے ساختہ قہقہے نے پلیٹ فارم پر کئی گردنیں مڑنے پر مجبور کر دی تھیں۔

''آپ ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہیں مس ماریہ! یہ آپ کی پھپھو کا گھر نہیں ہے کہ وہ آپ کو چلتے پھرتے، کام کرتی یا آپ کا استقبال کرتے نظر آ جائیں۔'' وہ منہ کھول کر ہنس رہا تھا۔ اور ماریہ جھینپی جھینپی کھڑی تھی۔ دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

''تو پھر چلیں ناں! پھپھو پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' اس نے دل کڑا کر کے اس کی ہنسی نظر انداز کی اور اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا جو چند قدموں کے فاصلے پر پڑا تھا۔

یہ ایک بڑا سا شاپر تھا۔ لیکن عباد نے اٹھایا تو اسے وہ خاصا ہلکا لگا۔ جیسے اس میں کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ شاپر ایک ہاتھ میں اٹھائے وہ آگے آگے چلنے لگا...... ماریہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ دونوں مکمل طور پر

فراموش کر چکے تھے کہ بچپن گزر جانے پر وہ کئی سال بعد آج مل رہے تھے۔ اور دونوں کو کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

''اچھا، آپ نے بتایا نہیں کیسے ہیں آپ؟''

وہ سیڑھیاں اُتر کر ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں چل رہے تھے جب ماریہ کو خیال آیا تھا۔ یہاں پر بھی لوگ ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ بچوں کی بھاگم دوڑ، کھانا پینا، اور پارکنگ میں کھڑی گاڑیاں...... تاہم پلیٹ فارم کی نسبت یہاں شور کم تھا۔ اتنا سا سکون بھی سماعتوں کے لیے راحت کا سبب تھا۔ مغرب کی اذانیں ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ چند گز کے فاصلے پر کھلی اور کشادہ سڑک تھی۔ اس پر بے تحاشا رش اور ٹریفک کا دھواں...... چنگ چی ڈرائیور، مقامات کے نام پکار پکار کر مسافروں کو گھیر رہے تھے۔

''آپ نے پوچھا ہی نہیں کہ میں کیسا ہوں۔ آپ بتادیں کیسا ہوں؟'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ ماریہ نے اس کی پشت کو گھورا اور مسکراہٹ کو ضبط نہیں کر سکی۔ وہ چھوٹا تھا اس سے مگر کیسے چالاکی سے اس کے الفاظ پکڑ رہا تھا۔

''بس مجھے پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے اپنی کوتاہی قبول کی۔

''کیسی پریشانی......؟''

''ایک تو اکیلی لاہور تک آگئی۔ اوپر سے آپ ندارد۔'' عباد بے ساختہ ہنس دیا وہ مزے کی باتیں کرتی تھی۔

''آپ نے راستے میں آدم خور دیکھے تھے؟''

''آدم خور......؟ کہاں مجھے تو نظر نہیں آئے؟'' انداز ایسا تھا گویا اسے نہ دیکھ سکنے کا قلق ہو۔ ''وہ ہوتے ہیں کیا؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''ہوتے ہیں نا...... لاہور میں ہوتے ہیں۔''

''میں نے تو اس بارے میں کبھی نہیں سنا۔''

''ارے......'' وہ حیران ہو کر گھوما۔ ''جس طرح آپ اور ممی پریشان تھیں کہ آپ لاہور آرہی ہیں۔ وہ بھی اکیلی...... مجھے تو آدم خوروں کا خیال آیا کہ کہیں راستے میں پریشان نہ کرتے رہیں...... بلکہ اب تک سیخوں پر فرائی کر کے باربی کیو نہ اُڑا رہے ہوں۔''

''اُف!'' ماریہ کو اس کی شرارت سمجھ میں آگئی تھی۔ اتنے مزے سے بول رہا تھا کہ ماریہ نے سخت گھوری سے نوازا۔

''ایسی بات نہیں ہے بھئی۔ پہلی مرتبہ ہر انسان کو ڈر لگتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ٹرین کا سفر نہیں کیا تھا۔ اور سنیں...... زیادہ طنز مت کرتیں۔ پھپھو نے صحیح کہا تھا آپ کے بارے میں!''

''کک...... کیا فرمایا آپ کی پھپھو نے میرے بارے میں؟'' وہ مصنوعی اداکاری سے بولا۔ ماریہ کو ہنسی آنے لگی۔

''یہی کہ عباد کو زیادہ لفٹ نہ کرانا ورنہ سر پر سوار ہو جائے گا۔ شیطانیاں کرنے کا جنون ہے اس کو۔''

''ہائے حضور!'' اس نے دہائی دی۔ پھر مسکرایا۔ ''اچھا چنگ چی یا چاند گاڑی؟''

''بیل گاڑی......'' ماریہ زور سے ہنسی۔

''اس سے پہلی بھی ایک گاڑی ہوتی ہے جسے......''

''خاموش......'' وہ یقیناً گدھا گاڑی کہنا چاہتا تھا، ماریہ نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی تھی اور کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی...... بچپن کے بعد کی پہلی ملاقات...... دونوں راستے پر کھڑے ہنس رہے تھے۔

''آپ کے بھی میرے والے شوق ہیں۔'' عباد نے ہنسنے میں اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اس کا دل ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

عباد نے بھی پرکھ لیا تھا کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے دونوں کی خوب جمنے والی تھی۔ یہ اس کی ماں کا فیصلہ تھا کہ وہ اب سے ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہنے آ رہی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس کے گھر کے چار افراد میں سے تین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک چوتھا فرد......!

اس پر عباد کی سوئی اٹکی تھی۔ فیصلے والے دن سے اٹک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی چبھ رہی تھی۔

''چوتھا'' فرد بے حد اہم تھا۔ اس پر ماریہ کی قسمت ٹکی ہوئی تھی۔ لیکن چنگ چی میں بیٹھتے ہوئے عباد کا دل اس چبھن سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ اس کے لیے کم از کم عباد کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت مزاج دار تھی۔

زندگی اس کے لیے آسان نہیں رہی تھی۔ مگر اسے زندگی جینی آتی تھی۔ ہنس کے، ہنسا کے...... رو کے یا پھر رُلا کے......!!

لاہور کی وسعتوں میں پھیلتے ملگجے اندھیرے اور ہواؤں کی رتھ پر سوار چنگ چی میں بیٹھی ماریہ...... سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کے درمیان، دور سے نظر آتے مینارِ پاکستان کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ایک ٹھہراؤ۔ اضطراب غائب۔ ایک جاذبِ نظر چہرہ۔

''آپ پہلی بار ہمارے گھر جا رہی ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں وہ آپ کے شایانِ شان ہو...... یقیناً وہ آپ کے اپنے گھر کا مقابلہ تو نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اپنا گھر ہمیشہ بہترین ہوتا ہے۔'' عباد نے اس کو باہر کے مناظر پر نگاہیں مرکوز کیے دیکھا تو تھوڑا اونچا ہو کر لب کشائی کی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم چونکی تھی۔ عباد مزید کہہ رہا تھا۔

''لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس گھر میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔''

''میرا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔''

اس نے سیاہ آنکھیں عباد پر جمائی تھیں۔ اور مسکرا کر جس لہجے میں کہا تھا۔ اس لہجے نے چند پل کے لیے اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''میرے پاس وہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں کبھی نہیں جان سکی کہ اپنا گھر کیسا ہوتا ہے اور اس کو لے کر محسوسات کیا ہوتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر شاید کوئی کرب سا اُترا ہو...... یا پھر دل میں...... اندھیرے نے وہ دیکھنے نہیں دیا۔ آواز بے تاثر تھی۔ اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

عباد لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کیسے بھول گیا ماریہ ایک ''سروائیور'' تھی۔ ایک ''فائٹر''

''اب سے وہ آپ کا ہی گھر ہے۔ ہم جہاں جا رہے ہیں ناں......'' اس نے اٹک اٹک کر لیکن مضبوط لہجے میں کہنا شروع کیا تھا۔ چنگ چی ایک ذیلی سڑک پہ مڑ گیا تھا۔ شور اور ہوا کا دباؤ کم ہو گیا تھا۔ ''اس علاقے کو شاہدرہ کہتے ہیں۔ ہم وہاں رہتے ہیں۔ وہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔ بعد میں ہم کہیں اور بھی گھر لے سکتے ہیں۔''

شاید عباد کچھ زیادہ ہی دل پر لے گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے پٹر پٹر بولتے لڑکے کا دل پگھل رہا تھا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ماریہ حیرانی سے آنکھیں پھیلائے اس کو سنے گئی۔

وہ یہ سب اس کے لیے کہہ رہا تھا۔ کوئی اس کے لیے اپنا آبائی گھر چھوڑ کر اس کی پسند کی جگہ گھر لینے کی بات

کر رہا تھا۔ یہ سب اس کے لیے نیا تھا۔ حیران کن تھا۔ تو کیا اس کی فیری ٹیل شروع ہونے والی تھی؟
''جہاں آپ کہیں گی وہاں...... چاہے ڈی ایچ اے میں، ماڈل ٹاؤن میں، گلبرگ میں، صرف آپ کی پسند ہے......''

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ماریہ کے لب آپوں آپ مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ وہ ان علاقوں کے نام نہیں جانتی تھی، مگر وہ عباد کی محبت کی زبان سمجھ گئی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو وہ بے ساختہ مسکرا اُٹھے۔ ماریہ اس کی معصومیت پر مسکرائی جبکہ وہ اس کی معصومیت پر......

یہ مسکان جیسے دونوں کی ''دوستی'' کا پہلا خاموش معاہدہ تھا۔ وہ معاہدہ جو عباد ماریہ سے رہتی زندگی نبھانے والا تھا۔ نجانے یہ سہارے دے کر زندگی اس کو کسی بہت بڑے دھچکے سے دوچار کرنے جا رہی تھی...... یا حقیقتاً اس کی ''فیری ٹیل'' کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔

شاہدرہ کی آبادی میں آہستہ آہستہ تمام بتیاں جلنا شروع ہو رہی تھیں۔ اس کی آمد پر جگنوؤں جیسی روشنیاں گویا اس کے استقبالیہ کے طور پر بیدار ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

بوڑھی ہوتی دوپہر کے چہرے پر جھریاں ظاہر ہونے لگی تھیں مگر اس کا زعم ہنوز برقرار تھا۔ جس کے زیرِ عتاب گورنمنٹ کالج کی عمارت اسی طرح جھلس رہی تھی۔ کیمسٹری کا لیکچر چل رہا تھا۔ انسانی جسموں میں موجود قوت آخری سانسوں پر تھی۔ ایسے میں لیکچر کا دورانیہ تمام ہونے کی بیل بجی تو یہ جسم ایسے ٹھٹھرا گئے مانو ٹھنڈی پھوار برس گئی ہو۔

یہ صرف لیکچر کے اختتام کی گھنٹی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی کلاس روم بھی خالی ہونے لگا تھا۔ یہ گھنٹی چھٹی کی نوید تھی۔

پریشے نے دوپٹا پھیلا کر اچھی طرح سے اوڑھا اور بیگ کندھے پر لٹکاتی ہوئی باہر کا رخ کرتی تیز تیز قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ اس نے متحرک قدموں کے ساتھ ہی بیگ میں ہاتھ ڈال کر پیسوں کی موجودگی کی تسلی کر لی تھی۔ آج دھوپ انتہائی تیز تھی۔ اور اسے رکشا لینا پڑے گا۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن گیٹ کی سمت بڑھ رہی تھی...... جب تیز قدموں کے ساتھ ہلکا ہلکا دوڑتی اس کی سہیلی اسے پکارتی ہوئی اس کے قریب آئی تھی۔ وہ اپنا نام سن کر چونکی تھی اور اپنے قدموں پر مڑی تھی۔

''کیا یار! پریشے! ہانپ گئی میں بھاگ بھاگ کر......'' وہ واقعی پھولی سانسوں کے ساتھ بے ربط بول رہی تھی۔ اس نے انگلی اٹھا کر عمارت کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں سے دیکھا تمہیں اور بھاگ کر نیچے آئی ہوں۔ ایک تو تمہیں کلاس مس کرتے ہوئے موت پڑتی ہے۔ پھر چھٹی کے وقت تمہاری اڑان الگ...... دوستوں کے پاس بھی بیٹھنا ہوتا ہے۔ یہی تو وقت ہوتا ہے دو گھڑی سکون سے ٹھنڈی ہوائیں لیتے ہوئے گوسپ کرنے کا۔''

اس کی تفصیلی بات پر پریشے کے لبوں کو مسکراہٹ چھو گئی۔ وہ آدم بیزار نہیں تھی۔ یاروں کی یار تھی۔ خدیجہ لائبریری کی بات کر رہی تھی جہاں اس سے عمارت خالی ہونے پر بلا کا سکون اور ماحول بنا ہوتا تھا، اور سب وہاں جمع ہو جاتی تھیں۔

''آئی ایم سوری یار! مجھے گھر پہنچنا ہوتا ہے۔ آج کل ویسے بھی سیشن کے لاسٹ ڈیز چل رہے ہیں۔ وہ پہلے جیسی محفلیں نہیں جمائی جا سکتیں۔''

''اچھا بی پڑھاکو۔ ہم سب فاخرہ کی شادی ڈسکس کر رہے ہیں۔ تم آ رہی ہو ناں؟''

''جھوٹ بولوں کہ سچ۔ سچ بول دیتی ہوں کیونکہ پریشے کو دل رکھنے نہیں آتے......'' اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ خدیجہ کو دیکھتے ہوئے ایک پل کو سوچا پھر معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا۔ ''سوری خدیجہ! میں نہیں آسکتی ڈارلنگ!''

''واٹ......آر یو میڈ؟'' وہ حقیقی صدمے سے چلائی تھی۔

''میری بات سن لو......'' اس نے تحمل سے لب کھولے۔ ''شادی اٹینڈ کرنے کا مطلب ہوتا ہے ایکسٹرا خرچا۔ جو انسان شادی میں جارہا ہے اس کی اپنی ضروریات مثلاً کپڑے، جوتے، جیولری۔ اور جس کی شادی میں جارہا ہے اس کے لیے کوئی تحفہ ورنہ سلامی......اور میں فی الحال یہ ایفورڈ نہیں کرسکتی۔''

''لیکن تم......''

''راضی تھی۔ سب یاد ہے......'' وہ سکون سے ہموار لہجے میں کہتی گئی۔ ''لیکن مجھے اب یاد آیا ہے اسی مہینے آپی کی برتھ ڈے آرہی ہے۔ مجھے انہیں ٹریٹ دینی ہے اور گفٹ۔ فیملی زیادہ اہم ہوتی ہے نا۔ پہلی ترجیح۔ میں اپنے پیرنٹس سے اضافی پیسوں کی ڈیمانڈ نہیں کرسکتی......''

وہ ایسی ہی تھی۔ اسٹریٹ فارورڈ۔ جو بھی بات ہوتی تھی کھل کر پورے اعتماد سے بول دیا کرتی تھی۔ یہ اس کے لیے احساس کمتری نہیں تھی۔ اپنی ترجیحات اور کمفرٹ زون میں رہ کر چیزیں کرنا احساس کمتری نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جیب چھپا کر کوئی جھوٹے بہانے نہیں گھڑ سکتی تھی۔

''اتنی سی اگر بات ہے تم پیسے مجھ......''

''دوبارہ یہ بات مت کرنا خدیجہ......اگر تم چاہتی ہو کہ میں کوئی بہانے نہ تراش کر صرف سچ بولا کروں۔ تو تمہیں اجازت نہیں ہے کہ یہ کہہ کر، میری خودداری کو ٹھیس پہنچانے کی بات کرو۔'' اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ اور سنجیدگی نے اس کی جگہ سنبھالی۔

''فاخرہ ہماری دوست ہے یار!'' خدیجہ اداس ہوگئی تھی۔ وہ بے طرح دکھی نظر آنے لگی۔ پریشے کو دل رکھنے کیوں نہیں آتے تھے؟

''میں فاخرہ کی اپنے گھر پر دعوت کرلوں گی۔ ڈونٹ وری سویٹی!'' اس نے جیسے تسلی کروائی۔ اس کی اپنی مجبوری تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی تشفی بھی ہوجائے۔

''تم اس کی شادی میں نہیں جاؤ گی۔ تمہیں لگتا ہے وہ تمہاری دعوت پر آجائے گی......؟'' وہ کسی قدر تلخی سے بولی تھی۔ بات کڑوی سی لگی۔ حقیقت ہوسکتی تھی اس لیے لگی۔

''میں اپنی سہولت دیکھ رہی ہوں۔ میں اسے دعوت دوں گی۔ اگر وہ اپنی کنوینئنس کے حساب سے انکار کرتی ہے۔ تو یقین کرو میں بھی برا نہیں مانوں گی۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈراسٹینڈ!''

''تمہیں واقعی دل رکھنے نہیں آتے پریشے۔'' وہ اسے شدید ناراضی والا موڈ دکھاتی واپس مڑ گئی تھی۔ پریشے نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر لب بھینچ لیے۔ کندھے اچکائے۔

''پریشے کو واقعی دل رکھنے نہیں آتے۔''

وہ خود کلامی کرتی ہوئی گیٹ کی طرف مڑ گئی تھی۔ سر جھٹک کر اس نے ہر بوجھ سے خود کو آزاد کیا۔ اور چند قدموں کا فاصلہ طے کرکے گیٹ سے باہر نکلی۔ لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ اور انہیں ریسیو کرنے آئے ان کے والدین کی موٹر بائیکس۔ کسی کی وین اور رکشے......اس کی نظر ایکدم سے سامنے کی طرف اٹھی تھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ ایکدم سے وہ آس پاس کی ہر چیز فراموش کرگئی۔ دھوپ، گرمی، کالج، شور، اور لوگ سب فراموش ہوتے گئے۔ اس کا دل چاہا وہ چیخ کر خوشی کا اظہار کرے۔ اس سے ذرا بھر فاصلے پر وہ انسان کھڑا تھا۔ اس کا پسندیدہ

انسان......اس کا ایک بہت اپنا......سر اٹھا کر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور کھلکھلاتی چلی گئی۔اس کو سینے پر ہاتھ باندھ کر دیکھتا انسان بھی بے اختیار ہنسا تھا۔ایسا کرتے ہوئے وہ ایک معصوم بچی سی لگ رہی تھی۔دھوپ بہت شدید تھی۔وہ گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے گاڑی کی باہر کھڑا رہ کر اس کا منتظر تھا۔وہ ہمیشہ اسے پہلی نظر میں دیکھنے کو بے تاب رہتا تھا۔وہ جیسے کالج سے نکلتی......جن خیالوں میں نکلتی......وہ نظارہ دیکھنا اسے مرغوب تھا۔وہ نظارہ اسے محبوب تھا۔پسینے کی ننھی لکیر اس کی چمکتی پیشانی سے بہہ آئی۔مگر وہ بے نیاز سا یوں سینے پر ہاتھ کھڑا تھا مانو برف باری کا موسم چل رہا ہو۔وہ کتنا پاگل تھا۔

وہ کندھے پر رکھے بیگ پر گرفت مضبوط کرتی، چال میں مستی اور چہرے پر دبا دبا جوش لیے اس کی طرف آ رہی تھی۔اس کی آنکھیں سورج سے زیادہ گہری لو دے رہی تھی۔اس کا یہ پُر جوش انداز دیکھنے کے لیے کوئی بھی انسان گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہ سکتا تھا۔

"ہیلو مسٹر! آپ کیا کر رہے ہیں یہاں......؟" اس نے بے طرح خوشی کے احساس کو ضبط کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر استفہامیہ پوچھا تھا۔

جواب میں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فرنٹ ڈور وا کر دیا۔زبان سے کچھ نہیں کہا۔وہ اس کو گھورتی ہوئی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ڈور بند کرتے ہوئے وہ اپنی سیٹ کی طرف آیا۔

"تم پاگل ہو۔گاڑی میں بیٹھ سکتے تھے۔اس قدر کڑکتی دھوپ میں سَن باتھ لینے کا مشورہ کس پاگل نے دیا تھا؟" وہ چہکتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

گاڑی میں ائیر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ٹھنڈک کے احساس سے اس کی اندر تک راحت سرائیت کر گئی تھی۔وہ اس کی بات سن کر دھیما سا مسکرایا تھا۔سیاہ سن گلاسز سے اس کی داستان کہتی آنکھیں چھپی ہوئی تھیں۔

"اس پاگل نے کہا تھا۔" اس نے انگلی اُٹھا کر دل کے مقام پر رکھ دی تھی۔

پریشے کے منہ سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔اور اس نے ایک مکا اس کے کندھے پر رسید کیا تھا۔

"واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز......فائق ذوالفقار! کب آئے ہو لاہور سے بتائے بغیر؟" وہ خوشگوار موڈ میں آ گئی تھی۔اس کی ترنگ ہی نرالی ہو گئی تھی۔فائق ذوالفقار اس کے لیے کیا تھا۔اس کی ترجمانی الفاظ نہیں کر سکتے تھے۔اسے سامنے پا کر اس کی خوشی کا گراف آسمان چھونے کو آ جاتا تھا۔

"بتا کر آتا تو تمہارے چہرے کی یہ خوشی کیسے دیکھ پاتا۔ابھی ابھی آیا ہوں۔" فائق ذوالفقار نے ایک لُک دیتے ہوئے لطف اندوز لہجے میں اسے بتایا تھا۔پریشے دنگ رہ گئی۔

"تم گھر نہیں گئے؟"

"اونہوں!" لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

"مائی گاڈ!" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔"پاگل آدمی......مجھے لگا تم امی کو بتا کر آئے ہو گے کہ مجھے پک کرنے جا رہے ہو۔"

"یہ امی کو بتانا ضروری تھا؟" اس نے چڑانے والے انداز میں کہا۔پریشے مرعوب ہوئے بغیر بولی۔

"میں تو جیسے ان سے چھپا لوں گی نا۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔ان دونوں کا تعلق چھپا ہوا نہیں تھا۔یہ رشتہ کھلی کتاب کی طرح تھا۔ایسا شفاف کہ سطر بہ سطر، حرف حرف پڑھا جا سکتا۔

"اور یہ گاڑی......؟" اسے اچانک خیال آیا۔گاڑی جانے پہچانے راستوں کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔باہر چلچلاتی دھوپ تھی، اور اندر خوبناک سا ماحول۔چمکتی دھوپ اس وقت بری نہیں لگ رہی تھی۔وہ فائق

کے ساتھ اس تپتی دھوپ میں میلوں پیدل چل سکتی تھی۔
"میں نے خرید لی ہے۔" فائق نے رخ موڑ کر سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ جانتی تھی اس نے چند الفاظ منہ میں روکے ہیں..... چند پل وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک پیاری سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔
"ایک دن خرید لو گے۔ ان شاء اللہ وہ دن بھی آئے گا......" وہ حقیقت میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اسے اپنے اردگرد پسندیدہ انسان چاہیے تھے۔ وہ اس کی کمزوری تھے۔ بے جان چیزیں نہیں..... فائق نے اس کے متاثر نہ ہونے پر ایک قہقہہ لگایا تھا۔ جیسے داد دی۔ وہ کتنی الگ سی تھی۔ راز جان لینے والی۔ پرکھ لینے والی۔
"ہاں! تمہارے لیے ضرور خریدوں گا۔" وہ اتنا پیارا انسان تھا۔ اوپر سے اتنی پیاری باتیں کرتا تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ شاید وہ جذباتی پن کا شکار ہو جاتی۔ وہ کوئی اور لڑکی نہیں تھی، پریشے تھی۔ اس نے بڑے مان سے فائق کو دیکھا۔ پورے یقین سے سر ہلایا۔
"تمہیں میرے لیے گاڑی خریدنے کی ضرورت نہیں فائق......" اس نے حوصلے دینے والے مگر قطعی لہجے میں کہا۔ "میں اپنے لیے گاڑی خود خریدوں گی۔ جو جو پریشے کو ضرورت ہے نا، پریشے وہ اپنے لیے خود کر سکتی ہے..... مجھے اگر کچھ چاہیے ہوگا تو میں بھی تم سے نہیں کہوں گی۔ میں اپنے آپ میں اتنی قابل ہوں کہ ہر وہ چیز خود کو فراہم کر سکوں جس کے خواب دیکھتی ہوں۔ مجھے تم سے کیا چاہیے تم جانتے ہو ناں.....؟" اس نے دھیرے دھیرے اپنی بات اس کے گوش گزار کی تھی۔
فائق کے چہرے پر اس کی باتوں نے سنجیدگی طاری نہیں کی تھی۔ وہ ہنوز نما نما مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کی عادات سے واقف تھا۔ یہ عادات اس کے دل میں پریشے کی عزت، خودداری، اس کا مقام اور محبت میں بے پناہ اضافہ کرتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کسی معمولی لڑکی کا ساتھ نہیں میسر آیا تھا۔
"میں ہر پل دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں فائق کو ہر وہ کامیابی نصیب ہو، جس کا وہ تمنائی ہے۔ تم ہر وہ چیز خریدو جس میں تمہاری خوشی ہے۔ کیونکہ تم پر سب سے پہلا حق تمہارا ہے۔ میرا نہیں۔ اور میں جانتی ہوں بہت جلد یہ سب تمہارے پاس ہوگا۔"
اس نے لمحے بھر کا توقف لیا اور پلکیں اُٹھائیں۔
فائق ذوالفقار نے اس کی سمت نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اگلا جملہ کیا کہنے والی ہے۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔
"آخر کو بہت جلد تم "چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ" کہلانے والے ہو۔"
اس جملے کے ساتھ ہی دونوں کی ہنسی کے سُر گاڑی میں بکھر گئے تھے۔
پریشے اس انسان کو ایڈمائر کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ خاموشی اور شور کے ساتھی۔ دل، جذبے، غصے اور ہنسی کے ساتھی۔ کیفیات اور اشاروں کے ساتھی۔ دنیا میں کوئی اور نہیں تھا اس مقام پر، جس پر وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تھے۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے اچھے لگتے تھے۔ وہ دونوں لڑتے ہوئے بھی اچھے لگتے تھے۔ دونوں اپنی اپنی مثال آپ ہو کر بے مثال تھے۔
وہ گنگناتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سیٹ کر رہا تھا۔ پریشے کو گھر جانا تھا۔ وہ ضد کرنا چاہتی تھی۔ اسے ضد کرنا آتی تھی مگر اس سے کی نہیں گئی۔ یہ شخص دھوپ میں اس کے لیے کھڑا رہا تھا۔ یہ ملاقات اس قدر جلدی اختتام پذیر نہیں ہو سکتی تھی۔
یہ تو فائق ذوالفقار اور اس کی پریشے کی تعریف میں دکھائی گئی محض چھوٹی سی ایک جھلک تھی......!!

☆☆☆

آروپ میں صبح اپنے پیراہن میں تمام رنگوں کو سمو کر طلوع ہوتی تھی۔اس کی صبح وشاموں کا حسن جادوئی ہوا کرتا تھا۔اس کی گلیوں میں سرسراتی ہواؤں میں بوس ہو کر چلا کرتی تھی کہ بھورے پیال کے تمام تنکے ایک جگہ سے دوسری جگہ کروٹ بدلتے رہے۔اور درختوں کے زرد عمر رسیدہ پتے ایک لے میں اُوپر سے نیچے آگرتے۔

آروپ کی فضاؤں میں ٹھہراؤ تھا۔صبح کے پنکھ پیازی رنگ کے ہوتے تھے جس پر سورج زرد سفوف چھڑکنے میں وقت لیتا تھا۔اس سارے وقت میں یہ پیازی رنگ کے پنکھ فضاؤں میں ایک سحر ساطاری کیے رکھتے تھے۔

اس صبح آروپ کے علاقائی اسکول کا ایک منظر کھلتا چلا گیا۔اسکول کے احاطے میں ننھے منے بچے ایک قطار میں کھڑے قومی ترانہ پڑھ رہے تھے۔سب نے ایک جیسی یونیفارم اور صاف ستھرے جوتے پہن رکھے تھے۔ بال ایک ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔کچھ تیل میں چپڑے...... کچھ کی آنکھیں سرمے سے مزین۔مگر وہ سب بھرپور پیارے دکھتے تھے۔

اسکول کے اساتذہ تمام بچوں کے لائن میں ناخن چیک کرتے جارہے تھے۔اور انہیں کلاس میں بھیجتے جارہے تھے۔یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔بچے معمول کے انداز میں ایک ایک کر کے اندر جاتے رہے۔اس سب معمول میں ایک بچہ تھا۔جس کے انداز غیر معمولی تھے۔

وہ باقی تمام بچوں سے زیادہ صاف ستھرا اور ایک نظم وضبط کا پابند نظر آرہا تھا۔اس کی ایک ایک ادا میں فرماں برداری اور وضع داری نظر آرہی تھی۔اس کے بال ملائم سے یوں چمک رہے تھے جیسے وہ ڈائی کیے ہوئے ہوں۔یا اس پر کچھ لگایا گیا ہو۔

کچھ دیر میں وہ بچہ اپنا بستہ کھول کر کاپی نکالتا نظر آرہا تھا۔وہ سب زمین پر بچھے ٹاٹ پر بیٹھے تھے۔پھر اس نے بستے کی اُوپری زپ کھولی......اور کچی پنسل نکالی۔جہاں باقی بچے اپنی پنسل تراشنے لگے تھے۔وہیں اس کو اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔وہ پہلے سے تراشیدہ تھی۔اور اس کی نب نہایت خوب صورتی سے اُبھری ہوئی تھی۔

''چلو بچو! سب نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھنا ہے۔اپنی اپنی پسندیدہ شخصیت پر......'' کلاس روم میں چاک سے تختہ سیاہ پر لکھتی استانی نے سب کو متوجہ کر کے حکم دیا تھا۔تختہ سیاہ پر انہوں نے چاک سے عنوان ''میری پسندیدہ شخصیت'' تحریر کر دیا تھا۔بچے مستعدی سے کاپی کے صفحے پلٹنے لگے۔استانی بہانے بہانے سے ہاتھ اُٹھانے لگی تھی۔

''مس! کیا لکھنا ہے؟'' اس بچے نے ہاتھ کھڑا کر کے سوال پوچھا۔مس نے اپنے الفاظ دہرا دیے۔

''اپنے لفظوں میں اپنی پسندیدہ شخصیت......یعنی اس انسان کے بارے میں پانچ سطریں لکھنی ہیں جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔'' انہوں نے سادہ ترین لفظوں میں سمجھا دیا تھا۔

اس بچے کے چہرے پر بے پناہ رونق آگئی۔خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔باقی بچے سوچ بچار میں مبتلا تھے۔اور اِدھر اُدھر تا کا جھانکی میں مگن تھے۔لیکن ایک وہ بچہ تھا...... جو اپنی کاپی کو گود میں رکھے لکھنا بھی شروع کر چکا تھا۔

''میری پیاری ناشو ماں......!''

اس کے چہرے پر محبت کے اتنے رنگ اُتر آئے تھے کہ آروپ کی صبح وشام میں اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی تھیں۔محبت لفظ ہے لیکن......وہ کتنے رنگوں میں ڈھلتی ہو گی یہ اس معصوم سے بچے کے چہرے پر دیکھے جاسکتے تھے۔

کوئی دھنک، کوئی قوس وقزح، کوئی فطری رنگ، کوئی قدرتی نظارہ......اس آفاقی جذبے کا مقابلہ کرنے سے باز آیا۔

''میری ناشوماں میری پسندیدہ انسان ہیں۔ ان کا نام عائشہ ہے۔ لوگ انہیں عاشو کہتے ہیں......مگر وہ صرف میری ناشوماں ہیں۔ مجھے ان کی صورت سے دنیا نظر آتی ہے۔ وہ کبھی میری طرف پیٹھ دے کر نہیں سوتیں۔ کیونکہ وہ میری طرف دیکھتی رہیں تو مجھے سانس آتی رہتی ہے۔

دنیا میں کوئی ان کے جیسا نہیں ہے......دنیا میں کوئی میری ناشوماں جیسا نہیں ہوسکتا۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کے بعد بھی کچھ آتا ہے تو میں وہ سب کرتا ہوں......میں آسمان سے گرا تھا اور انہوں نے مجھے اپنا دوپٹا پھیلا کر کیچ کرلیا تھا......یہی ناشوماں کہتی ہیں......''

وہ تیز تیز لکھتا کاپی کا صفحہ بھر چکا تھا۔ استانی نے اس کی رفتار دیکھی تو کاپی اس سے لے لی۔ پھر اس پر لکھا متن پڑھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ انہوں نے یہ سطریں بار بار پڑھیں اور اس بچے کی عمر دیکھی۔

محبت عمر، تجربے، عقل و دانش سے مبرا ہوتی ہے۔ محبت زبان نہیں احساس ہے۔ سمجھ نہ آئے، دکھائی نہ دے۔ خون میں سماجاتی ہے۔ رگوں میں دوڑتی ہے اور زندگی بن جاتی ہے۔

''یہ ناشوماں کون ہے؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''میری ناشوماں......میری اماں!'' وہ جھکی نظروں اور جھکے سر کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

''ماں ہیں آپ کی؟''

مس کے دلچسپی سے پوچھنے پر وہ تیز تیز سر ہلانے لگا۔

''پر میں نے تو کسی تاریخی شخصیت پر مضمون لکھنے کو کہا تھا۔'' وہ آج ہنس رہی تھیں۔ وہ غصہ نہیں کررہی تھیں۔ ڈر کے مارے دل دھڑک رہے تھے۔

''مجھے بس ناشوماں ہی پسند ہیں......'' بچے نے انتہائی سادگی سے بتایا۔ جیسے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ اس کے گالوں کے گڑھے واضح ہوئے۔

''اچھا ناشوماں کے علاوہ کیا پسند ہے؟'' وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔ انہیں اس پر پیار آرہا تھا۔

''بس ناشوماں......'' اس نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے میں نے مان لیا۔ مگر ہمیں ایک سے زیادہ چیزیں پسند ہوتی ہیں ناں؟''

''سب سے پہلے ناشوماں......'' اس نے ایک بار پھر تسلی دی۔ خود کو بھی۔ اور مس کو بھی۔

''اس کے بعد......طائر!''

''طائر یعنی پرندے......کون سا پرندہ عکرمہ؟''

عکرمہ نے پہلی بار نگاہیں اُٹھائیں۔ اس کی آنکھیں بہت پیاری تھیں۔ ان کا رنگ بے حد جدا تھا۔ آروپ کے تمام بچوں سے مختلف اور منفرد......!

''Parrots......گرین طوطے!!''

وہ پہلی بار مسکرادیا تھا۔ اس کو سبز طوطے پسند تھے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سبز تھا۔ محبت کا اگر کوئی رنگ ہوتا تو یہی سبز......محبت اسی رنگ میں ڈھلنا پسند کرتی۔

سبز طوطوں جیسا......عکرمہ کی آنکھوں جیسا......ناشوماں سے محبت جیسا سرسبز......!!

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی

لاڈ پیار کے بھوت

باہر سیڑھیوں پہ بیٹھی ثانیہ مسلسل کام والی ماسی سے لڑ رہی تھی کہ تم نے ایسے کیوں نہ کیا ویسے کیوں نہیں کرلیتیں۔

پندرہ سالہ ثانیہ نے لحاظ کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ لاڈلی ہے اور لاڈلی رہے گی لاڈ اٹھانے والے موجود جو تھے۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے امی اور ابو کو وہ بے حد عزیز تھی مگر اس کی یہ ایک بات امی کو مسلسل پریشان رکھتی تھی کہ وہ بات کرنے سے پہلے سوچتی ہی نہیں تھی۔ کام والی ماسی ہو یا کوئی دوسرا ہمسایہ رشتہ دار وہ بول دینے سے ذرا نہیں گھبراتی تھی۔ پرسوں ہی دیوار پار ہمسائی جو ثانیہ کی امی کی عمر کی تھیں انہیں ثانیہ نے بغیر رکے وہ وہ باتیں سنائیں کہ خود امی بھی ڈر گئیں کہ آگے کیا ہوگا؟ اسے کوئی بھی اچھا نہیں لگتا تھا چاہے وہ کوئی بڑا ہی کیوں نہ ہو۔

ہمسائی کو اس زبان درازی کا غصہ تو بہت تھا مگر ثانی کی ماں کی وجہ سے چپ ہو گئیں ورنہ فساد بڑھانے میں ثانی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور ثانی سمجھی کہ وہ دلیر ہی اتنی ہے کہ سب اس سے ڈر جاتے ہیں۔

امی نے ثانی کو بلا کر سمجھانا چاہا تو وہ امی کو بھی منہ بنا کر دیکھنے لگی۔ پھر بھی امی نے اسے سمجھایا تھا کہ بڑوں کو جواب نہیں دیتے مگر اس نے سنا ہی نہیں اور چلی گئی۔

اس وقت بھی ماسی کے ساتھ ثانیہ کا رویہ بے حد برا تھا جب امی نے ٹوکنا چاہا تو بدتمیزی سے کہنے لگی۔

"آپ ایک کام والی غریب ملازمہ کی وجہ سے مجھ سے لڑ رہی ہیں۔"

امی نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بے شک وہ کام والی ہے مگر تم سے بڑی ہیں تم اسے اس طرح نہ سناؤ۔"

مگر ثانی نے امی کی ایک نہیں سنی اور بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

☆☆☆

چند سالوں بعد ثانی بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی ثانی امی کے لاکھ سمجھانے کے باوجود ویسی کی ویسی ہی تھی۔

"وہ بلال اپنے شوہر کے لیے چائے بنا رہی تھی جب اس کی ساس اندر آئیں اور کہا کہ "ثانی" بیٹا، چائے میں چینی بہت کم ڈالنا، بلال کو زیادہ چینی پسند نہیں۔"

ثانی نے سنی ان سنی کر دی اور دو بڑے چمچے بھر کر چینی ڈال دی۔

ساس ہکا بکا رہ گئیں انہوں نے جا کر بلال کو اس کی شکایت لگا دی۔

جب بلال نے پوچھا تو ثانی نے ترخ کر جواب دیا۔

"میری مرضی میں جتنی چینی ڈالوں۔ یہ کون ہوتی ہیں مجھے روکنے والی۔"

بلال غصے سے اٹھا اور چناخ ایک تھپڑ ثانی کے منہ پر دے مارا اور چائے بھی پھینک دی۔ گاڑھی چائے سے سامنے والی دیوار داغ دار ہو گئی تھی۔

"یہ تمیز سکھائی ہے تمہاری ماں نے تمہیں! بڑوں کو تم کہہ رہی ہو۔ تمہاری ماں بھی ایسی ہی جاہل ہوں گی۔ اپنی بے شرم بیٹی ہمارے متھے مار دی۔ دفع ہو جاؤ، اب نظر نہ آنا مجھے۔"

ثانی ساری رات روئی مگر بلال نے پوچھا تک

نہیں نہ ہی ساس منانے آئیں اسے۔ یہ اس کا میکہ نہیں تھا جہاں اس کے مان جانے تک ہر کوئی آگے پیچھے پھرتا۔ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے کس طرح بول رہی ہے۔

پھر بلال کے کہنے پر اس نے اپنی ساس سے معذرت کرلی تھی۔

''میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔''

''پھر بڑوں کو تم کہہ رہی ہو، جاہل عورت، پتا نہیں ہے تمہیں کہ بڑوں کو آپ کہتے ہیں۔''

ثانی نے لاچار ہو کر آپ کہہ کر جان چھڑوائی تھی۔

ایک دن جب وہ پیاز براؤن کر رہی تھی پیاز جلنے والی تھی ساس نے کہا کہ چولہا فوراً بند دو اور ثانی نے چولہا بند نہیں کیا۔ پیاز جل گئی پتیلی بھی کالی ہو گئی تھی۔ تب ساس نے آگے بڑھ کر اسے خوب اچھی طرح سنائیں۔ اس کی ماں کو بھی برا بھلا کہا کہ انہوں نے کوئی تربیت نہیں کی بیٹی کی۔

ثانی حیران کھڑی تھی بلال نے اپنی ماں سے کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆

بہت سارے دن گزر گئے تھے وہ سیکھ رہی تھی وہ باتیں تھپڑ اور گالیاں کھا کر جو امی بڑے پیار سے سمجھانا چاہتی تھیں مگر اس نے سمجھی ہی نہیں تھیں۔

بڑے کمرے میں سب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ہی بجلی چلی گئی تھی باہر بارش برس کر موسم کو پراسرار بنا رہی تھی۔ تب ساس اماں نے اپنے بچپن کا کوئی قصہ سنانا شروع کر دیا تھا۔ بلال اور بلال کا چھوٹا بھائی طلال بھی سن رہا تھا۔ ثانی کو ان کی بے کار باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ چادر سے منہ نکال کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اماں! تم سے کہا کس نے ہے کہ تم ہمیں اپنا بچپن سناؤ، فضول ہی سر کھالیا ہے۔''

بلال کو بہت غصہ آیا، اس کا ہاتھ بھی اٹھنے کو ہی تھا۔ مگر طلال کو غصے کے ساتھ ساتھ طیش بھی آ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ ثانی کو ایسی سنائیں کہ اسے ہوش سا آ گیا تھا۔

''تمہاری بیوی کی ہمت کیسے ہوئی کہ میری ماں کے ساتھ ایسے بولے۔''

بھائی کے اتنا سنانے کے باوجود بلال کچھ نہیں بولا۔

طلال بھائی سے ناراض ہو گیا کہ بھائی نے بیوی کو کچھ کہا کیوں نہیں۔ مگر طلال کو نہیں پتا تھا کہ اس رات سوجے منہ کے ساتھ ثانی نے تمیز سیکھ لی تھی مجبوری میں ہی سہی۔'' ☆☆

أمِ طیفور

گنوا کر دل و جاں ہم

حسنات راؤ اٹھارہ سال بعد پاکستان پہنچ جاتا ہے۔

توانائی کی کمی سنہری کے جادو کی تاثیر پر اثر انداز ہوئی تھی۔ جب جادو مکمل نہ ہوتا تو اس کا اثر کم ہوتے ہوتے الٹا پڑنے لگتا۔ اسے جب غصہ آتا تو وہ بیس پچیس سے قید شخص کو تکلیف پہنچا کر تسکین حاصل کرتی تھی۔

شہروز ناکامی کے بعد لائبہ کے گھر پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے زمن سے ملنا ہے۔ کیونکہ لائبہ نے ہی اسے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ زمن آج اپنی جاب پر گئی ہے۔ وہاں مہریار کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

فائزہ خاکوانی اسے طعنہ دیتی ہیں کہ زمن کو حویلی لکھاں لے جانے سے پہلے وہاں سے اپنا تعلق واضح کرلو۔

فائزہ خاکوانی شہروز کے جانے کے بعد لائبہ سے ناراض ہوتی ہیں کہ ان کی بیٹی نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ لائبہ ان کو مناتی ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی وہ بس اس فائزہ خاکوانی کو ان کے بیٹے سے ملوانا چاہتی تھی۔

مہریار زِل سے نکاح کر کے اسے "حیات ولا" لے آتا ہے۔ زِل شہریار، زارون، یاور اور داور کو مہریار کے بیٹے سمجھتی ہے۔

حسنات راؤ پاکستان پہنچ کر ہاسپٹل جاتا ہے جہاں اس کی پری تھی۔ ہاجراں حسنات راؤ کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہیں۔

پچیسویں قسط

اک سجن ہونداسی
زہراں وچ پتاسے ورگا
سرے سک دنداسے ورگا
دکھاں وچ دلاسے ورگا
سجرے چن دے ہاسے ورگا
اک سجن ہونداسی
الھڑ شوخ ہواواں ورگا
دھپاں دے وچ چھاواں ورگا
اوکھے ویلے بانہواں ورگا
اٹھے پہر دعاواں ورگا

اِک سجن ہونداسی
تکھا تیز شراباں ورگا
رنگ تے روپ نواباں ورگا
سچا پھل گلاباں ورگا
پچھلی رات دے خاباں ورگا
اِک سجن ہونداسی
مٹھیاں مٹھیاں باتاں ورگا
چیت دسا کھوراتاں ورگا
پیاردیاں سوغاتاں ورگا
عیداں تے شبراتاں ورگا

اِک سجن ہوندا سی
پھکن چیت بہاراں ورگا
انب تے سیب اناراں ورگا
صاحب تے سرکاراں ورگا
ہفتے تے اتواراں ورگا
اِک سجن ہوندا سی
مکھن دُدھ ملائیاں ورگا
ٹانگر گچک خطائیاں ورگا
برفی، کھنڈ مٹھائیاں ورگا
"ارشاد سندھو"

اگر کوئی کہتا کہ کائنات فنا ہو چکی ہے اور روز محشر قائم ہو گیا ہے تو وہ یقین کرتی کیونکہ اس نے اس سے اپنے پورے وجود کو پرخچوں میں تبدیل ہوتے محسوس کیا تھا۔ اس کا دل جیسے سینے میں ہی پھٹ گیا تھا اور خون پسلیوں سے قطرہ قطرہ رستا اس کی جلد کو رنگین کر رہا تھا۔ ہر مسام ایک آتش فشاں بن گیا تھا اور ہر رواں لپٹیں مار رہا تھا۔ وہ شاید دوزخ میں پھینکی جا چکی تھی۔ اس کا جسم آگ کے شعلوں میں لپٹ لپٹ جا رہا تھا۔ لیکن اسے کیوں پھینک دیا گیا تھا؟ وہ تو اہل نہیں تھی نا۔ وہ تو ستائی گئی تھی، تڑپائی گئی تھی، رلائی گئی تھی اور اب بنا مداوے کے جہنم میں جھونک دی گئی!

آج تک جس برزخ میں وہ جی رہی تھی اس کا اختتام بھی ہولناک ہوا تھا۔ اذیتیں اسی کے حصے میں چن دی گئی تھیں۔ وہ بھٹی کے الاؤ میں دہکا دی گئی اور اس کی ہڈیوں کا سرمہ بالن بن گیا تھا۔ آخر کار اس کے سامنے "حسنات" آ گیا تھا! یہی وہ پل تھا اور یہی وہ گھڑیاں تھیں جن کا تصور بھی اسے جان کنی کی تکلیف میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ فضا یکدم سوگوار ہو گئی تھی۔ ماحول نے سوگ کی چادر اوڑھی تو ٹھنڈک میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کے قدم اگر زمین نے جکڑ لیے تھے تو مقابل بھی وقت کی گرفت میں تھا۔ اس کے سامنے حسنات راؤ یک ٹک اسے دیکھتا ساکت کھڑا تھا۔

حسنات کے لیے یہ اٹھارہ سال کی دوری اچانک اس ایک لمحے میں سینے پہ ہفت آسمان سا بوجھ بن کر اتر آئی۔ کاریڈور کے دوسرے سرے پہ کھڑی وہی عورت اسی وقار اور خاموش درد میں لپٹی ہوئی تھی، جسے وہ بھی سوچے سمجھے بغیر ٹھکرا بیٹھا تھا۔ حسنات کی نظروں نے وہ زمین تلاشی جہاں انہیں گڑنے میں دقت نہ ہو کیونکہ سامنے کھڑی حرماں نصیب عورت کا سامنا کرنا اس سے زیادہ محال لگ رہا تھا جتنا وہ ان اٹھارہ سالوں میں تصور کرتا آیا تھا۔ وہ بے قصور تھی اور یہ سچ اس کے اندر کانٹے کی طرح چبھتا رہا تھا۔

اردگرد پھیلی خاموشی میں ایک عجیب لرزہ تھا، جیسے دونوں کا دل اپنے اپنے انداز میں ٹوٹنے کی آواز سنا رہا ہو۔ وہ چاہ کر بھی بول نہیں پا رہا تھا اسے ڈر تھا کہ اس کی پہلی آواز ہی اعتراف جرم بن جائے گی۔

اٹھارہ سال بعد وہ آمنے سامنے تھے، مگر درمیان میں پچھتاوے، زخم اور ان کہے لفظوں کی ایک پوری عمر کھڑی تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ کبھی اپنی پری کے قریب آتے زمانے بھر کی جھجک اس کے قدموں سے لپٹ جائے گی۔ وہ پری جس کے آس پاس رہنے سے وہ بے انتہا سکون محسوس کرتا تھا ایسا سکون جیسے کسی گناہ گار کو جنت مل گئی ہو۔ اسے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا بس اپنے قریب اس کی موجودگی کا احساس اس کے وجود میں نفرت پیدا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسے لگتا ہے کہ پری اس کے اندر موجود ہر منفی جذبے کا اینٹی ڈاٹ ہے جو اس سے بس محبت کروائی تھی۔ اور پھر یوں ہوا کہ اس کا یہ تریاق اس کی اپنی بے احتیاطی سے غلط ہاتھوں میں چلا گیا اور نتیجے میں کتنی قیمتی زندگیوں کے کیسے بیش بہا سال بھسم ہو گئے!

وہ قدم بہ قدم اپنے اور خانم کے درمیان کا فاصلہ کم کرتا قریب آ رہا تھا اور خانم اتنے ہی قدم اس سے دور ہوتی وہی فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھی۔ دونوں کے اوپر گزرتی کیفیت لگ بھگ ایک سی تھی

کی کہانی سن رہا تھا۔ فضلو کے ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی اسی تیزی سے چلتی اسے رات کا قصہ بیان کر رہی تھی۔ وقفے وقفے سے خان کا بھینچی مسکراہٹ لیے چہرا یوں گل رنگ ہو رہا تھا جیسے رات اس کی بات پہ بنی ہوئی تھی۔ چولہے پہ توا چڑھا رکھا تھا جس پہ آٹا گوندھتے ہی فضلو پراٹھے ڈالنے والا تھا۔ اس کے ساتھ والے چولہے پہ فرائنگ پین رکھا تھا جو انڈوں کے لیے تھا۔ ساس پین میں پانی بھر کر اسے اگلے چولہے پہ دھرا تھا۔ سب تیار تھا بس باہر سے ناشتے کی آواز آنے کی دیر تھی۔

یہاں سے باہر کا منظر زیادہ کچھ مختلف نہیں تھا۔ ڈائننگ میں اس وقت چاروں موجود تھے اور سارا رات کا پھیلایا گند سمیٹنے سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ خرمستیاں کر رہے تھے۔

"تم دونوں ان کشنوں کے کور بدلو جلدی۔ کسی بھی وقت نئے مہمان یہاں تشریف لا سکتے ہیں۔ چلو اٹھو مردو!"

شہریار نے تہہ کیے کشن کوروں کا ڈھیر یاور اور داور کے اوپر پھینکا جو صوفے کے ریگزین کے داغ کپڑے پہ تھوک لگا کے صاف کر رہے تھے۔ زارون صوفے کے نیچے سے ہاتھ گھما گھما کے زمانے بھر کا کچرا نکال رہا تھا۔

"یہ کیا ذلالت ہے زارون۔ تمہیں آج ہی کھنڈروں میں گھسنا یاد آیا تھا!!" شہریار کے سارے طبق روشن ہو گئے تھے..... "ممی بھی نانی پیاری یا مہرو آ جاتے تو اتنا گند دیکھ کر ہم سب کا راشن پانی بند کر دیتے۔" چپسوں کے ریپر، بسکٹوں کے ریپر، سوڈے کے خالی ٹن، ٹافیاں، ببلو اور بھی نا جانے کیا الم غلم وہ نکال باہر کرتا جا رہا تھا۔

"وہ تو میں ہی بند کروا دوں گا۔ مجھے بس یہ بتاؤ کہ یہ سب کھایا کس نے ہے۔ یہ تو آدھے سے زیادہ میری الماری کا خزانہ ہے!" زارون اٹھ کر بیٹھا اب ان ریپرز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔

یاور اور داور کے کانوں میں جب زارون کی

اور دونوں کی زبان تالو سے جا لگی تھی۔ بس ان کی نظریں جیسے بنا ایک دوسرے کے نقوش اس طور پر چھان رہی تھیں کہ گزرے وقت نے جو تبدیلیاں پیدا کی تھیں آیا ان میں کہیں ایک دوسرے کا نشان باقی موجود تھا بھی یا نہیں۔ حسنات خود سے مختصر فاصلے پہ موجود خانم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بغور دیکھ کر جان چکا تھا کہ وہ اس وقت جس جسمانی اور جذباتی جھٹکے سے گزر رہی ہے اس کی لپیٹ میں آ کر وہ بے ہوش بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ آگے جو ہونے والا تھا وہ ہو کر رہتا تھا لیکن وہ کم از کم اپنے سامنے اپنی پری کو ریختہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے قدم تو تھم گئے لیکن خانم کے اوپر تکلیف اپنے آثار چھوڑتی اس طرح گزر رہی تھی جیسے بدن سے روح نکل رہی ہو۔ وہ یکدم لڑکھڑائی تھی۔ اس نے لہراتے جسم کے ساتھ سہارے کے لیے ہوا میں ہاتھ چلائے تھے۔ یکدم وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گری اور اس سے پہلے کہ اس کا گھومتا سر زمین سے ٹکراتا اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں سے ایک دھندلے عکس کو خود پہ جھکا پایا اور اپنے سر کو کسی نرم گرم چیز پہ دھرا محسوس کیا۔ وقت نے اٹھارہ سال بعد یہ منظر اس حال میں دہرایا تھا کہ دو جسم ایک جان حسنات اور خانم ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ خانم کا سر حسنات کے زانو پہ تھا اور حسنات کا ہاتھ خانم کے ٹھٹھرے گال پر۔ منظر سہانا بھی تھا اور پرانا بھی لیکن نہ احساسات وہ رہے تھے نہ جذبات اور نہ حالات۔ وقت بہت وسیع خلیج حائل کیے انہیں ادھورا چھوڑ گیا تھا!

☆☆☆

"حیات ولا" میں دن خلافِ معمول جلدی چڑھ گیا تھا۔ ایسی غضب کی چہل پہل تھی کہ اب سے پہلے ان در و دیوار نے یہ رونق نہ دیکھی تھی۔ کچن میں فضلو تیزی سے آٹا گوندھنے میں مصروف تھا۔ اس کے قریب خان کا دستر پہ چڑھا اس سے گزشتہ رات

باتیں پڑیں تو انہوں نے صوفے رگڑنے کی رفتار یکدم تیز کر دی تھی۔ زارون ان دونوں کی پشت دیکھ رہا تھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دونوں کو کالروں سے پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹا اور رگ پر لٹا کر خود آدھا آدھا دونوں پہ لیٹ گیا۔

"زارون! باز آ جا یار۔ یہ وقت ہے کوئی ان بے ہودگیوں کا۔ ابھی مہر لالہ اور ان کی زوجہ کمرے سے نکل آئیں گے تو پہلا امپریشن ہی برا پڑے گا!" شہریار نے خود ہی کشنوں کے کور بدلنے شروع کر دیے تھے۔ کور اتار کے چڑھاتے ہوئے وہ کسی سگھڑ خاتون کی طرح زارون سے بات کر رہا تھا۔

"پڑنے دے شہری۔ ان سے کہہ کہ میری ساری چیزیں واپس کریں ابھی کے ابھی ورنہ میں اسی طرح انہیں دبوچے رکھوں گا!"

"اٹھنے تو دے۔ اٹھیں گے تو دیں گے نا!" یاور نے داور کو لیٹے لیٹے آنکھ مارتے ہوئے زارون سے کہا۔

زارون نے صاف انکار کیا تو دونوں نے ہاتھ میں لپٹا تھنر میں بھگا کپڑا اپنے اوپر پھیلے زارون کے چہرے پہ دھر کر اسے جکڑ لیا۔ تھنر کی تیز بو نے زارون کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ اگلے ہی پل تینوں یہاں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ شہریار کشنوں کو باری باری کور چڑھاتے انہیں تاسف اور کوفت سے دیکھ رہا تھا۔ ان کو چھڑانے میں جتنا وقت برباد ہوتا اس نے بہتر سمجھا کہ لاؤنج کی حالت سدھار لے لیکن جب ان تینوں کا شور ہنگامے میں بدلنے لگا تو اس نے ایک دم الگ ہی شوشہ چھوڑا۔

"میں ساری رات سوچتا رہا ہوں کہ یہ اپنے لالہ ڈان نے ایسی نازک اندام پری جیسی لڑکی سے پہلی بات کیا کی ہوگی یارو!"

اتنا کہنا تھا اور بس چند سیکنڈ پہلے جو کمرا میں تھرتھلی مچی تھی وہ فنا ہی ہوگئی۔ تینوں چوکس ہو کر شہریار کے سامنے مؤدب اور شرمائے سے آ بیٹھے۔

"میرا خیال ہے مہر لالہ کا مزاج جتنا سوکھا سڑا سا ہے انہوں نے اپنی بیگم کو کہا ہو گا" بیگم ہر رشتہ نبھانے کے لیے جس شے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے دماغ، اور خوش قسمتی سے وہ نہ تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔ کیونکہ ہوتا تو میں دوسری بار ایک ہی کام نہ کرتا اور تم مجھ سے نکاح نہ کرتیں!"

زارون روکڈ اور باقی تینوں شاکڈ والی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ شہریار کو تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج کل یہ لڑکا کس کی صحبت میں تھا جو ایسے فی البدیہہ جواب دیتا تھا۔ ساتھ چپکے بیٹھے یاور نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لے کر مٹھیاں بھینچ کر اپنی کنپٹیوں پہ مسلیں۔ زارون نے بھنویں اچکاتے فخر سے سب کو دیکھا۔

"اور میرے خیال میں تو مہر لالہ جیسے بندے جو دکھنے میں سڑو اور نخریلے لگتے ہیں وہ جب کمرے میں جاتے ہیں تو اچانک کسی کے دروازہ کھول دینے پہ بیگم کے پاؤں دباتے پائے جاتے ہیں!" داور کا تجزیہ اس کے ڈراموں کا شوقین ہونے کا پتا دے رہا تھا۔

"بات اتنی غلط بھی نہیں کی تو نے شہزادے......" شہریار ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ "کمرے میں ہر بیگم، نادیہ ہوتی ہے اور ہر خاوند اس کے آگے پیچھے جھوم جھوم کر بول رہا ہوتا ہے۔ نیلی پری، پیلی پری کمرے میں بند ہے۔ مجھے نادیہ پسند ہے۔ نادیہ پسند ہے!"

شہریار نے کشن کے اتارے کور کے ساتھ ایکٹنگ کر کے دکھائی اور بس کمرا میں ڈیمو کا سیشن شروع ہو گیا۔ زارون، یاور اور داور تینوں کشنوں کے کور سروں پہ لیے کھڑے ہوئے اور ایک ہاتھ کمر پہ دوسرا ٹھوڑی پہ ٹکا کر ایک دائرے میں گھومتے شروع ہو گئے۔

"نادیہ۔ میری بلبل۔ میری بگو۔ میری سوہنی سوانی۔ نیلی پری۔ پیلی پری کمرے میں بند ہے۔ مجھے نادیہ پسند ہے، نادیہ پسند ہے۔ نادیہہہہ میری بلبل۔"

صبح کا وقت تھا اور "حیات ولا" میں یہ رونق کسی نسوانی وجود کے طفیل پہلی بار دیکھنے کو ملی تھی۔ اندر کچن میں فضلو اور خان نے بھی ایک دوسرے کی بازو میں بازو ڈال کر گول گھومتے شوق پورا کیا تھا۔

"نادیہ ہ ہ ہ۔ میری بلبل۔ میری بگو۔ میری سوہنی سوانی!"

باہر قہقہوں کا طوفان اٹھ رہا تھا اور اندر فضلو اور خان نے اپنی ہی محفل سجا رکھی تھی۔

☆☆☆

یہ کمرا "حیات ولا" کا وہ کمرا تھا جہاں کرفیو نافذ رہا کرتا تھا۔ کسی کو بھی بلاوجہ یا بلاضرورت اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے جب بھی کچھ چاہیے ہوتا تو پوری پلاننگ کے ساتھ چوری کی جاتی تھی اور آج اس کمرے میں ایک صنف نازک پورے استحقاق سے قابض تھی اور مہریار بنا ماتھے پہ شکن ڈالے اسے مکمل اسپیس دے رہا تھا۔ گو کہ رات سے اب تک میں وہ کم و بیش تین سے چار بار لڑ ہی چکے تھے اور لڑائی زمن نے کی تھی، مہریار نے تصفیے کی کوشش جاری رکھی تھی۔

وہ ابھی ابھی نہا کر واش روم سے نکلا تھا اور اب شیشے کے آگے کھڑا نفاست سے بال بنا رہا تھا۔ اس کے نکلتے ہی زمن شرلی کی طرح واش روم میں جا گھسی تھی اور واش روم سے پہلے جو ڈریسنگ روم تھا جہاں تمام وارڈروبز تھیں اسے بھی لاک کر لیا تھا۔ مہریار نے بال بناتے ہوئے ذہن پہ زور دیا کہ اسے الماری سے کچھ ضروری چاہیے تو نہیں، جب تسلی ہوگئی کہ اگر کچھ ایسا چاہیے بھی ہوا تو فی الوقت گزارا ہو جائے گا تو اطمینان سے بال بناتا بے اختیار مسکرانے لگا۔ کل سارے دن کی کلفت جیسے دور ہوگئی تھی۔ وہ خوش تھا یا نہیں لیکن مطمئن ضرور تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا حسنات چاچو پاکستان ہی نہیں اس کے ہاسپٹل بھی پہنچ چکے تھے اور دوسرا زمن اب محفوظ تھی اور اتنی پرسکون تھی کہ پورے حق سے اس سے لڑائی کر کے واش روم میں جا چکی تھی۔

وہ برش رکھتا قریبی کاؤچ پہ بیٹھا اور جرابیں پہننے لگا۔ کچھ دیر پہلے کا منظر یاد کرتے اسے ہنسی آنے لگی۔ وہ ہنستا کم تھا لیکن اس وقت دل کر رہا تھا کہ قہقہہ لگائے۔ وجہ اسے خود کو بھی معلوم نہیں تھی لیکن دل ہلکا پھلکا سا تھا۔ رات وہ سکون سے بیڈ پہ سو رہا تھا۔ کمفرٹر بھی برا بھلا اس کے اوپر پھیلا تھا جب کوئی شے پوری قوت سے اس کے بازو کے جوڑ پہ آ کر لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو دیکھا کہ زمن کے اوپر سے کمفرٹر ہٹا ہوا تھا اور اس نے نا جانے کروٹ بدلی تھی یا اپنی ٹانگ سے کمفرٹر ہی ہٹایا تھا نتیجے میں ایڑی اس کے بازو پہ دے ماری تھی۔ مہریار کا ایک منٹ کے لیے دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کے بیڈ پہ اسے اتنے اطمینان سے علاقہ بدر بھی کر رکھا تھا اور اوپر سے کس کے ایڑی بھی مار دی تھی۔ اس نے اپنے بازو سے بے حد قریب اس کے سفید سڈول اور انتہائی نفاست سے تراشے ناخنوں والا پیر دیکھا جس کی گلابی ایڑیاں کمفرٹر کی حدت کی وجہ سے مزید گلابی لگ رہی تھیں۔ وہ کتنے ہی پل اس کے پیر کو دیکھتا رہا۔ اس نے دل میں اقرار کیا کہ اس کے پیر بے حد خوب صورت تھے اتنے کہ نگاہ ہٹ ہٹ کے دوبارہ ٹھہر رہی تھی۔ مہریار نے نیم باز آنکھوں سے ایک بار پھر اس پیر کا جائزہ لیا، انگوٹھے سے تھام کر اونچا کیا اور اسے واپس زمن کے ایریا میں رکھا۔ کمرے میں اچھی خنکی تھی پھر بھی زمن کے ماتھے پہ ہلکا ہلکا پسینہ جھلک رہا تھا۔ وہ حیران ہوا کیونکہ اس کے حساب سے کمرے ٹھنڈا تھا۔ وہ اٹھا اور اے سی آن کرنے کے بجائے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ یکدم ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا اور سارے کمرے میں پھیلتا ماحول بدل گیا۔ وہ زمن کے قریب آیا اور احتیاط سے اس پہ کمفرٹر اوڑھا کر واپس اپنے بستر میں آ کر لیٹ گیا۔

اسی سوئی جاگی کیفیت میں رات بیت رہی تھی۔ تمام وقت یہی ڈر رہا تھا کہ ساتھ سویا جن جاگ نہ جائے اور اسے لینے کے دینے پڑیں۔

خواب میں ایسی ہی ٹاکیں ٹوئیاں مار رہا تھا کہ دوسری طرف سوئی زمن کی آنکھ کھلی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر ماحول کا ادراک کرنے کی کوشش کی۔ یاد آیا کہ رات کو وہ کہاں، کس حیثیت سے سوئی تھی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ابھی تو اپنے انجان جگہ پہ ہونے کی وجہ سے تھی لیکن جیسے ہی پہلو میں کافی فاصلے پہ مخالف جانب سر رکھے مہریار پہ نظر پڑی اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ اتنا بڑا بندہ اتنے بڑے سر ہاتھ پیروں والا اس کے قریب یوں شتر بے مہار لیٹا تھا۔ اس کی چیخ نے مہریار کے نیم سوئے اعصاب پہ ہتھوڑا برسایا تھا۔ مہریار نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ دل پر ہاتھ رکھے اسے گھورتی ہوئی زمن نظر آئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"آپ کا تکیہ صوفے پر رکھا تھا نا تو آپ بیڈ پر کیا کر رہے ہیں؟" اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پر نہیں آئی تھی۔

"اور میں تمہارے حکم کا غلام ہوں نا جیسے۔ تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ ہونہہ۔" وہ چڑ کر کہتا اپنا تکیہ منہ پر رکھ گیا۔ "زندگی عذاب ہوگئی ہے۔ سکون سے سونا بھی مشکل ہے۔" تکیے کے اندر سے واضح بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ساری رات کی بے آرامی کا شاخسانہ تھا

"آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟" وہ غصے سے کھول کر اس کی طرف بڑھی۔ "میری پوری زندگی الٹ پلٹ کر رہ گئی ہے اور آپ کو اپنی پرسکون نیند کی پڑی ہے!" اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچا۔

"اس الٹ پلٹ کو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں اور کوئی وقت نہیں تھا ملا.....!" مہریار نے دانت پیسے پھر ذرا نرمی سے کہا۔ "دیکھو زمن، تم یہ کھینچا تانی صبح کے لیے رکھ دو۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔ سیریسلی سارے دن کی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ ہے شدید۔" مہریار نے کروٹ بدل کر بازو آنکھوں پر رکھا۔ لیمپ جو زمن نے ابھی جلایا تھا اس کی روشنی تنگ کر رہی تھی۔

"میں بھی سو ہی رہی تھی۔ کیوں آئے آپ بیڈ پر؟" وہ اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"تو تمہیں لڑائی کرنی ہے۔ کمال ہے!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تمہیں لگتا ہے یہ ڈرامہ چل رہا ہے۔ تم بیڈ پر سوؤ گی اور میں جا کر صوفے پر رلتا رہوں گا۔ ہاں؟" ہلکی بھوری آنکھوں میں نیند کی وجہ سے گلابی ڈورے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تو میں ہی صوفے پر چلی جاتی ہوں۔" زمن سلگ کر کہتی اپنا تکیہ اٹھا رہی تھی۔ مہریار نے اٹھ کر اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچا۔ ان دونوں کے چہرے آمنے سامنے تھے۔

"یہاں پر ایسا کوئی فلمی سین نہیں ہونے والا۔ سمجھیں تم۔ چپ کر کے ادھر سو جاؤ۔ نہیں آتا تمہاری سائیڈ پر۔ اور خبردار اگر تم صوفے کی طرف گئیں۔ واپس ادھر اٹھا کر پٹخوں گا۔ آئی سمجھ؟ تو اب یہ تھرڈ کلاس ڈرامے چھوڑو اور چپ کر کے سو جاؤ۔"

ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑتے وہ کمفرٹر سر تک تانے کروٹ بدل گیا۔ زمن کچھ پل اسے گھورتی رہی پھر اسے دل میں جنگلی کے خطاب سے نوازتی تکیہ سیدھا کرتی سونے کی کوشش کرنے لگی۔ بہت مشکلوں سے رات کٹی تھی اور صبح مہریار حسب عادت جلدی اٹھ کر واش روم میں چلا گیا تھا جبکہ زمن بھی کچی پکی نیند کی وجہ سے کھٹکے سے ہی اٹھ گئی تھی اور جس وقت وہ باہر آیا تو اسے نظروں سے کچا چباتی ہوئی اپنے ہینڈ کیری سے جوڑا گھسیٹ کر نکالتی پہلے اس کی جانب مڑی اور انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔

"کان کھول کر سن لیں ڈاکٹر صاحب۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ نے یہ نکاح اپنی مرضی سے کیا ہے لہٰذا اگر آپ کے چاروں بچوں نے یا آپ کی پہلی بیگم نے میرے

ساتھ کوئی چینکی پینکی کی تو چھوڑوں گی میں بھی نہیں۔ اس لیے اپنی چاروں اولادوں کو سمجھا دیجیے گا۔ ایک تو مجھ سے بڑے آپ کے بچے ہیں اوپر سے مجھے بھی دھوکے سے رکھا۔ سوچا تھا دو دو فٹ کے بچے ہوں گے مگر یہاں پلاٹون ریڈی ہے یہاں۔ اللہ جانے ان کی والدہ محترمہ کے کیا حالات ہوں!"" اتنا کہتی وہ واش روم میں جا گھسی تھی لیکن غصہ اس قدر تھا کہ واش روم سے پہلے ڈریسنگ روم تھا، اس کا بھی دروازہ لاک کر دیا تھا۔ مہریار کھڑا دو لمحے تو اس کی باتیں سوچتا رہا اور پھر اپنے چاروں بچے اور ان کی نامعلوم والدہ یاد کی تو بے ساختہ ہنستا ہوا کاؤچ پہ گرنے کے انداز میں جا بیٹھا۔ یعنی کہ وہ یقینی طور پر یہی سمجھتی تھی کہ وہ شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ ہے۔ جو بات اس نے ازراہ مذاق کہی تھی وہ زمن ابھی بھولی ہی نہیں تھی!

مہریار نے شکر کیا تھا کہ اس کی ضرورت کی چیزیں ابھی باہر کمرے میں دستیاب تھیں ورنہ ڈریسنگ روم میں ہوتیں تو نا جانے کتنی دیر انتظار کرنا پڑتا۔ ابھی اسے باہر جا کر بھی عدالت بھگتنی تھی پھر ہاسپٹل جانا تھا جہاں یقیناً حسنات چاچو اور خانم چاچی کی ملاقات ہو چکی تھی۔ اس کے نتائج کیا نکلے تھے یہ وہ وہیں جا کر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال وہ چاہ رہا تھا کہ زمن نکل آئے تو اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر جائے۔ زمن کے سامنے باہر موجود چار عدد نمونے جانے میں رہنے کی کامیاب اداکاری کرتے اور باقی رہ گئیں نانی پیاری تو ان کو وہ ڈیل کر سکتا تھا!

☆☆☆

رات آئی تھی اور سنگ ریت کا طوفان لائی تھی۔ ایسا طوفانی بھنور جس میں سب مناظر چھپ گئے تھے بس واضح تھے تو دو وجود۔ ایک دوسرے سے نالاں تو دوسرا پہلے سے دور۔ اتنی خاک اڑی تھی کہ آنکھیں چھل گئی تھیں، ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا اور جسم کا رواں رواں پپڑی زدہ ہو گیا تھا۔

حسنات نے اپنے سامنے اپنی پری کو نہیں اس کی شبیہہ کو دیکھا تھا کیونکہ پری کا روپ تو اس کے پری زاد کے سنگ ابھرتا تھا، جب جدائی کا سیسہ چن دیا گیا تو سب رنگ روپ دھانی دھول میں چھپ گیا۔

میرا روپ وی گیا، میرا رنگ وی گیا
میتوں یار مناؤن دا ڈھنگ وی گیا آئے

بھلا دنیا کیا جانے کچھ چیزیں مشروط ہوا کرتی ہیں۔ روپ کو پیا سے نسبت ہوتی ہے، دونوں ایک دوسرے کے سنگ جڑے ہیں۔ پیا کھو جائے تو روپ قدر کھو دیتا ہے۔

وہ جس وقت دروازے سے اندر داخل ہوا تھا اس کا دل کہہ رہا تھا کہ سامنے پری موجود ہوگی۔ یہ اس کے دل کی سرسراہٹ تھی جو خانم کے دل کو چھو گئی تھی کہ وہ وہاں واقعی موجود تھی۔ وہ ابھی تمنا کر رہا تھا کہ ایک دوسرے کو نہارتے عمر بیت جائے اور آخری دیدار یار کی ہو جو پتلیوں میں ثبت ہو کر مٹی کی نذر ہو جائے۔ لیکن اس نے اپنی پری کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ وہ گھٹنوں کے بل آئی تو اس کے پیروں نے اسی لمحے حرکت کی تھی۔ دل نے سرزنش کی کہ ظالم وہ نا جانے کتنی بار یونہی گری ہوگی اور پھر سنبھلی ہوگی تم نہ بھی سنبھالو تو وہ راہ نکال ہی لے گی۔ لیکن وہ بھاگا تھا اور خانم کو مکمل گرنے سے پہلے ہی تھام لیا تھا۔ اس کا سر اپنے زانو پہ رکھتے ہوئے اس کے دل میں یہی خیال گزرا تھا کہ اچھی طرح اس چہرے کو دیکھ لے نا جانے منتے مناتے کتنا وقت بیت جائے اور اسے اپنی پری کا چہرہ تھامنے کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑے۔ شور کی آواز سن کر اسٹاف آ گیا تھا اور خانم کو روم میں منتقل کر دیا گیا۔ ساری رات حسنات اس کے قریب موجود رہا تھا اس کا ہاتھ تھامے کبھی آنکھوں سے لگاتا تو کبھی اپنے گالوں سے مس کرتا۔ وہ اس کے ہوش میں آنے تک اس کے چہرے کو حفظ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے نقوش نگاہوں میں جذب کرتا رہا تھا اور یونہی اسے تکتے وہ رات کو دن کے اجالے

میں مدغم ہوتے دیکھتا رہا۔
کیا کہوں گا میں اپنی بیٹیوں کو؟ میں تو ان کی ماں کے سامنے ہی بے بس ہو گیا ہوں بیٹیوں کا سامنا کیسے کروں گا۔

بے حد کٹھن مرحلہ تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور وہ منتظر رہا خانم کے ہوش میں آنے کا۔

جو ہونا ہے اب ہو جائے۔ وہ مجھ سے ناراض تھی تو جی بھر کے برا بھلا بولے۔ میں سنوں گا لیکن مجھے اس اذیت سے نکلنا ہے۔

اور پھر صبح کاذب کے ساتھ اس کے ہاتھ میں دبا خانم کا ہاتھ ہلکا سا کسمسایا تھا۔ حسنات کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہوا گیا۔ اس نے اپنی کمر کا خم سیدھا کیا اور ایک بھرپور سانس اندر کھینچا۔ دماغ میں تمام سوالوں کے جوابات کی ہانڈی ابلنے لگی جو اسے دینے تھے۔ اس کے حلق میں کچھ پھنسنے لگا تھا۔

خانم نے اپنی بوجھل آنکھوں پہ لرزیدہ گھنی پلکوں کی جھالر اٹھائی۔ ہلکی سی درز سے اس نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں حسنات پہ نگاہ ڈالی اور پھر نگاہیں چھت پہ گاڑ دیں۔ اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے سے پہلے کا منظر تازہ ہو گیا۔

ناممکن! یہ کیا ہو گیا تھا؟ اس نے کیا حقیقت دیکھی تھی یا سالوں سے جس کو خوابوں میں دیکھتی تھی تو کبھی جاگتے میں اپنے اردگرد چلتا پھرتا ہنستا بولتا دکھائی دیتا تھا وہی وہم اسے رات کے پچھلے پہر لاحق ہو گیا تھا۔ بھلا کوئی ایسے تو سامنے نہیں آجایا کرتا نا!

اسے یاد تھا کہ گزشتہ سالوں کی انگنت تکلیفوں میں اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کو جب جب بے بسی سے اردگرد گھمایا تھا ہمیشہ یہی خاموش چاہ کی تھی کہ کہیں سے حسنات سامنے آجائے۔ وہ دروازے کو دیکھتی تھی تو لگتا ابھی حسنات کا چہرہ نمودار ہو گا اور وہ اسے مسلسل دیکھتا اپنے جوتے اتارتا اندر داخل ہو گا اور کہے گا۔

"اوہو ہو۔ غصہ۔ واہ کتنی پیاری لگ رہی ہے میری پری!"

اور وہ ہمیشہ کی طرح منہ پھلا کر بیٹھی رہے گی جب تک کہ منا نہ لی جائے۔ کبھی کمرے میں چلتے پھرتے کا تصور دل نڈھال کر دیتا۔ کوئی ایک تکلیف تو نہیں تھی جو دل کو کاٹتی تھی یکے بعد دیگرے بس یادوں کی کند چھری تھی اور اس کا زخمی وجود!

اب وہی حسنات جب حقیقت میں اس کے سامنے تھا تو اسے دیکھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ یہی انسانی نفسیات ہے جب محبوب قریب نہ ہو تو تڑپ نہیں جاتی لیکن جب وہی شخص پاس آجائے تو پھر جی چاہتا ہے کہ اس سے منہ پھیر لے تاکہ اسے احساس ہو کہ اس کے بنا ہم پہ کیا بیتی ہے۔ ہماری بوٹی بوٹی ہڈی سے الگ ہو گئی۔ جدائی کی پس جسم کی رگوں میں خون کی جگہ دوڑنے لگی۔ بدن کے اندر ناسور نہیں بنے بلکہ سارا بدن خود ناسور کی طرح دہکنے لگا۔ یہ عشق کمبخت خود تو دو دھاری ہوتا ہے لیکن جس کو لگتا ہے اس کی دھار مار دیتا ہے۔ اب اندازہ لگا لو کہ دو دھاری کا کھنڈی کے ساتھ مقابلہ کیسا ٹکر کا ہوتا ہو گا کیونکہ مٹ جانے کا جنون دونوں طرف ہے اور ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کا مزا فنا کی لذت سے آشنا کرا دیتا ہے۔

اس نے آنکھیں واپس موند لی تھیں اور حسنات نے تھوک نگل کر گلا تر کرتے الفاظ جوڑنے شروع کیے لیکن وہ کہے کیا؟ اس کے سامنے جو عورت زرد رنگت اور کمزور جسم لیے لیٹی تھی یہ وہی تھی جس کو ایک کال پہ موت کی سزا سنا دی تھی اور آج جب سامنا ہوا تو لفظوں کو گوند لگ گئی تھی۔ اس نے خانم کی لرزتی پلکوں کو بے بسی سے دیکھا۔ وہ ہوش میں تھی لیکن اس سے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید کہنے کو اتنا بہت کچھ تھا کہ ان احساسات کو الفاظ کا جامہ چھوٹا پڑ جاتا اس لیے اسے یہی بہتر لگا کہ خاموش رہ کر سزا کا عمل شروع کرے۔ حسنات نے رنج زدہ مسکراہٹ سے اس کو دیکھا اور سوچا کہ وہ خود ہی کچھ کہے۔ لیکن وہ بھی کیا کہے۔ شروع کرے کہاں سے!!!!

وہ خانم کے اوپر ڈلے کمبل کو چھوتے ہوئے

اس سے ویسے ہی مخاطب ہوا جیسے اٹھارہ سالوں سے ہوتا آرہا تھا۔

"پری۔ میں نے سوچا تھا کہ جب میں تمہیں ملوں گا تو تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے تم سے ملنے کا ایسے انتظار کیا ہے جیسے قیدی رہائی کا کرتے ہیں۔ میں تمہیں ایسے دیکھوں گا جیسے صحرا کے بچے پہلی بار سمندر دیکھتے ہیں۔ جب ہم ملیں گے تو میں تمہیں ایسے گلے لگاؤں گا جیسے یہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور تم میری آخری پناہ گاہ ہو لیکن تمہارے اتنے پاس آ کر بھی میری شرمساری تمہیں پکارنے نہیں دے رہی۔ پری، میرے دل کی آواز سن لو اور مجھ سے بات کرلو۔ میرے اندر کی اس کثافت کو کم کر دو ورنہ زہر بن کر لہو کو نیلا کر دے گی۔ مجھے پکار لو پری، میرے اندر کا غبار تم سے زیادہ نہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اس میں خود کو ہی دکھائی نہیں دیتا!"

وہ اپنا دکھ لفظوں میں ڈھال ضرور رہا تھا لیکن وہ لفظ اس کے اندر ہی گرتے جا رہے تھے۔ خانم نے آنکھیں موند لی تھیں وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور شاید دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ اسے لگا کہ ابھی خانم کو اس جھٹکے سے سنبھلنے کے لیے وقت دینا ہوگا جو اتنے سال بعد اسے اپنے سامنے پا کر اس کے اعصاب کو لگا تھا۔ آ تو وہ گیا ہی تھا سو اب جو ہونا تھا اس کا سامنا بھی وہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر یہ طے تھا کہ اب وہ اپنی اور اپنی اولاد کی زندگیوں کو کوئی رخ دے کر رہے گا بھلے بہت سا وقت ہاتھ سے ریت کے ذروں کی مانند پھسل چکا تھا لیکن باقیات پہ اب ان سب کی بقا ٹھہری تھی!

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ پہلے اس کا ہاتھ خانم کے ہاتھ کو تھپتھپانے کے لیے اٹھا لیکن ٹھہر گیا پھر اس نے جھک کر اس کی صبیح پیشانی کو بوسہ دینا چاہا مگر جھجک آڑے آ گئی۔ وہ دل مسوستا سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

"میں اپنی بیٹی کو دیکھنے جا رہا ہوں جس کے لیے میں نے اپنا کبھی نہ پلٹنے کا فیصلہ بدل ڈالا اور واپس آ گیا۔ میں جانتا ہوں اس کو ملنے کا مرحلہ بھی ویسا ہی مشکل ترین ہو گیا جیسے تمہارا سامنا کرنا کٹھن تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے اپنے لیے نفرت نہیں ملے گی کیونکہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔"

خاموش ماحول میں چند لمحے بعد دروازہ مکمل کر بند ہونے کی آواز شامل ہوئی اور خانم کی بند آنکھوں سے آنسو ایک ایک کر کے کنپٹیوں کا رخ کرنے لگے۔

"ظالم آج بھی دل پہ انگارہ رکھ گیا۔ وہ واپس اپنی بیٹی کے لیے پلٹا ہے ورنہ میرے لیے اب بھی وہ کبھی نہ آتا۔ میری جھولی کے چھیدوں سے یہ وہم بھی چھن کر نکل گیا کہ شاید ذرا سی سہی، میں اہم ہوں!"

وہ خود سے مخاطب تھی اور آنکھوں کا پانی دل کا حزن بہا رہا تھا۔ اس کی روح پہ حسنات کا عام انداز میں کہا جملہ ہی برچھی بن کر کھب گیا تھا۔ اس کا دل تو غموں سے لبالب بھرا پیالہ تھا اس میں خوشی کا ایک لمحہ گرتا بھی تو اپنی جگہ نہیں بنا پاتا تھا۔ یا پھر اس کی طلب ختم ہو چکی تھی کیونکہ دیر سے آنے والی یا ملنے والی چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے مردے کے ماتھے پہ معافی کا بوسہ!

☆☆☆

وہ دونوں نو بجے کے آس پاس "حیات ولا" پہنچی تھیں۔ سارا راستہ رباب خان کے فون آتے رہے تھے۔ یہ لے لینا، یہ کر لینا ویسے دیکھ لینا ایسے رکھ لینا۔ ہدایات کا ایک پلندہ تھا اور فائزہ خاکوانی کی خندہ پیشانی۔ وہ رباب اور ہاجرہ دونوں کی پریشانی کا اندازہ کر سکتی تھیں اس لیے بغیر کسی بات کا برا منائے وہ رباب خان کو مکمل اور ایک ایک تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ہاجرہ کی جگہ اگر وہ خود ہوتیں تو اپنی بچی ہاتھوں ہاتھ کسی کے حوالے کبھی نہ کر پاتیں۔ یہ ہاجرہ کا ہی حوصلہ تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ زمن کے سسرال وہ اس انداز میں جائیں کہ لگے واقعی میکے سے

پورے اعزاز کے ساتھ ناشتا آیا ہے۔ گو کہ سب ہی جانتے تھے کہ یہ نکاح محض افراتفری کا شاخسانہ ہے اور ابھی باقاعدہ رسوم ورواج کے ساتھ شادی ہونا ہے لیکن پھر بھی انہوں نے کمی نہیں رکھی تھی۔ ان سے زیادہ لائبہ اچھے سے جانتی تھی کہ بہترین ناشتے کا سامان کہاں سے ملے گا۔ اس نے بہت طریقے سے مٹھائیاں اور بیکری آئٹمز پیک کروائے تھے ساتھ حلوہ پوری چنے اور سری پائے الگ سے ایک آئٹم تھی۔ کولڈ ڈرنکس کے کریٹ اور پائن ایپل اور کاک ٹیل فروٹ کے ٹن بھی شامل تھے۔

یہ سب سامان لے جانے کے لیے انہوں نے رائڈ بک کروائی تھی اور گھر زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا تھا وہ دونوں وقت پہ "حیات ولا" کے باہر موجود تھیں۔ فائزہ خاکوانی کو لائبہ نے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور خود پہلے اتر کر گیٹ کھلوانے کے لیے بیل دی۔ اسے کل والی حرکت کے لیے دل میں مسلسل ندامت محسوس ہو رہی تھی اس لیے بھی وہ لاشعوری طور پر زمن کے لیے پورے خلوص سے یہ سب کر رہی تھی۔ ساری رات نیند میں بھی وسوسے ڈراتے رہے تھے کہ خدانخواستہ اگر شہروز اپنی چال میں کامیاب ہو جاتا تو تمام عمر لائبہ بھی اس گلٹ سے نکل نہیں پاتی۔ ایک پل کا جذباتی پن کتنی زندگیاں نگل جاتا۔ زمن کس طرح ایک ناپسندیدہ شخص کے حوالے ہو جاتی وہ بھی لاعلمی میں۔ یہ سب سوچ سوچ کر وہ دکھی بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ وہ زمن کے لیے بہترین کرے!

گیٹ ابھی تک نہیں کھلا تھا اس لیے اس نے دوبارہ بیل دی اور ہاتھ ذرا لمبے وقت کے لیے بیل پہ رہنے دیا۔ اچانک ایسی زوردار دگڑ دگڑ کی آوازیں اٹھیں کہ لائبہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہوئی مبادا گیٹ ایک دم کھلے اور آنے والا اس سے آٹکرائے۔ گیٹ کھلا اور اس کے بیچ دو چہرے ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ شہریار اور زارون ایک دوسرے کی گردن میں بازو پھنسائے سامنے تھے۔ لائبہ ٹھٹکی۔ اس نے انہیں پہلے کہیں دیکھا تھا!!! فوراً سے پیشتر اسے یاد آیا کہ یہ دونوں کتوں والے "بے چارے" تھے۔ کتوں سے ڈر کر اس کے گھر ٹھہرے تھے۔ وہ ان دونوں کی شکل دیکھنے لگی۔ شہریار نے زارون کی گردن سے بازو نکال لیا لیکن زارون نے ایسا نہیں کیا۔ لائبہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ بات شروع کیسے کرے۔ آیا دونوں میں سے گھر کس کا ہے، میزبان کون ہے؟؟ بے ساختہ پوچھا۔

"آپ کون!"

"میں اس کے ماموں کا بیٹا۔" نگاہ شہریار پہ تھی اس لیے جواب بھی اس نے دیا لیکن بے تکا۔ لائبہ نے کوفت سے زارون کو دیکھا۔

"اور آپ کون؟"

"میں اس کی پھپھو کا بیٹا!" زارون کی زبان کون سا ایکسپائر تھی۔

"ارے بابا، آپ دونوں کون؟"

"ہم دونوں مامے پھپھی کے بیٹے۔" شہریار نے مشینی انداز میں جواب دیا تو لائبہ کا دل کیا جوتا اتارے اور دونوں کو سنگھائے۔ نشے میں تھے یا ساری رات کے جاگے ہوئے تھے۔ کسی بات کا سیدھا جواب ہی نہیں تھا۔ اتنے میں فائزہ خاکوانی اتر کر قریب آگئیں۔ وہ دونوں فوراً مؤدب ہوئے۔

"بیٹے میرا نام فائزہ ہے اور یہ میری بیٹی ہے۔ ہمیں زمن کی فیملی سمجھیں۔ اس کا ناشتا لائے ہیں۔ کیا اندر آنے کی اجازت ہے؟"

انہوں نے سبھاؤ سے کہا تو شہریار بے حد عزت واحترام سے انہیں زارون کے ہمراہ اندر روانہ کر کے خود لائبہ کے ساتھ سامان اتروانے لگا۔ اتنے میں مخالف سمت سے خان بھاگتا ہوا قریب آتا دکھائی دیا۔

"مافی شہری بابا۔ ام نسوار کا پتا کرنے گئی تی۔ بوت دن ہو گئیں ام نے نسوار کی شکل ہی نہیں دیکی۔ امارا دل دوپہر ہوتے ہی بیٹھ جاتی ہی۔ ام کو عادت ہے اس کمبخت کی۔ شہری بابا، تم ایس بی بی کو لے کر

اندر جاؤ ام سامان لاتی اے!"

"محترمہ، آپ اندر جائیں۔ ہمارا چوکیدار شاید کہیں گیا ہوا تھا وہ آ گیا ہے، سامان اندر لے آتا ہے۔"

"ارے ایسے کیسے۔ آپ ماسے کے بیٹے ہیں اور گھر ہوا پھوپھی کے بیٹے کا تو اصل میزبان تو وہی ہوئے نا پھر ایسے کیسے آپ کے حوالے کر کے اندر چلی جاؤں!"

لائبہ سر جھکائے مٹھائی کی ٹوکری نکال رہی تھی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی جو ہاف کلپ کیے بالوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ وہ دونوں اگر اسے زچ کر سکتے تھے تو جوابی وار اس کے پاس بھی تھا۔

"ہم دونوں کو ہی میزبان سمجھیں۔ وہ جو پھپھی کا بیٹا ہے نا وہ چڑیلس ادھر ہی ہوتا ہے۔ جان کو جونک بن کے چمٹا ہوا ہے اس لیے میزبان ہی سمجھیں۔ لیکن اصل میزبان یہ فقیر ہے!" شہریار نے زار ودن کی مٹی پلید کرنے کے بعد پھر عاجزی سے خود کو پیش کیا۔

"اوہ۔ فقیر۔ فقیروں کو بھی دیں گے۔ جو بچ جائے گا وہ آپ لے جایئے گا۔ کافی زیادہ سامان ہے۔ اور ذرا دور ہو کر کھڑے ہوں جناب۔ فقیر ہو کر سر پر کیوں چڑھے آتے ہیں!" لائبہ سیدھی ہوتی ہاتھوں میں سامان تھامے اسے نخوت سے دیکھتی بولی تو شہریار کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ لاجواب سا ہوتا ہوا منمنایا۔

"مذاق کیا تھا، آپ تو دل پہ ہی لے گئیں!"

جواباً لائبہ نے ہاتھوں میں پکڑا سامان پوری طاقت سے اس کے ہاتھوں میں دیا اور بولی۔

"میں نے بھی مذاق کیا ہے۔ آپ بھی دل پہ لے گئے۔ سامان اندر لے آئیں میں ذرا زمن سے ملوں جا کر۔"

وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی جبکہ شہریار اس کی پشت دیکھتا رہ گیا پھر ہاتھوں میں پکڑے سامان کو دیکھا تو ہوش آیا۔

"حرام ہے کہ کوئی ملاقات بھی اس لڑکی سے ایسی ہوئی ہو جب کتوں والی نہ ہوئی ہو!" وہ خود کلامی کرتا ہوا بولا اور خان کی طرف مڑا تو اسے سامنے دانت نکالتا پایا۔

"کیا دیکھ رہے ہو خان۔ اندر لے چلو سامان۔ تمہیں بھی وقت ضائع کرنے کا چسکا ہے۔ بتاؤں گا مہر لالہ کو کہ تم نسوار سے باز نہیں آئے۔"

خان آگے بڑھا اور سامان لے کر اندر جاتا ہوا اسے لقمہ دے گیا۔

"زنانی سے بزتی خود کراتی اے تم اور غصہ ام پہ نکالتی اے۔ اب ام نے کہا تا کہ لڑکی سے لمبا بات کرو تا کہ وہ کتے والی کر کے اندر چلا جائے۔"

خان نے بھی موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھاتے شیر یار کی مٹی پلید کی اور خود بھی اندر چلا گیا۔ شہریار کا دن یقیناً اچھا نہیں چڑھا تھا آج سارا دن درگت بنتے رہنے کا احتمال تھا۔

☆☆☆

حویلی لکھاں میں سحری کے وقت ہی ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ موسم بے حد خنک تھا اور آسمان پہ دھند چھائی تھی۔ پنڈوں کی کھلی فضا میں چھایا کہرا دیر تک ٹھہرتا تھا۔ حویلی اتنی سویرے اس لیے جاگ گئی تھی کیونکہ سنہری کو تمام رات نیند نہیں آئی تھی۔ عرصے بعد وہ اس قدر خوف زدہ تھی کہ ایک لمحے کو آنکھ نہیں لگ سکی تھی۔ کوٹھڑی سے واپسی پہ اس نے سارا طیش حویلی کے ملازموں پہ نکالا تھا اور جو کام ابھی نہیں کروانے تھے ان کو بھی آج ہی کھلوا دیا تھا۔ ایسے میں اسے اپنے گیلے کپڑے بدلنے میں دیر ہو گئی اور شام ہوتے اس کا پورا جسم بخار سے دہکنے لگا تھا۔ جسم کو چڑھا بخار سر پہ بھی چڑھ کر اسے بے حال کر گیا۔ چکراتے اور ڈولتے سر کے ساتھ وہ حویلی میں گھومتی رہی تھی۔ اپنے تخت پہ بیٹھ کر مخصوص جاپ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی جیسے اس کے جسم کو گرفت میں لے رہا تھا۔ اس کی سانسیں تھمنے لگیں تو اس نے یہ کام بھی چھوڑ کر باہر صحن کا رخ کیا اور یہی اس کی غلطی

تھی۔ جادو میں مسلسل ناکامی نے اسے کتنے ہی دن سے بیزار کررکھا تھا۔ اس کے منتر الٹے پڑرہے تھے۔ خون کے چھینٹے خود اس پہ آگرتے۔ جسم پہ آبلے اپنے ہی پڑ جاتے۔ داہنے باغیچے کے سامنے درختوں کے جھنڈ سے پرے ہنڈیا چڑھائی تھی وہ ابلنے کے بجائے پھٹ گئی تھی۔ اس کی ارغوانی تسبیح کے موٹے موٹے بیضوی دانے دہک کر کوئلہ بن جاتے اور خود ہی جیسے اس کے ہاتھوں کی جلد کو چپک کر چمٹ جاتے۔ جگہ جگہ اس کے ہاتھوں پہ سیاہ نشان بنتے جارہے تھے۔ آج کل میں اسے اس مسئلے کا حل نکالنا ہی تھا ورنہ رفتہ رفتہ یہ جادو اس کو ہی ہلاک کرسکتا تھا۔

وہ رات کی تاریکی میں صحن میں نکل آئی تھی۔

صبح کوٹھری میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد سے وہ اب تک جیسے اسی گفتگو کے زیر اثر تھی۔ اس کی باتیں کوئی پہلی بار اس کے دل کو لرزا نہیں رہی تھیں لیکن آج عجب سی اضافی کیفیت یہ تھی کہ رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے تھے۔ وہ صحن میں آنا نہیں چاہتی تھی لیکن اندر اتنی اکھاڑ پچھاڑ چل رہی تھی، دوسرا سر گھوم رہا تھا چرخی کی مانند اور اس کے حواس بھی نیم مختل تھے۔ اسے لگا کھلی فضا میں جا کر جاپ کرے تو شاید وہ بہتر ہو سکے۔ کتنے ہی دن ہو گئے تھے وہ تسلسل سے منتر نہیں کر پائی تھی۔ اسے اپنی طاقتوں کو مجتمع کرنے کی ضرورت تھی۔ جس نے اسے ڈرایا تھا اس وجود کو وہ سالوں سے جادو کے ذریعے ڈراتی آرہی تھی۔

جب جب کوئی نیا منتر پھونکا تھا پہلے اسی پہ کیا تھا۔ کبھی جاپ میں طغیانی ہوتی تو ساری رات کوٹھری سے کراہنے کی آوازیں آتی رہتیں، درد یا تڑپن جب برداشت سے باہر ہو جاتی تو یہ کراہنا چیخوں میں بھی بدل جاتا۔ کبھی ایسی آوازیں ابھرتیں جیسے اندر کوئی جنگلی جانور گھوم رہا ہو اور خود کو نوچتا ہو۔ کبھی سنہری مٹھی میں کوئی سفوف بھر کر اس پہ پھونکتی اور اسے سلاخوں سے اندر جھونک دیتی۔ ایکا ایکی وہاں آگ جل اٹھتی اور کوٹھری کی پرانی قیدی وہ بے بس جان حدت سے کراہتی رہتی۔ اسے بے حد تسکین اور مزا آتا تھا یہ سب کر کے۔ چوہدری قاسم نے ہزار بار کہا تھا کہ بس کر دے اب اور کتنے سال اس اندھے انتقام کے پیچھے جان جلائے گی لیکن سنہری کے جادو کو اس وجود کی عادت ہو چکی تھی۔ اسے اور کسی چیز کے لیے اس ناکارہ انسان کی طلب نہیں تھی لیکن وہ اس کا تختہ مشق تھا جس پر وہ اپنا ہر وار آزمائی تھی اور جب وہ کامیاب ہوتا تو اس کی شادمانی دیکھنے والی ہوتی۔ اس کے علاوہ وہ بھی جانتی تھی کہ کیڑے سے بدتر زندگی گزارنے والے سڑی گلی لاش جیسی یہ مخلوق اب اس کے کسی کام کی نہیں مگر وہ کیا کرتی چھوڑ دیتی تو سالوں سے بند یہ راز افشاء ہو جاتا اور اس کے لیے مسائل کھڑے ہو جاتے دوسرا جب جب وہ سوچتی تھی کہ اب بس کر دے مفت کا رولا اور شور۔ ایک زہر کی پڑیا دے کر ختم کرے تب تب اس کے اندر کا شیطان اسے اکسا دیتا اور کہتا۔

"ابھی ٹھہر اور تھوڑا اور مزا لے لے تاکہ جس وقت یہ مرے تو بھی اسے ایک واحد چہرہ جس کا یاد رہے وہ سنہری ہو۔ جس وقت اس کی گدلی بے رونق آنکھیں بند ہوں تو اس کی پتلیوں پہ اس کا عکس جم کر زخم بنا چکا ہو اور جس وقت وہ جان کنی کی کیفیت سے گزرے تو اس کی سانسیں بھی سنہری کی طاقت کے آگے سر خم کریں اور توبہ کریں کہ کاش سنہری کو تنبیہہ نہ کی ہوتی۔ اسے دھمکایا نہ ہوتا۔ اسے ڈرایا نہ ہوتا تو یہ سب نہ ہوا ہوتا۔ قبر میں اترنے سے پہلے اس کی لاچار روح سنہری کی طاقت کو تسلیم کرے اور دفن ہو جائے!"

ایسی لاانتہا ہی سوچیں سنہری کو جب جب آتیں تو وہ بے تحاشا گہرا مسکراتی جیسے یہ سب ہوتا وہ دیکھ رہی ہو اور کوٹھری کے اندر موجود اس خود رو جھاڑی جیسے وجود کی زندگی کے کچھ دنوں میں اضافہ ہو جاتا۔ لیکن اب جیسے اچانک سے کچھ وار الٹے ہونے کیا شروع ہوئے اس کی طاقت خارج ہونے لگی تھی۔ اس کے وار کا توڑ کسی نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہی سب باتوں نے اسے پہلے سے زیادہ زور و شور سے

عمل کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔
وہ باہر نکل آئی۔ ہر طرف دھند چھائی تھی اور وہ صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایک ساتھ کتنے ہی سانس اس نے اندر کھینچ کر خارج کیے اور پھر اچانک اس نے اپنی زبان کو باہر نکال دیا۔ اس کی سانپ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اس کی لمبی لال زبان باہر کو لٹکتی منظر کو یکدم ہولناک کر گئیں۔ وہ اس قدر بدہیئت لگ رہی تھی کہ اس کا سایہ بھی گھبرا کر اسے چھوڑ جاتا۔ اس کی سرخ زبان اس کی ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔ وہ اپنے کلائی پہ بندھی ارغوانی موٹے بیضوی دانوں والی تسبیح کو کھول کر پھیرنے لگی۔ جوں جوں دانے گرنے لگے اس کے کھلے منہ اور لٹکی زبان کے پیچھے حلق سے عجیب و غریب آوازیں باہر آنے لگیں جو وہ دانستہ نکال رہی تھی جیسے کسی کو بلاتی ہو۔ اس عمل سے اس کے حلق کا کوا بھی لرز رہا تھا۔ ان آوازوں میں تیزی آنے لگی اور ارد گرد سرسراہٹیں بڑھنے لگیں۔
آسمان پہ پھیلی دھند اس کے چہرے کے گرد سے جیسے چھٹنے لگی اور یوں لگنے لگا کسی کو راستہ دیا جانے لگا ہے۔ سنہری کی چھوٹی چھوٹی سانپ سی آنکھیں سرخی دھارنے لگیں تو یکایک فضا میں الو کی مکروہ چنگھاڑتی آواز ابھری جو اس کے چہرے کے بالکل سیدھ میں آتی تھی لیکن کافی فاصلے پر تھی۔ سنہری نے مسلسل آوازیں نکالتے اپنی آنکھوں سے اس الو کو تلاشا جو دھند کے باعث واضح نہیں دکھ رہا تھا۔ چند ثانیے بعد اس نے دیکھا کہ ایک سیاہ الو لیکن ہر بار کی دفعہ سے قامت اور حجم میں بڑا اپنے انتہائی خوف ناک اور بڑے بڑے سیاہ پر پھیلائے تیزی سے نمودار ہوا اور اونچائی سے انتہائی سرعت کے ساتھ اس کے قریب آنے لگا۔ سنہری کی نگاہیں اسی پہ مرکوز تھیں اور ابھی اسے پلکیں بھی نہیں جھپکنی تھیں نہ ہی اپنے حلق کی آوازوں کا سلسلہ بند کرنا تھا۔ یہ عمل مستقل اور مسلسل بنیادوں پہ فائدہ دیتا تھا لمحے کی چوک سنہری کو بھاری پڑ سکتی تھی۔ ہر بار کامیابی سے کر جاتی تھی اور یہی توقع اسے اس بار بھی تھی مگر اچانک اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو پہلے ہی پھیل کر پھٹنے کو تھیں ان میں اس قدر خوف عود کر آیا جیسے ابل کر باہر گر پڑیں گی۔ جو سیاہ اور بڑے پروں والا الو تیز اس کی جانب تیزی سے نیچے کی طرف اتر رہا تھا اس کا چہرہ ہرگز الو کا نہیں تھا۔ اس کے اصل چہرے کی جگہ کسی انسان کا چہرہ تھا اور سنہری کو پہچان میں بھلا غلطی کیسے لگ سکتی تھی۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کی وجہ سے آج وہ یہاں اس وقت موجود تھی۔ کوٹھڑی میں بند یہ چہرہ الو کے دھڑ کے اوپر آن سمایا تھا اور انتہائی وحشت ناک تاثرات لیے سنہری کے قریب پہنچنے والا تھا۔ وہ بھی مسلسل آوازیں نکالتا فضا کو ہولناک بنا رہا تھا۔ سنہری کا سارا جسم اس سخت دھند اور سردی میں پسینے میں نہا گیا۔ ٹانگوں سے جان ختم ہوگئی اور حلق سے باہر لٹکتی زبان اپنی جگہ جم کر پتھر ہوگئی۔ عمل رک گیا اور اس کے حلق نے آوازوں کو جیسے جکڑ لیا۔ وہ الو کا چہرہ دیکھتے ہی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ اچانک الو نے اس کے قریب آتے محض چند فٹ کے فاصلے پر ہی اپنے پنجوں کا رخ اس کی جانب کر لیا جیسے اس کے چہرے پہ حملہ آور ہونے والا ہو۔ اگر سنہری ہمت نہ کرتی اور کسی طرح اپنے حواس مجتمع نہ کرتی تو صبح یہاں صحن میں بنا کھال کے چہرے والی سنہری کی لاش دیکھنے کو ملتی۔ الو نے قریب آتے اچانک اپنی کریہہ آواز نکالی اور سنہری نے کسی طرح خود کو بھگایا تاکہ برآمدے تک پہنچ جائے۔ ادھر وہ بھاگی اور ادھر الو جس کا چہرہ انسانی تھا اس کے پنجے فرش سے جا ٹکرائے اور وہ لڑھکتا ہوا کئی فرلانگ دور گھسٹتا ہوا گرا۔ سنہری کے لیے یہ ایسا خوف میں ڈوبا لمحہ تھا کہ اسے یقین ہو گیا تھا آج کی رات کا سورج اس کے نصیب میں نہیں۔ اس کا تمام خون خشک ہو گیا تھا۔ جسم اس قدر سرد ہوا کہ کپکپاہٹ تک جیسے جامد ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے الو کو دیکھ رہی تھی جو اب سیدھا ہو کر اپنے پر دوبارہ پھیلا رہا تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ اسے یہ اڑان اوپر فضا کی طرف

بھرتی تھی یا وہ دوبارہ سنہری کو دبوچنے کی کوشش کرے گا۔ دھند کے باوجود سنہری اسے دیکھ سکتی تھی اور وہ نیند میں تھی نا پگلا گئی تھی کہ اسے الو کے چہرے پہ کسی اور کا چہرہ دکھتا۔ وہ چہرہ اب بھی موجود تھا۔ سنہری نے اپنی پھڑ پھڑاتی زبان کو ہلایا اور کچھ پڑھ کر اپنی اسی ارغوانی مالا پہ پھونکا پھر اسے پوری طاقت سے اس الو کو دے مارا۔ ایک ہولناک اور کریہہ چیخ اس الو کے حلق سے نکلی اور سارے میں پھیلتی معدوم ہو گئی۔ وہ الو اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا پلٹ کر دوسری طرف چلنے لگا۔ پر پھیلا کر پیروں کے بل چلتا وہ عجیب وحشت انگیز دکھائی دیا اور پھر وہ زقند بھرتا اڑ گیا۔ دھند کی سفیدی نے اسے سمیٹ کر غائب کر دیا اور جیسے یکدم سارے صحن نے وحشت سکڑ سمٹ کر ایک طرف ہو بیٹھی۔ سنہری اس قدر ڈر چکی تھی کہ اس کے قدم اندر جانے کے لیے اٹھنے سے انکاری تھے۔

وہ کسی نا کسی طرح خود کو گھسیٹتی اندر راہداری تک پہنچی تو سامنے اپنے ہی کسی کام سے اٹھی نیند سے بھری آنکھیں لیے آتی زرینہ اسے دیکھ کر بری طرح گھبرائی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا پانی کا گلاس تھا جو گرتے گرتے بچا ورنہ اس خاموشی میں اسٹیل کے فرش سے ٹکرانے کی آواز مزید دہلا دیتی۔ اسے الجھن تو بہت ہوئی لیکن چار و ناچار وہ چلتی ہوئی اپنی مالکن کے قریب آئی۔

"وڈی چوہدرائن کچھ چاہیے آپ کو۔ اس ویلے آپ باہر کیا کر رہی ہیں جی۔ سب اندروں میں سوئے پڑے ہیں۔ بج چاہیے تو دسیں جی!" اس نے اپنے تئیں اسے واضح کر دیا کہ سب سو رہے ہیں تا کہ کوئی مشکل کام نہ بولے مگر سنہری نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

"اٹھا سب کو جا کے۔ بتیاں جلاؤ حویلی کی۔ باورچی خانے میں جاؤ اور چولہے گرم کرو۔ چائے پانی بناؤ۔ بس اٹھا دو سب کو، اٹھا چھوڑ دو۔ سو لیا آج سب نے جتنا سونا تھا!"

وہ کہتی ہوئی لاؤنج میں جا کر صوفے پہ دھڑام سے ڈھیلی ہو کر گری تو زرینہ روتے والی ہو گئی۔ نیند سے برا حال تھا اب کس کو اٹھاتی جا کے آدھی رات کو۔ سب ہی سارے دن کی مشقت کے بعد بمشکل سو پاتی تھیں۔ لیکن مرتی کیا نہ کرتی اگلے دس منٹ میں سب کی سب جاگ کر جمائیاں روکتی بلاوجہ حویلی کے چکر کاٹنے لگیں۔ کچن میں چائے کا پانی چڑھا دیا گیا اور تازہ آٹا گوندھنے کی تیاری شروع ہو گئی۔ آگے بتانا کیا تھا یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم تھا مگر چہل پہل ایسے شروع کروا دی تھی کام والیوں کی جیسے دن چڑھ چکا ہو۔ زرینہ باورچی خانے میں سبھی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سمجھا بجھا رہی تھی جن کی آنکھیں بھی نہیں کھل پا رہی تھیں اور گرم بستروں سے نکال دی گئی تھیں۔

"اچا ایویں تتیاں (غصہ کرنا) نا ہو سب کی سب۔ میں پچھ کے آتی ہوں کہ جگا تو دیا ہے چوہدرائن نے کرنا کیا ہے، بتانا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے پروہنے آنے ہوں اس لیے اٹھایا ہو!"

اتنا کہہ کر وہ ہال کمرے کی طرف چل دی اور وہاں جا کر جو منظر دیکھا اس نے دماغ کو سینندھ لگا دی۔ سنہری کسی سے لحاف منگوا کر بڑے کاؤچ پہ سکون سے سر تک تانے سو چکی تھی۔ اس کی پائنتی فرش پہ بنی بیٹھی تھی، مسکین صورت سوئی جاگی ڈولتی ہوئی!

زرینہ خاموشی سے واپس مڑی اور بنی کو بھی اشارہ کرتی کچن میں۔

"ساری بتیاں جلی رہنے دو۔ اور چولہے بند کر کے جا کے پڑ جاؤ بستروں میں۔ پانی کی موٹر نا بند کرنا تا کہ موٹر کے چلنے کی آواز آتی رہے۔ مجھے سمجھ لگ گئی ہے کہ چوہدرائن نے آج کوئی عمل کیا ہے جو اس پہ پٹھا پڑا ہے اور وہ ڈر گئی ہے۔ اپنا ڈر بھگانے کے لیے حویلی جگا دی ہے اس نے۔ اب خود سکون سے سو گئی ہے اس لیے تم سب بھی نیند پوری کروا پنی۔ یہ صبح تک نہیں اٹھنے والی۔ چلو شاوا ساری!"

اس کے کہنے کی دیر تھی سب ہی تتر بتر ہوتے

وہاں سے نکل بھاگیں۔ وہ اب سنہری سے ڈرنا بہت کم ہو چکی تھیں۔ اس کے سامنے جو گردن جھکی رہا کرتی تھی وہ خوف سے زیادہ اس کی بک بک سے جان چھڑانے کے لیے ہوتی تھی۔ سب وہاں سے جا چکی تھیں اور اب ہال میں لمبے چوڑے کاؤچ پہ لحاف تانے سوئے اکیلی سنہری کے خراٹے گونج رہے تھے!

☆☆☆

اچھی تربیت کا پہلا اصول صبر ہے اور جس میں صبر ہی نہ ہو وہ کبھی بھی قانع نہیں ہو سکتا۔ شہروز کی پیدائش جس کے بھی بطن سے ہوئی ہو اس کی تربیت ایسے ہاتھوں میں ہوئی تھی جنہوں نے اس میں ناانصافی کا کلس اتارا تھا۔ اس میں کم ظرفی کو پروان چڑھایا تھا۔ حق مارنا اور اپنا بھی چھین کر لینا سکھایا تھا۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ جو اس کا نہیں ہے وہ اسے کیسے مل سکتا ہے، اس کی سوچ کا دائرہ تو بس اس بات تک محدود تھا کہ جو اسے پسند ہے بس وہ اسی کا ہے۔ وہ جیتتا آیا تھا اس لیے اسی کا عادی تھا آج مات ہوئی تھی تو تکلیف جیسے نس نس میں شرارے کی طرح دوڑ رہی تھی۔ ساری رات اپنے آفس کے بند کمرے میں گزار دی تھی۔ گھر جاتا تو شاید خود کو ہی کچھ کر بیٹھتا اس لیے آفس چلا آیا تھا۔

گارڈ نے نصر کو فون کر کے بتا دیا تو وہ بھی پہنچ گیا تھا لیکن آفس لاکڈ ہونے کی وجہ سے وہ اندر نہیں جا سکا تھا اس لیے تمام رات اس نے بھی باہر کیبن میں بیٹھے گزار دی تھی۔ اندر وہ تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہو رہا تھا لیکن شہروز نے پہلی بار تھا کہ آفس کی چیزیں نہیں توڑی تھیں۔ وہ تمام رات ٹہل ٹہل کر ٹائلیں شل کرتا رہا تھا۔ سگریٹ پیتا تھا لیکن اتنی کثرت کبھی نہیں کی تھی جتنا اس رات میں دھواں سانسوں میں بھرا تھا۔ بیٹھتا بھی کیسے؟ بار بار نگاہوں کے سامنے اس چھ فٹے مرد کے ہاتھ میں دبا اپنی زل کا ہاتھ یاد آ جاتا تھا۔ کس طرح اس کا ہاتھ جھٹکا گیا تھا اور کس قدر استحقاق سے زل کو گاڑی میں دھکیل دیا تھا اس نے۔ زل تو اس کی تھی پھر وہ اس کی نظروں کے سامنے کیسے کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ تکلیف کم نہیں ہوتی تھی کہ اسے اپنی بے ہوشی کا دورانیہ چھلنی کرنے لگتا تھا۔ دس منٹ، پندرہ یا آدھا گھنٹہ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کب تک یونہی سڑک پر پڑا رہا تھا لیکن جب جب یہ خیال آتا کہ اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا تو وہ پاگل پن کی حد کو چھونے لگتا تھا۔ ہر شے کو جلا کر نیست و نابود کر دینے کا من کر رہا تھا۔ بے عزتی، اہانت اور کم مائیگی کا احساس اس کے ہر جذبے پہ حاوی ہو رہا تھا۔ وہ نا جانے کب تک ٹہلتا رہا اور سگریٹ کی راکھ سے اس کے آفس کا سارا فرش یوں بھرا ہوا تھا کہ جہاں جہاں وہ چکر کاٹ رہا تھا وہاں وہاں راکھ کی لکیروں نے اس کی بے چینی کے ثبوت نقش کیے تھے۔ بالآخر تھک کر وہ کسی وقت صوفے پہ گرا تھا اور سو گیا تھا۔ صبح اسٹاف کے آنے سے پہلے نصر نے ہی ڈپلیکیٹ چابی نکالی تھی اور ڈرتے ڈرتے آفس کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسٹاف آئے اور شہروز کو اس حالت میں دیکھے۔ نصر کی وفاداری ہمیشہ غیر مشروط رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو خلاف توقع آفس کے لوازمات قائم تھے لیکن فرش پہ سگریٹ کے ٹوٹوں اور راکھ کی بہار پھیلی تھی۔

"سر۔ سر اگر آپ مناسب سمجھیں تو گھر لے چلوں۔ کچھ آرام کر لیں۔ اسٹاف آنے والا ہے!"

اس نے مکمل جائزہ لینے کے بعد ڈرتے ڈرتے اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً شہروز کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ نصر کا دل کیا اپنا ماتھا پیٹے کیونکہ بار بار کی پکار پر شہروز اسے پیٹ سکتا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی اور ساتھ کندھا بھی ہلایا۔

"سر۔ سر اٹھ جائیں گھر چلیں!"

شہروز کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے بند آنکھوں سے ہی یکدم جھپٹ کر نصر کی گردن دبوچ لی۔

"تمہیں لگتا ہے کہ مجھے قابو کرنا آسان ہے۔ کوئی مجھے اتنے آرام سے گرا کیسے سکتا ہے نصر!"

اور نصر کی جان اچھل کر تالو سے آن لگی تھی۔ اسے پہلے ہی سوئے شیر سے ڈر لگ رہا تھا اب تو یقین ہو گیا کہ مفت میں ہی اپنی موت کو دعوت دے دی تھی۔

"سر۔ آپ کو گرا سکتا ہوتا کوئی تو کیا میری گردن اتنے آرام سے آپ کے ہاتھ میں ہوتی؟"

"تو اس نے مجھے کیسے ڈھا دیا نصر۔ تمہیں پتا ہے کہ یہاں پیچھے...... "اسی وقت اس نے نصر کی گردن سے گرفت ہلکی کی اور اس کا رخ بدل کر اس کی کمر کو اپنے مقابل کیا۔ اب اس کی گردن کی پشت اس کے سامنے تھی،" یہاں۔ یہاں کون سی نس ہے نصر جس کو دبانے سے تم بے ہوش ہو سکتے ہو۔ مجھے آج ہی مکمل تحقیق کر کے بتاؤ۔ سمجھو آج کا سارا دن تم نے یہی کرنا ہے!"

"سر۔ میں کون سا کوئی اسٹنٹ مین ہوں یا نسوں کا سسٹم جانتا ہوں۔ لیکن آپ۔ آپ میری گردن سے اپنا ہاتھ ہٹا لیجیے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری نس دب جائے اور میں بے ہوش ہونے کے بجائے ٹپک جاؤں!" وہ سہمے سہمے لہجے میں بولا۔ اسے شہروز پہلے ہی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اب تو یقین ہو گیا کہ دماغ اپنی جگہ سے سٹک گیا ہے۔

"جو کہا ہے وہ کرو سمجھے ورنہ مجھے تمہیں ٹپکانے کے لیے نس دبانے کی ضرورت نہیں ہے!" شہروز نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا تو نصر تیر کی تیزی سے اٹھا اور سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"اور کوئی حکم سر؟" وہ اب مؤدب لیکن چوکس تھا۔

"مس لائبہ کے بارے میں کیا جانتے ہو نصر؟" اگلا سوال حاضر تھا اور وہ اپنی آنکھیں میچتا اس لمحے کو کوسنے لگا جب اندر آفس میں آنے کا سوچا۔

ایک نمبر کا کمینہ باس ہے۔ خود ہی آنسو بہا بہا کے خاموش ہو جاتا مجھے خواہ مخواہ میں ہمدردی کا بخار چڑھ جاتا تھا۔ اب کھا نصر اس بخار کی دوائی۔ وہ وہ سوال یاد آئیں گے اسے جو سلیبس کا ہی حصہ نہیں۔ کے تو کی او نچائی بھی پوچھے گا اب سنکی۔ نصر خود کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔

"مس لائبہ سر۔ اممم۔ دس ماہ سے جاب کر رہی ہیں یہاں اور میرا خیال ہے۔ وہ ایک لڑکی ہیں!"

"نصر کیا واقعی تمہارا جینے سے جی بھر گیا ہے۔ کہیں تمہیں بھی تو یقین نہیں آ گیا سکون صرف قبر میں ہے!" شہروز نے سرخ نگاہیں اس پہ گاڑیں تو وہ تھوک نگلتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"سر۔ قبر میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آفس میں موجود تو ہوں۔ آپ پوچھیں سر کیا جاننا چاہتے ہیں۔ مس لائبہ کے بارے میں!"

"پورا بائیو ڈیٹا نکلواؤ۔ دوپہر تک میری ٹیبل پہ ہو۔ دوسرا آفس آئے تو میرے روم میں بھیجو۔ تیسرے اس کی والدہ کون ہیں کہاں کی ہیں ان کا بھی معلوم کرواؤ۔ مجھے یہ دونوں ماں بیٹی مشکوک لگتی ہیں!"

"کوئی خاص وجہ سر!" نصر بھی اب سنجیدہ تھا۔

"لائبہ نے مجھے پنڈ سے اچانک بلوایا تھا نصر۔"

"وہ ایکدم پھٹ پڑا۔ اس کی آواز بھی اونچی ہو گئی جبکہ نصر کے ماتھے پہ حیرت سے سلوٹیں نمایاں ہوئیں۔

"زل مل گئی ہے مجھے اور اس کے ٹھکانے کا بتانے والی لائبہ تھی۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا......"

وہ نصر سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ دیر بدیر سب اسے ہی سنایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی لائبہ کی کال سے لے کر اس کے گھر جانے اور زل کے وہاں موجود نہ ہونے تک کی مکمل داستان اس کے گوش گزار کر کے خاموش ہوا۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ مہریار نے اسے بے ہوش کیا تھا اور جب وہ سڑک پہ بے یار و مددگار پڑا تھا تو ایک رکشے والا اسے ہوش میں لایا تھا۔ جبکہ نصر کے اندر کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی ایک عادت اور بھی تھی کہ جب جب اس کا باس اپنا دل ہلکا کرتا وہ خاموشی سے سنا کرتا تھا اسے ٹوکتا نہیں تھا۔

"تم کیا کہتے ہو کہ لائبہ کا اس سارے میں کا کردار ہے!" شہروز نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو پل کا ہوتا ہے لیکن اس سب میں ان کا اپنا یقیناً کوئی فائدہ ہی ہے۔ وہ کیا ہے، معلوم کرنا پڑے گا سر۔ ورنہ آپ کو بلوانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے جبکہ نوکری بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے مس لائبہ کی۔!"

"اسی لیے کہا ہے تمام ڈیٹیلز نکلواؤ اور مجھے لا کر دو۔ زمل اسی شہر میں ہے لیکن کسی ایسے گھر ہے جہاں ہاتھ ڈالنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کی والدہ اور بہن کو ڈھونڈو، وہی اس تک لے جائیں گی ہمیں۔ کیونکہ اس شخص کے ساتھ وہ اکیلی گئی ہے جہاں بھی گئی ہے۔ وہ کون ہے اور زمل کو اتنے دھڑلے سے ساتھ کیسے لے جا سکتا ہے یہ صرف دو لوگ بتا سکتے ہیں۔ ایک لائبہ دوسرا زمل کی والدہ!"

"میں پتا کرتا ہوں سر۔ جلد اپ ڈیٹس دیتا ہوں آپ کو۔ آپ پلیز فریش ہونے گھر چلے جائیں یا یہیں وارڈ روب سے ڈریس چینج کر لیں، اسٹاف پہنچنے والا ہے!" اسے اب بھی اس کی ریپوٹ کی فکر تھی۔

"میری امی نہ بنا کرو۔ جتنا کام کہا ہے وہ کرو۔ اسٹاف کو میں پے کرتا ہوں انہوں نے مجھے ہائیر نہیں کر رکھا۔ سمجھے!"

"بالکل سمجھ گیا سر۔ میں چلتا ہوں!"

نصر باہر جانے کے لیے پلٹا۔

"اچھا سنو۔ میں واش روم میں جا رہا ہوں۔ تم جاتے ہوئے میرے لیے کافی اور ہلکے پھلکے ناشتے کا کہہ جانا!" وہ بلا خر وہی کر لیتا تھا جو نصر کہتا تھا۔

"جی بہتر سر۔ ابھی آجائے گا سب!"

"ہمم اور تم کیا کرنے چلے ہو۔ یاد ہے نا!" وہ محض خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"جی بالکل۔ میں معلوم کرنے جا رہا ہوں کہ آپ کی نس کس نے دبائی تھی!"

نصر نے اتنا کہا اور فوراً سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی دروازے کے اندرونی حصے پہ کوئی شے زور سے آ کر لگی تھی لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے لیے کافی اور ناشتے کا کہہ کر مشن امپاسبل پہ نکل گیا تھا۔

☆☆☆

صد شکر تھا کہ وہ فوری جواب طلبی سے بچ گیا تھا۔ جس وقت وہ زمن کو لیے باہر آیا تو وہاں فائزہ خاکوانی اور لائبہ کو نانی پیاری کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ سامنے میزان کے لائے لوازمات سے بھری پڑی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس کے سب بھائی لائبہ کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بیٹھے اپنی اپنی مٹھیاں ٹھوڑیوں کے نیچے دبائے اس ذوق شوق سے لائبہ کو تک رہے تھے کہ ایک پل کو مہریار بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ حیرت اسے شہریار پہ تھی جسے وہ سمجھتا تھا کہ نوکری لگنے کے بعد سیانا ہو گیا ہے مگر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ پرانے رنگ پکے ہوتے ہیں۔

فائزہ خاکوانی نانی پیاری کے سوالوں کے جواب دینے میں ہی بری طرح الجھ چکی تھیں کیونکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انہیں کون سی بات بتانی ہے اور کس بات کو چھپائے رکھنا ہے۔ لائبہ بھی ہلکے پھلکے جوابات دے کر ماں کو کمک فراہم کر رہی تھی۔ لیکن اس کے سامنے موجود چار نمونے اسے مسلسل زچ بھی کیے ہوئے تھے۔

مہریار اور زمن کے آجانے سے یکدم ماحول ہی بدل گیا۔ زمن سادے لباس میں ملبوس تھی جو اس کا پرانا ہی سوٹ تھا لائبہ اسے پہچانتی تھی لیکن چہرے پہ کسی قسم کے دباؤ یا فکر کے آثار نہیں تھے۔ وہ فائزہ خاکوانی اور لائبہ سے بے حد شوق اور جوش سے ملی جیسے سچ میں میکے سے کوئی ملنے آیا ہو۔ لائبہ، مہریار کی پرسنالٹی سے بھی بے حد متاثر ہوئی۔ وہ جتنا پرکشش فارمل ڈریس میں دکھائی دیتا تھا اس سے کہیں زیادہ گھریلو آرام دہ حلیے میں دکھتا تھا۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے فائزہ اور لائبہ کو خوش آمدید کہا تھا۔

لائبہ کو ایک بار پھر قلق ستانے لگا کہ کل وہ کیا کر بیٹھی تھی۔ سوئے شیر کو شکار نہیں دکھایا تھا بلکہ خون کی بُو سنگھا دی تھی۔ کچھ دیر میں ناشتا لگ گیا جو کہ بہترین ماحول میں کھایا گیا تھا۔ فائزہ خاکوانی جانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن مہریار نے زبردستی انہیں روک لیا۔ نانی پیاری بھی ایسے بنا کھائے پیے انہیں جانے نہیں دینا چاہتی تھیں اس لیے دونوں کو مجبوراً سب کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ زمن کو کافی اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اور لائبہ ایک دوسرے کے کان میں گھستے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کر رہی تھیں۔

"امی کیسی ہیں لائبہ۔ رات کو گھر آئی تھیں؟" زمن نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"نہیں کہاں آئیں۔ امی تو چاہ رہی تھیں کہ وہ آجائیں لیکن کل صبح زوہا کا آپریشن ہے وہ کہتی ہیں اب ایک ہی بار گھر آئیں گی صحت مند زوہا کے ساتھ!" نان کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اس نے تفصیلی جواب دیا۔ ساتھ ساتھ وہ سامنے والی کرسیوں پہ ایک ساتھ بیٹھے چار بھوکوں پہ بھی نظر ڈال رہی تھی جو اس قدر رغبت سے ناشتا کر رہے تھے جیسے یہ سب پہلی بار کھانے کو ملا ہو۔ مہریار مسلسل فائزہ خاکوانی کے ساتھ محو گفتگو رہا تھا ورنہ ان چاروں کا یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جاتا ویسے بھی مہمانوں کے سامنے نظر انداز کیے بنا چارہ نہیں تھا۔

"ان شاء اللہ، میری زوہا ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہیں تو بہت قابل بس ویسے کھڑوس ہیں!" زمن نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ اور پوری رکھا ہوا تھا۔ اسی کا چھوٹا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ لائبہ اس کے کان کے قریب تھوڑا جھکی۔

"تم ٹھیک تو رہیں نا زمن! آئی مین مجھے اور امی کو اتنی فکر رہی تو آنٹی کو بھی کتنی رہی ہو گی؟ نیا گھر، نئے انجان لوگ۔ سب اچھے تو ہیں نا! کچھ اوور ری ایکٹ تو نہیں کیا! امی کو آنٹی ہاجرہ نے ہی ناشتے کا کہا تھا کہ اسی بہانے تم سے ملاقات ہو اور ان کی بھی تسلی ہو جائے؟"

"باقی سب تو ٹھیک ہے لائبہ......" وہ بھی جواباً تھوڑا آگے ہو کر کان میں گھسی۔ "لیکن کل میرے ساتھ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ مال میں شہروز راؤ ٹکرا گیا تھا۔ یہ اپنے ڈاکٹر صاحب بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے ورنہ میرا کوئی اتا پتا نہ ملتا!!"

لائبہ نے اس کی بات پہ تھوک نگلا اور کھسیانا سا مسکرائی۔ یوں لگا جیسے وہ پکڑی گئی ہو۔

"باقی اس کے علاوہ سب ٹھیک ہیں۔ رات دیر سے پہنچے تھے اس لیے کسی سے بات نہیں ہو سکی۔ میرے آنے پہ یہ سب گھر والے اس طرح ایک لائن کھڑے تھے جیسے میں چندہ دینے آئی ہوں۔ یہ جو بزرگ خاتون ہیں یہ اللہ جانے ڈاکٹر مہریار کی کیا لگتی ہیں پر یہ چار ناور جیسے بچے دیکھ رہی ہو؟"

"بچے۔" لائبہ جو آرام دہ سی اس کی بات سن رہی تھی بچے لفظ پہ اچھلی۔

"بچے ہی ہیں بھئی۔ یہ چاروں ڈاکٹر مہریار کے بچے ہیں۔ انہوں نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان کی پہلی شادی ہوئی ہے اور چار بچے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ایکسل میں ہیں۔ سوچا تھا پپو، چنو، بلو، گڈو ٹائپ کے ہوں گے لیکن یہ تو شاہ رخ، عامر، سلمان اور سیف والا چوانگڑا نکلے!"

"نا کرو۔!" لائبہ کا حیرت سے برا حال تھا۔ اس نے ایک نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے چار اونچے لمبے "بچوں" کو دیکھا تو وہ سب بچے بڑوں والا شوق لیے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ لائبہ واپس پلیٹ کی جانب متوجہ ہوئی۔

"میں نے نہیں ڈاکٹر مہریار نے کیے۔ ابھی تو ان کی زوجہ میری نگاہوں کے سامنے نہیں آئی۔ سوچو وہ کیسی ہو گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اپنے ڈاکٹر مہریار بچپنے میں ہی بیاہے گئے ہوں گے۔ ورنہ اتنے بڑے بڑے بچے کیسے ممکن ہیں!" زمن نے مدبرانہ لہجے میں کہتے ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں ڈالا۔ انداز لاپروا ایسا تھا جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لائبہ

بمشکل بولی۔

"ممکن تو ایسے بھی نہیں بی بی۔ یا تو تم پاگل بنائی گئی ہو یا پھر تمہارے ساتھ پرینک ہو رہا ہے!"

"پرینک ہے یا کچھ بھی۔ امی سکون میں ہیں مجھے یہی کافی ہے۔ ان کی پریشانی میرے لیے سب سے اہم تھی۔ اور سچ کہوں لائبہ تو مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ باقی رہے یہ بچے تو میرے ساتھ کھیلیں گے اور ہم سب مل کر بڑے ہو ہی جائیں گے!"

لائبہ کو ہنسی کے باعث زور کا اچھو لگا تو زمن بھی چہرہ نیچے کیے ہنس دی۔ سچویشن عجیب تھی لیکن دلچسپ بھی۔ لائبہ کو یقین تھا کہ زمن کو ضرور ڈاکٹر مہریار نے ایسا ویسا کچھ کہا ہوگا جسے وہ سیریس لے گئی تھی ورنہ اتنے بڑے بچے!

اس نے ایک بار پھر سامنے نگاہ کی تو ایک ساتھ پانی کے چار گلاس اس کے سامنے ہوا میں معلق ہوئے۔ وہ بھی گلاسوں کو دیکھنے لگی تو کبھی باقی سب کو جو نا سمجھی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مہریار نے زور سے گلا کھنکارا اور ان چاروں کو ہوش دلانے کی کوشش کی۔ اپنی جون میں واپس لوٹ کر ان چاروں نے دوبارہ سے کھانا شروع کیا سوائے شہریار کے۔ جو مسلسل لائبہ کو نگاہوں کی زد میں لیے تھا۔ کچھ سوچتا سمجھتا وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

خوشگوار ماحول میں ناشتے کے بعد فائزہ خاکوانی اور لائبہ وہاں سے رخصت ہوئی تھیں۔ نانی جان کو اپنے مطلب کے جوابات نہیں مل سکے تھے لیکن ان کا دل کہتا تھا کہ خانم مل چکی ہے اور زمن اسی کی بیٹی ہے۔ مہریار نہ ہاں کہتا تھا نہ نہیں اور اسی بات نے ان کے دل میں یقین کو جڑ پکڑا دی تھی۔

وہاں سے نکلتے ہی لائبہ نے پہلے فائزہ خاکوانی کو گھر اتارا اور خود آفس کا رخ کیا۔ وہاں بھی اس کے لیے محاذ تیار کھڑا تھا۔ اس نے دل میں الفاظ اکٹھے کرنے شروع کیے جو اسے اپنے باس سے کہنے تھے۔ کچھ بھی تھا اس ٹیڑھی کھیر سے اب اسے محبت ہو چکی تھی کیونکہ وہ اس کا سگا بھائی تھا۔

☆☆☆

رباب خان ہاسپٹل میں مہریار کے آفس میں سر تھامے بیٹھی تھیں۔ ان کا سارا وجود شل تھا۔ ابھی ابھی جو منظر انہوں نے دیکھا تھا وہ ان کے پیروں کی زمین ہلا گیا تھا۔ وہ ہاجرہ کی خاطر معمول سے پہلے ہاسپٹل پہنچی تھیں۔ آج ان کے دل کو عجب بے چینی تھی۔ کل اچانک ہوئے زمن کے نکاح کے بعد سے وہ جانتی تھیں کہ ہاجرہ ہزار تسلی کے باوجود پریشان ہی ہوں گی۔ اوپر سے زوہا کا آپریشن تیار تھا اور ہاجرہ اس کے لیے بھی زود رنج تھیں۔ گو کہ ناکامی کے چانسز کم تھے لیکن جو تھے وہ ہی دہلا رہے تھے۔ وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچیں تو سارا اسٹاف ان سے نگاہیں چراتا ادھر ادھر جا رہا تھا۔ وہ حیران ہوتے زوہا کے روم کی جانب چل دیں۔ ابھی دروازے پر ہی تھیں کہ ایک نرس اندر سے ہاتھ میں ٹرے تھامے باہر نکلی جس میں کچھ ضروری میڈیکل آپریٹس تھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی اس لیے رباب خان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ فوراً معذرت کرتی سائڈ سے ہو کر جانے لگی تو رباب خان نے پکار لیا۔

"رکو ایک منٹ۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ زوہا تو ٹھیک ہے نا۔ سبھی پاگل پاگل سے کیوں دکھ رہے ہو اور ڈاکٹر مہریار کا پتا کر دیجیے کہ نہیں!" ایک ساتھ سوالوں کا انبار اس بے چاری پہ لاد کر وہ اسے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جواباً وہ نرس محتاط لیکن عجلت زدہ لہجے میں بولی۔

"وہ میم۔ اندر وہ۔ وہ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے سارے ہاسپٹل کو ناچ نچا دیا ہے۔ زوہا میم کی اگلی پچھلی سب ہی رپورٹس مانگی ہیں وہی لینے جا رہی ہوں!"

"او بابا، کون آ گیا ہے اندر، ایسا پھنے خان بن کر۔ صاف بات کرو کس کی بات کر رہی ہو۔ ڈاکٹر شکیل تو نہیں پہنچ گئے پاکستان؟"

"ڈاکٹر شکیل کو چھوڑیں وہ بھی اب بھاگتے

آئیں گے۔ ابھی تو پیشنٹ کے اباجی پہنچے ہیں۔ مہریار سر کے چاچو۔ ڈاکٹر حسنات راؤ۔ اندر وہی ہیں پیشنٹ کے ساتھ۔ صبح سے انہوں نے سارے اسٹاف کو لائن حاضر کیا ہوا ہے۔ ہر ہر بال کی کھال نکال رہے ہیں!"

رباب خان کے اوپر جیسے عمارت کی چھت دھم سے آگری تھی۔ وہ سر سے پیر تک شل ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر حسنات کا لفظ دماغ میں ڈھول بجا رہا تھا۔ اندر حسنات لالہ تھے۔؟؟ واقعی وہی تھے کیا؟ خوشی حیرانی یا شدید جھٹکا تینوں میں سے کون سی شے اس وقت ان کے حواسوں پہ حاوی ہو رہی تھی وہ اندازہ نہیں کر پائیں۔ کیا ہاجرہ بھی اندر ہے؟ یہ خیال آتے ہی انہوں نے دوبارہ نرس کی جانب دیکھا لیکن وہ موقع غنیمت جان کر کھسک گئی تھی۔

رباب خان نے بے حد احتیاط سے اپنی جانب سے مقدور بھر محتاط رہ کر دروازہ کھولا اور جھری سی بنا کر اندر جھانکا۔ رباب خان نے زوہا کے بیڈ کے سرہانے جس بندے کو دیکھا تھا اس نے ان کے سارے جسم کو کپکپا دیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حسنات لالہ ہی تھے ہو بہو حسنات لالہ۔ بس وقت انہیں جیسے ہلکا سا جھاڑ پھونک کر گیا تھا وگرنہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی وجاہت، وہی چوڑے شانے اور وہی سلکی بالوں سے بھرا سر۔ ان کا دل بھر آیا۔ وہ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے حسنات لالہ کو دیکھ رہی تھیں وہ بھی اتنے سالوں بعد۔ دل چاہا اندر جائیں اور لاڈ سے ان کے بازو کو تھام کر لپٹ جائیں۔ حسنات لالہ اس وقت زوہا کا سر اپنے سینے سے لگائے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ آنکھیں لال گلال ہو رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں نظر کی عینک پکڑ رکھی تھی جو یقیناً رپورٹس وغیرہ دیکھنے کے لیے تھامی ہوئی تھی۔ زوہا بھی روئی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں باپ کے سینے سے لگ کر موندی ہوئی تھیں اس کے باوجود پتا چلتا تھا کہ دونوں کے درمیان بہت سا رونا دھونا، گلے شکوے ہو چکے ہیں۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ اندر جائیں یا پلٹ جائیں یکدم خیال آیا ہاجرہ یقیناً اندر نہیں ہیں ورنہ یہ منظر اتنا پرسکون بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازہ بنا آواز بند کرتے واپس پلٹ گئیں۔

ہاجرہ اندر نہیں تھیں تو کہاں تھیں؟ وہ کبھی بھی ہاجرہ کو بائی پاس کر کے حسنات لالہ سے نہیں مل سکتی تھیں۔ پہلے ہاجرہ کے گلے شکوے سنے جائیں گے، ان کا مداوا ہوگا اس کے بعد کسی کو حق تھا کہ وہ حسنات لالہ سے کلام کرتا۔ وہ فوراً کوریڈور کی جانب بھاگیں اور وہیں اسٹاف سے معلوم ہوا کہ ہاجرہ دوسرے روم میں دواؤں کے زیر اثر سو رہی ہیں۔ رباب خان سمجھ گئیں کہ دونوں کا سامنا ہو چکا ہے۔ انہوں نے ایک نظر ہاجرہ پہ ڈالی تھی اور انہیں سوتا چھوڑ کر تب سے مہریار کے آفس میں بیٹھی گتھیاں سلجھا رہی تھیں۔ کس کو بلائیں؟ مہریار کو یا خان صاحب کو؟ حسنات لالہ سیدھا یہیں کیوں آ گئے؟؟؟ انہیں کیسے پتا چلا کہ زوہا یہاں ہے؟ بہت سے سوال اور جواب ندارد!

ایک ہی بندہ تھا جو انہیں تسلی کروا سکتا تھا۔ انہوں نے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب کافی بیلز کے بعد کال پک کر لی گئی۔

"مہر۔ ہاسپٹل پہنچو۔ ابھی!"

مہریار کا ایک لمبا سانس خارج کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر آواز آئی۔

"جی پہنچتا ہوں۔ پینک نہ ہوں۔ آ کر سمجھاتا ہوں!" ساتھ ہی وہ کال بند کر گیا۔

"اوہ۔ یعنی ان جناب کو ساری خبریں ہیں۔ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے!"

وہ بے چینی سے مہریار کے پہنچنے کا اور ہاجرہ کے جاگنے کا انتظار کرنے لگیں اس سے پہلے کہ حسنات لالہ اس آفس میں آ جاتے!

☆☆☆

"میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد پہنچوں۔

تمہاری ماں کو سمجھانا کون سا آسان ہے۔ اب بہت تنگ کرتی ہے مجھے شہر جانے پہ۔ خیر کوشش کرتا ہوں بس اس ہفتے دوبارہ پنچائیت بیٹھنی ہے اور امید ہے کہ چوہدری حاکم کا معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ سب ہی اس سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ بات اسے برادری تک سے نکالنے پہ پہنچ چکی ہے اور پتر، تمہیں تو پتا ہے یہ پنڈوں میں برادری ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ خیر کوشش کرتا ہوں جلد از جلد پہنچوں!"

مہریار کی کال آئی ہوئی تھی، وہ انہیں فوری طور پر شہر بلا رہا تھا جبکہ ابھی انہیں پنڈ میں کچھ انتہائی ضروری کام تھے۔ فصل اترنے والی تھی اپنی نگرانی میں کام کروانا بے حد ضروری تھا کیونکہ چوہدری قاسم کا اندھا جوش تو وقت کے ساتھ ختم ہو چکا تھا مگر چوہدری حاکم نے جیسے ضد باندھ لی تھی کہ ہر کام میں اڑی کرنی ہی کرنی ہے۔ وہ اس سے نہیں لیکن اس کے پھیلائے فتنے سے خائف رہا کرتے تھے۔ مہریار نے انہیں جو خبر دی تھی وہ سننے کے بعد جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا وقت تھا۔ خانم کی بیٹی کا آپریشن تھا یہ تو اہم تھا ہی لیکن ان کا ماں جایا پہنچ چکا تھا یہ ان کی روح کو جکڑنے کے لیے کافی بڑی خبر تھی۔ (مہریار نے اپنے نکاح کی خبر فی الوقت چھپالی تھی) حسنات پاکستان میں تھا اور ان کے بیٹے کے ہاسپٹل میں موجود تھا یہ سوچ ان کے جسم میں پھریری دوڑا رہی تھی مگر اگر وہ فوری طور پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر کے لیے نکل جاتے تو دشمن خبردار ہو جاتا اور پنڈ میں بے چینی پھیل جاتی۔

وقت نے ایک بار پھر چودھراہٹ کی پگ ان کے سر پر لا سجائی تھی۔ وہ چوہدری قاسم جو پنڈ کی چودھراہٹ کا مرکز "حویلی لکھاں" پہ اس غرض سے قبضہ کر گیا تھا کہ اپنے تایا شہاب الدین کے بعد پگ اس کے سر پر سجے گی تو خوف و ہراس کے مارے لوگوں اور چوہدری حیات کے دگرگوں حالات کے باعث وہ ایک عرصہ اس میں کامیاب رہا تھا مگر اس کا یہ عروج پانی کے بلبلے جیسا ثابت ہوا تھا۔ پنڈ کے معاملات کو اپنی عقل و فہم کے مطابق دیکھنا اور طاقت کا بے جا مظاہرہ کرنا لوگوں کو باغی بنا گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے بے خوفی تک آئی تو سب نے مل کر ارد گرد کے بھی پنڈوں کے کرتے دھرتے اکٹھے کیے اور دستار چوہدری حیات راؤ کے سر پر سج گئی۔ کسی کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ سرخ چوباروں والی حویلی، حویلی لکھاں کا آدھا بھی نہیں بس فرق پڑتا تھا تو اصول وضوابط سے اور قاعدے قانون سے۔ ایک طویل مدت سے پنڈ میں جو جنگل راج چل رہا تھا اس کا خاتمہ ہوا اور چوہدری حیات راؤ نے تدبر و فراست سے کام لے کر پنڈ کے معاملات کو ہاتھوں میں خوش اسلوبی سے لیا۔ چوہدری قاسم کی تلملاہٹ اور اس کے پتر شہروز راؤ کا غصہ اور طاقت کا استعمال بھی اب کسی کو ان سے مرعوب ہونے نہیں دیتا تھا۔ نتیجتاً پنڈ کا مرکز "سرخ چوباروں والی حویلی" بن چکی تھی۔

چوہدری حیات چوپال کو نکلنے والے تھے اور جانے سے پہلے انہوں نے چوہدری شہاب کے کمرا میں نگاہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ شرفو ان کی پنڈلیوں کا مساج کر رہا تھا۔ شکل سے اکتایا ہوا اور بیزار دکھتا تھا۔ وہ سمجھ گئے چوہدری شہاب اسے زچ کیے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں بھی ان کی ضدیں اور من مانیاں عروج پر ہوتی تھیں اور شرفو ایک ملازم تھا جو تنگ پڑ ہی جاتا تھا۔ اس کا کام سارا دن ایک بیمار آدمی کی دیکھ بھال تھا لیکن جب بیمار شخص تعاون نہ کرے تو سنبھالنے والا تنگ پڑ ہی جاتا ہے۔ چوہدری حیات آگے بڑھے اور شرفو کے ہاتھ سے تیل کی بوتل لے کر اسے باہر جانے کا اشارہ کیا تاکہ وہ کچھ دیر ہوا خوری کر آئے۔ خود وہ چوہدری شہاب کی پائینتی بیٹھ کر اپنی ہتھیلی پہ تیل ڈال کر ان کا مساج کرنے لگے۔

چوہدری شہاب انہیں خشونت سے دیکھ رہے تھے وہ کبھی بھی اپنی اولاد سے ویسے محبت نہیں کر سکے تھے جیسا ان کا حق تھا اس کے باوجود ان کی قسمت اچھی تھی کہ ان کی اولاد نہ صرف ان کی تابعدار تھی بلکہ خدمت گزار بھی تھی۔ قاسم کے دور ہو جانے کا قلق چوہدری شہاب کو ہمیشہ اس قدر رہا کہ اپنی زبان سے اس غم کی کڑواہٹ کبھی جدا نہیں کر سکے تھے۔ اس کا اظہار وہ گاہے بگاہے چوہدری حیات اور کشور کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا کر کیا کرتے تھے۔ لاچاری ایک طرف مگر اس کے باجود جب بھی چوہدری حیات شہر سے باہر جاتے تو وہ شرفو کو بھیج کر ہر اس شخص کو پیغام دے کر بلوا لیتے جسے چوہدری حیات پسند نہیں کرتے تھے اور جو انہیں نقصان پہنچانے سے کتراتا نہیں تھا۔ چوہدری شہاب زمینوں کے معاملات ان کے منہ سے سنتے اور اشاروں سے اپنی رائے کا اظہار بھی کرنے کی کوشش کرتے جو ان کے اندرونی خلفشار کو ظاہر کرتی۔ سب کو اندازہ تھا کہ وہ چوہدری حیات کے طرز چوہدراہٹ سے مطمئن نہیں نہ ہی وہ انہیں پگ کا اہل سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں دشمنوں کی قوت کو مہمیز کرنے کا کام کرتی تھیں۔ وہ ان کے پاس سے بہت راضی بہ رضی ہو کر جاتے کہ جاتے سمے ان کے پاس چوہدری حیات کے خلاف بہت سا مواد جمع ہو چکا ہوتا۔ یہ الگ بات تھی کہ چوہدری شہاب کی ایسی ہر کوشش پہ شرفو پانی پھیرتا تھا۔ وہ چوہدری حیات کو ہر بات سے باخبر رکھتا تھا اور چوہدری حیات دشمن سے چوکنا ہو جاتے۔ اس طرح کی گرمی سردی چلتے ایک مدت بیت گئی تھی نہ چوہدری شہاب کی فطرت میں تبدیلی آئی تھی نہ چوہدری حیات کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔

"شرفو کو زیادہ پریشان نہ کیا کریں ابا جی۔ مخلص لوگوں کی قدر کرنی چاہیے۔ آپ کو اچھے سے سنبھالتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور ہوا تو آپ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے!" تیل کی شیشی بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر انہوں نے ایک آخری بار پنڈلیاں ملیں اور تہبند ٹھیک کرتے ان کی ٹانگوں پہ لحاف اوڑھا دیا۔ کمرا میں الیکٹرک ہیٹر کی وجہ سے درجہ حرارت بہت مناسب تھا پھر بھی چوہدری حیات نے اٹھ کر ہیٹر کو دوبارہ سیٹ کیا۔

"تمہیں بھاڑ میں بجھائے وہ وہ تمہیں بھی اور تم سب بھی۔ تم تو چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں اور سارا راج پاٹ تمہیں مل جائے!"

انہوں نے وہی زہر اگلا جو وہ ہمیشہ اگلتے آئے تھے۔ ایک ہی جگہ سوئی اٹکے عمر بیت گئی تھی لیکن ہمت نہیں ہاری تھی۔ راج، مسند، حکومت، زمینیں۔ ساری زندگی اسی دائرے میں بھاگے تھے اب کوئی کنارہ ہی نہیں ملتا تھا!

ان کی بات کے جواب میں چوہدری حیات متانت سے مسکرائے۔ باپ کی کم فہمی پہ افسوس بھی ہوا اور دکھ بھی کیونکہ یہ بات ان کو سمجھ ہی نہیں آئی تھی کہ اختیارات تو عرصہ دراز سے ان کے پاس سے جا چکے تھے۔ ان کا دور کب کا ختم ہو کر بھلا دیا گیا تھا مگر وہ خود کو خود ہی حاکم تصور کرتے ہوئے اپنی دل پشوری کرتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود چوہدری حیات نے انہیں آج تک ایک لفظ نہیں جتایا تھا بلکہ خندہ پیشانی سے ان کا دیا ہر زخم سہا تھا۔ وہ نرمی سے ان کی پنڈلی پہ تھپکی دیتے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

" بلاوجہ ایسی باتیں نہ سوچا کریں ابا جی۔ آپ بڑے ہیں آپ کو ایسی بات زیب نہیں دیتی۔ باقی میں آپ کو کچھ بتانے آیا تھا۔ شاید آپ کو خوشی ہو!"

وہ کہہ کر چوہدری شہاب کا چہرہ ٹٹولنے لگے کہیں کوئی رمق محسوس ہو مگر بے فائدہ تھا سب۔ وہ اسی نخوت زدہ چہرے سے انہیں دیکھتے منہ پھیر گئے۔ چوہدری حیات نے ایک آہ بھری اور بولے۔

"آپ کا چھوٹا پتر آپ کا شہزادہ، سالوں کا بچھڑا اور اپنوں کا ستایا آپ کا حسنات پاکستان آ گیا ہے اور اس وقت اپنے بچوں کے پاس ہے!"

چوہدری شہاب الدین کی سماعتوں پہ بم پھوٹا تھا۔ یہ انہوں نے کیا سنا تھا؟ آیا جو سنا تھا وہ سچ تھا؟ ان کے پورے جسم میں اضطراب کی لہر پھیل گئی۔ چوہدری حیات ان کو اطلاع دے کر واپس مڑ گئے تھے۔ ان کے چہرے پہ ذومعنی مسکان تھی کیونکہ آخری جملہ انہوں نے جان بوجھ کر کہا تھا یا ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا یہ خود انہیں بھی اندازہ نہیں تھا مگر دل میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے جلتے بلتے کلیجے پہ ٹھنڈے آبشار سے پانی کے چھینٹے آ پڑے تھے۔ وہ فوراً اسی لیے کمرے سے نکل آئے تھے کیونکہ ردعمل وہ جانتے تھے کہ بالکل اچھا نہیں آنے والا تھا اور انہیں پروا بھی نہیں تھی۔ ساری عمر گل گئی تھی ان کے بھائی کو پردیس میں خانہ بدوشی اختیار کیے ہوئے۔ اپنی فیملی ہوتے ہوئے بھی اسے خاندان کا سکھ نصیب نہیں ہو سکا تھا، اولاد کا ساتھ نہ مل سکا تھا، وفادار بیوی کو اپنے ہاتھوں خود سے جدا کر کے دل فگاری کی کیفیت میں برسوں بتا دیے تھے تو یہ سب کس کی وجہ سے؟ انہی کی وجہ سے جنہیں ابھی بھی اپنے بیٹے کے واپس آ جانے کی خوشی کے بجائے یقیناً یہ دکھ تڑپانے والا تھا کہ ان کا بیٹا اسی عورت کے پاس ہے جس کو سب کی زندگیوں سے حذف کر ڈالنے کی خاطر انہوں نے کیسے کیسے دام نہیں کھیلے تھے۔ کمرے سے باہر آتے ہی انہیں چوہدری شہاب الدین کی غراہٹ کی آواز آنی شروع ہوئی۔ شرفو دور بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا فوراً سگریٹ پھینکتا بھاگا قریب آیا۔ چوہدری حیات نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

"مت پیا کرا تنا۔ حویلی سے باہر جاتا ہے تب شوق پورا کر لیا کر ابا جی کے لیے اچھا نہیں اس کا دھواں۔ تیرے منہ سے بو آتی ہو گی انہیں تو دل اوازار ہوتا ہو گا!"

شرفو ہاتھ جوڑ کر کھکھیایا۔

"چوہدری جی بہت کم کر دیا ہے جی۔ وڈے چوہدری جی جب سو جاتے ہیں تب پی لیتا ہوں اب کیا کروں جی ماڑا بندہ ہوں یہی دوا ہے یہی دارو جی۔ رات کو اسی کی وجہ سے نیند بھی رہتی ہے جی!" اس کے پاس ایک سو ایک بہانے تھے۔ چوہدری حیات نے سرنفی میں ہلایا اور بولے۔

"ابھی کچھ دیر اندر مت جانا۔ ابا جی کو اکیلا رہنے دے۔ ایسا کر ذرا ناظم صاحب کے پاس جا اور انہیں پیغام دے کہ شام میں حویلی چکر لگائیں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ تب تک تیرے منہ سے یہ دہاڑ بھی ختم ہو جائے گی..!"

وہ سر ہلاتا تیزی سے بھاگا مبادا چوہدری حیات کا ارادہ بدل نہ جائے اور اسے اندر کمرے میں جا کر چوہدری شہاب کی غوں غاں سننی پڑے۔ تھوڑا وقت باہر گزر جاتا تو طبیعت بہتر ہو کر کام میں دل بھی لگ جاتا۔ اس کے جاتے ہی چوہدری حیات بھی حویلی سے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

کمرے میں چوہدری شہاب الدین کی غصے اور جلال سے بھری آوازیں بھرتی جا رہی تھیں۔ ان کا بوڑھا جسم پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جو بات چوہدری حیات انہیں بتا گئے تھے یہ ان کو کند چھری سے ذبح کرنے جیسے تھا۔

"ساری عمر آپ کی شکل نہیں دیکھی دھوکا دیتا آ رہا ذلیل کہ کسی سے نہیں ملتا لیکن اپنی اس بیوی اور بچوں کے لیے پاس ہی تھا۔ نہیں معاف کروں گا!"

انہیں لگ رہا تھا کہ حسنات نے محض انہیں ساری عمر اس دھوکے میں رکھا تھا کہ وہ صرف باپ بھائی سے نہیں بلکہ اپنی بیوی اور بچوں سے بھی دور ہے مگر درحقیقت وہ ہمیشہ سے اپنی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ اس سوچ نے ان کے تن بدن میں آگ لگا

دی تھی۔ اس آفریقی کو لا لیے ... پھر انہوں نے
اپنی پوری جان لگا دی تھی اگر وہ اس میں ناکام
رہے تھے تو ان کی زندگی رائیگاں ہو گئی تھی۔

"ملعون: جب کسی کی روح میں پہنچ کا راستہ
اس کے اثر سے خیالات بھی آلودہ ہو جاتے ہیں۔
دل میں وسوسے ابھرتے رہتے ہیں اور
انسان اپنے نفس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔
ساری عمر ناچ ناچ کر جب قبر کے دہانے پہ پہنچتا
ہے تب اسے ادراک ہوتا ہے کہ وہ تو اس گڑھے
میں اندھیرے بھر چکا ہے!

چوہدری شہاب الدین نے تمام عمر خود کو حق بجانب جان کر ظلم و ستم کمایا تھا لیکن اب بھی وہ یہ ماننے سے انکاری تھے کہ وہ غلط کر چکے ہیں۔ خانم سے دشمنی دراصل چوہدری آفتاب سے دشمنی کا شاخسانہ تھی۔ انہیں جو شخص نہیں پسند تھا وہ کبھی اس کا بھلا نہیں چاہتے تھے۔ خانم کی فطرت میں شروع سے ہی دلوں میں گھر کر جانے کا ہنر تھا اور یہ ہنر اسے اپنے باپ سے ملا تھا۔ دونوں کی گفتگو انداز و اطوار نرم خوئی اور دلجوئی یکساں تھی۔ کبھی ان سے کوئی نفرت کر ہی نہیں سکا تھا اس لیے چوہدری شہاب الدین نے ٹھانی تھی کہ وہ سدا آفتاب سے نفرت ہی کریں گے اور اسی نفرت نے ان سے آفتاب کا قتل کروایا جب وہ نہ رہا تو اس کا پرتو خانم ان کا ہدف ٹھہری اور بلا آخر اپنے اندر کی گندگی کا سارا بوجھ اپنے ضمیر پہ ڈال کر انہوں نے خانم پہ بہتان باندھے، اسے دربدر کروایا، مارنے کی کوشش کی اور میاں بیوی میں جدائی ڈلوائی۔ اپنے مؤقف پہ وہ اب بھی قائم تھے کہ انہیں خانم کو جان سے مار دینے کا پورا حق تھا اور اس کی اولاد ان کے بیٹے کی کچھ نہیں لگتی تھی مگر آج جب انہیں معلوم ہو رہا تھا کہ حسنات اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ہے تو ان کا یہ بستر کانٹوں انگاروں سے پر تھا۔ وہ اب بے ہنگم انداز میں چلا چلا کر اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے اور پھر دفعتاً کمرا دھوئیں سے بھرنے لگا۔ روشن دان سے ایک دم کثیف، بے ڈھنگا ہیولہ دھواں ہوا اور ان کا ... لگا پچھلے پاؤں پنجے دیوار پہ پلٹنے کی طرح چلتے نیچے اترنے لگے۔

"آآآآآ اب۔ تم مرر رہا ہوں نہیں!"

چوہدری شہاب الدین کا دم اٹھنے لگا۔ چلانے میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ دھواں بڑھنے لگا اور وہ ہیولہ دیوار کی جڑ میں اتر کر ان کے قریب آنے لگا۔ چوہدری شہاب اپنے بے جان پیروں کو ہلانے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ تبھی یکدم وہ ہیولہ ان کی پائنتی کے قریب سے ایک جست میں اچھلا اور ان کے نیم تحیم لیکن لاچار وجود پر چھا گیا!

☆☆☆

کمرے کی خاموش فضا، ان کے زانو پہ سر رکھے سوئی ان کی وہ اولاد جس کو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے تو ساری عمر یہ بھی جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ آیا ان کے ہاں دوسری اولاد بیٹا تھا یا بیٹی۔ اپنی ہی انا کے خول میں بند وہ کیا کچھ اور کس قدر گنوا آئے تھے اس کا احساس انہیں اس وقت گود میں سر رکھے سوئی زوہا کا پرسکون چہرہ دیکھ کر ہو رہا تھا۔ وہ اس قدر پیاری تھی کہ وہ رہ رہ کر ملال کی پھوار میں بھیگنے لگے۔ سب سے زیادہ اذیت کی بات یہ تھی کہ وہ ان سے بالکل ناراض نہیں ہوئی تھی۔ جس وقت وہ زوہا کے کمرے میں داخل ہوئے تھے ان کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ دل میں خوف تھا کہ ان کی بیٹی انہیں کبھی قبول نہیں کرے گی مگر جیسے ہی زوہا کی نگاہ ان پہ پڑی اس کے لبوں سے بے اختیار "بابا" کا لفظ سن کر وہ اس کی جانب بے تابانہ لپکے تھے۔ زوہا جیسے پہلے سے جانتی تھی کہ وہ آنے والے ہیں اور اس کا رویہ اور آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ اسے ان کی شکل سے بھی مکمل واقفیت تھی۔ اسے اپنے سینے سے لگائے کتنے ہی آنسو ان کی آنکھوں سے بہے۔ دل کو مزید پچھتاوں اور بوجھ نے گھیر لیا۔ یہ کیا کر بیٹھے تھے وہ؟ ان کا کتنا قیمتی وقت برباد ہوا گیا تھا محض دشمنوں کی چالبازیوں اور ان کی اپنی کم عقلی کے

کارن۔ اپنی بچیوں کا بچپن اور ان کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں سے اتالڑکپن انہوں نے کھو دیا تھا۔ وہ بھی جان نہیں پائیں گے کہ بیٹیاں جب کندھے سے جھول کر فرمائشیں کرتی ہیں تو باپ کے سینے میں محبت کیسے ٹھاٹھیں مارتی ہے کیونکہ انہوں نے وہ چاشنی میں ڈوبے لمحات اپنے زندگی سے خود ہی حذف کر دیے تھے۔ زوہا ان سے لپٹ کر شکووں سے زیادہ اس بات کا اظہار کرتی رہی تھی کہ وہ انہیں کتنا یاد کرتی ہے اور ڈاکٹر مہریار نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آپ آئیں گے تب ہی میرا آپریشن ہو گا ورنہ وہ بھی آپریشن کے لیے راضی نہ ہوتی۔ ان باتوں کا دکھ اور اذیت شدید تر تھی۔ انہوں نے زوہا کی سب رپورٹس دوبارہ دیکھی تھیں۔ اس کا تمام ریکارڈ چیک کیا تھا اور زوہا آتی جاتی نرسوں کے سامنے فخر سے اپنے بابا کو دیکھتی تھی۔ کتنی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ دواؤں کے زیر اثر ان کی گود میں سر رکھے سوگئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مختصر نیند ابھی ٹوٹ جائے گی لیکن جو کچھ ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ رہا تھا اس کی کرچیوں کی آواز بس ان کی روح کو چھید سکتی تھی باقی کسی کو معلوم نا ہوتا!

ایسی ہی توڑ پھوڑ کچھ فاصلے پہ دوسرے کمرے میں نیم دراز خانم کے اندر ہو رہی تھی۔ ان کا ہاتھ تھامے رانی محبت بھری نم آنکھیں لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کڑا مرحلہ تھا لیکن پار کرنا تھا۔ ملاقات تو ہو کر رہنی تھی تو انتظار کس بات کا تھا۔ بس ہمت جمع کرنے میں وقت تھی۔ وہ اسے حوصلہ دیتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں حسنات لالہ سے ملنے جا رہی ہوں خانم، اور پھر ان کو تمہارے پاس بھیج دوں گی۔ جو ہو گیا سو ہو گیا نہ تم بدل سکتی ہو نہ وہ۔ لیکن معاملہ اب بچیوں کا ہے خانم۔ ان کی خاطر دل پہ پتھر رکھو۔ جہاں اتنا سہا وہاں ایک اور قدم دکھ کی وادی میں آگے بڑھانا ہی پڑے گا۔ میں جانتی ہوں لالہ کا جرم چھوٹا نہیں لیکن ظرف اگر بڑا ہو تو ہر خطا ڈھک لیتا ہے۔ گلے شکوے مداوا نہیں ہو سکتے لیکن وہ تار جو آج بھی جڑا ہے تم دونوں کے بیچ اس کا تناؤ کم ہو سکتا ہے محض اتنا کہ اس تار پہ تمہاری بچیوں کا ٹھہرا مستقبل ڈول نہ جائے۔ اسے مستحکم رکھنے کی خاطر کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا ورنہ تار ٹوٹنے سے بیٹیوں کا مستقبل اندھی کھائی میں نا جا گرے!"

رانی نے خانم کی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کی اوٹ سے مسلسل ٹپکتے پانی کو دیکھا اور تاسف سے اس کا گال سہلاتے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں شدید خاموشی اتر آئی۔

ہاجرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہاتھ پیر سن ہونے لگے تھے۔ وہ اونچی ہو کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے گھٹنے اوپر کو موڑ کر بیٹھ گئیں۔ دل کر رہا تھا وقت ٹھہر جائے اور بس جو آگے ہونے والا ہے وہ کبھی وقوع پزیر نا ہو سکے۔ دس منٹ پھر پندرہ اور پھر بیس۔ یہ آدھا گھنٹہ ہاجرہ نے اپنی سانسیں سننے اور دھڑکنیں گننے میں لگایا تھا۔ انہیں بولنا کیا تھا کچھ خبر نہیں تھی کیونکہ انہوں نے الفاظ جوڑنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ الفاظ ہر بار ساتھ نہیں دیتے اگر دیتے ہوتے تو ان کی زبان سے نکلے ہوئے وہ تمام لفظ ان کی زندگی کے قیمتی سال برباد ہونے سے بچا لیتے اس لیے اب وہ بھی خود کو زیر بر کا مقروض ہوتے نہیں دیتی تھیں۔

دروازے پہ ہلکی ہلکی سی آہٹیں ابھریں اور چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ وا ہوا تو ہاجرہ نے آنکھیں میچ لیں۔ لب سل گئے اور سرخ ناک کے نتھنے پھولنے لگے۔ کوئی ہلکے ہلکے اور محتاط قدموں سے ان کے قریب آ رہا تھا۔ کیسا قیامت خیز لمحہ تھا جو ان پہ اترنے کو تھا۔ ان کی نگاہوں کے حصار میں حسنات کے جوتے آئے پھر وہ قدم مزید آگے بڑھے اور کمرے کی خاموش ساکن فضا میں پکار گونج اٹھی۔

"پری!"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆☆

بیوٹی باکس

سردی آئے، سنگ جلد کے مسائل لائے

موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی جلد کے مسائل بھی شروع ہوجاتے ہیں۔ اس موسم کی خشکی اور سرد ہواؤں سے جنم لینے والے مسائل سے بچنے کے لیے کچھ مشورے درج ذیل ہیں۔

☆ آدھا کپ گلسیرین، ایک چوتھائی کپ لیموں کا رس، آدھا کپ سادہ فریش کریم اور دو چائے کے چمچے عرق گلاب کو کسی پیالے میں ڈال کر مشین سے یا ہاتھ والے بیٹر سے اتنا پھینٹیں کہ وہ نرم اسفنج یا کریم جیسی شکل میں آجائے۔ اسے کسی بوتل میں یا جار میں بھرلیں۔ یہ کریم ہاتھ اور پاؤں کو پوری سردیاں نرم اور ملائم رکھنے کے ساتھ ساتھ رنگت بھی صاف رکھے گی۔

☆ روغن زیتون و سورج مکھی کو ہم وزن لے کر اس میں پچاس گرام ہلدی یا زعفران پاؤڈر شامل کرلیں اور گاڑھا پیسٹ بنالیں۔ اور پوری سردیاں اس سے چہرے کا مساج کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

☆ موسم سرما میں جسم میں خارش ہوتی ہے تو ایک تولہ املی اور ایک چمچہ گل قند رات پانی میں حل کرکے چھان لیں اور پھر نہار منہ پی لیں۔

☆ کافی کو پیا کر کیوب کی شکل میں جمالیں اور آنکھوں کے نیچے ان کیوبز کو نرمی سے رگڑیں حلقے یا بھاری پن میں کمی آتی ہے۔

☆ موسم سرما میں بالوں میں پیدا ہونے والی خشکی سے نجات کے لیے بیٹا سالک لوشن اور ٹی ٹری آئل کو ملا کر استعمال کریں۔ اس آئل کو روزانہ رات کو بالوں کی جڑوں میں لگا کر سوئیں اور صبح دھولیں۔

☆ موسم سرما میں ایگزیما جیسے جلدی مسائل دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسے لوگ میٹھا کم استعمال کریں، اس کے علاوہ انار کا جوس ایک کپ، نیم کا جوس دو کھانے کے چمچے، کالی مرچ ایک چٹکی، کریلے کا جوس دو کھانے کے چمچے، ان تمام اجزا کو صبح نہار منہ پندرہ دن تک پئیں۔

☆ جن بچوں کی جلد خشک ہوجاتی ہے ان کے لیے آپ گاجر کا جوس لے کر سرسوں یا زیتون کے تیل میں ملا کر رکھ لیں اور اس تیل سے بچوں کے جلد پر مساج کریں۔ یہ نسخہ بہت فائدہ مند ہے۔

☆ موسم سرما میں بال روکھے اور بے جان نظر آنے لگتے ہیں۔ اس مسئلے سے چھٹکارا پانے کے لیے تخم بالنگا پاؤڈر دو کھانے کے چمچے، زیتون کا تیل کا ایک پاؤ، ناریل کا تیل ایک پاؤ، کالی مرچ ایک کھانے چمچہ، روزمیری اسنشل آئل پانچ قطرے ٹی ٹری اسینشل آئل پانچ قطرے، ان سب چیزوں کو ملا کر بالوں کی جڑوں میں لگائیں اچھی طرح مساج کریں اور دوسرے دن شیمپو سے بال دھولیں۔

☆ دہی میں تھوڑا سا سرسوں یا ناریل کا تیل شامل کرکے نہانے سے آدھا گھنٹے قبل سر کا مساج کریں اور پھر نہالیں۔ بالوں کی خشکی دور ہوجائے گی۔

☆☆

چکن شملہ مرچ

اجزاء:

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
پیاز	تین عدد درمیانی
تیل	چار کھانے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	دو عدد
نمک	حسب ضرورت
سونف	ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	چھ عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	دو چائے کے چمچے
چھوٹی الائچی	چار عدد
پسا گرم مسالہ	آدھا چائے کا چمچہ
کشمیری لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک پاؤ
قصوری میتھی	آدھا چائے کا چمچہ
شملہ مرچ (ڈائس)	دو عدد
ہری مرچ	پانچ عدد

ترکیب:

ایک پین میں تیل ڈالیں۔ اس میں پسا ادرک لہسن ڈالیں۔ جب بھن جائے تو چکن اور نمک ڈال کر بھونیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر گل جائیں تو الائچی، کالی مرچ، سونف، ثابت دھنیا، ثابت لال مرچ کو گرائنڈ کر کے چکن میں شامل کر دیں ساتھ دہی بھی ڈال دیں۔ تھوڑی دیر پکا کر پسا گرم مسالہ ڈالیں اور قصوری میتھی ملا دیں پھر شملہ مرچ اور ہری مرچ شامل کریں۔ تھوڑی دیر پکا کر گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔ شملہ مرچ کو زیادہ نرم نہیں کرنا ہے۔

گاجر کا ربڑی حلوہ

اجزاء:

گاجر (کدوکش کرلیں)	ڈیڑھ کلو
بریڈ سلائس	تین عدد
دودھ	ڈھائی لیٹر
چینی	ایک کپ
گھی	دو کھانے کے چمچے
الائچی	آدھا چائے کا چمچہ
پستہ بادام	سجانے کے لیے

ترکیب:

ایک پین میں گھی اور کدوکش کی ہوئی گاجر ڈالیں اور پکائیں اور چمچہ سے ہلاتے رہیں۔ دس منٹ بعد اس میں ایک کلو دودھ ڈالیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو اس میں آدھا کپ چینی ملائیں چینی خشک ہو جائے تو الائچی پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ پکائیں اور چولہا بند کر دیں۔

ایک دوسرے پین میں آدھا کپ چینی ڈالیں بالکل ہلکی آنچ پر چینی کو کیریملائز کر لیں۔

جب چینی پگھل جائیں تو ڈیڑھ لیٹر دودھ ملا دیں چمچے سے مستقل ہلاتے رہیں پھر سلائس کو گرائنڈ کر کے اس میں ملا دیں اور دودھ گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ ایک ڈش میں پہلے گاجر ڈالیں۔ پھر اس پر دودھ کی ربڑی ڈالیں، پستہ بادام سے سجا کر فریج میں رکھ کر ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔

ٹوٹکے

☆ کھانا کھانے سے پہلے ایک یا دو سیب لے چھلکے سمیت کھالیں۔ ان شاء اللہ چند روز میں ضعف دماغ کی شکایت دور ہو جائے گی۔

☆ اگر کپڑے پر لوہے کے زنگ کا داغ لگ جائے تو داغ پر لسی ڈال کر کپڑے کو ملیں، داغ اتر جائے گا۔

☆ سرسوں کا تیل ڈراپر میں ڈالیں پھر اس سے روزانہ رات کو سوتے وقت چار سے پانچ قطرے ایک ایک کر کے ناک میں ڈالیں۔ یکدم نہ ڈالیں۔ کچھ عرصے میں یہ خراٹے ختم ہو جائیں گے۔

☆ اگر جسم کا کوئی حصہ جل جائے تو پانی میں چینی گھول کر متاثرہ جگہ پر لیپ کریں۔ پانی کم مقدار میں ملائیں۔ جس سے محلول گاڑھا رہے گا۔ اس لیپ سے جلن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

☆ پاؤں کے تلوؤں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلا کی کسی بھی تیل سے خوب مالش کریں کیوں کہ پاؤں کا نگاہ اور یادداشت سے بہت تعلق ہے۔

☆ جس کو نزلہ و زکام ہو چائے بناتے وقت ایک چٹکی خشخاش کی ڈال دے۔ نزلہ زکام ان شاء اللہ ختم ہو جائے گا۔

☆ بلغمی کھانسی کے لیے دیسی اجوائن، ہلدی اور سفید نمک تینوں کو چھ چھ گرام لے کر توے پر ہلکا سا بھون لیں اور ایک چٹکی دن میں دو یا تین مرتبہ چائے، قہوہ یا نیم گرم پانی کے ہمراہ استعمال کریں۔

☆ سردیوں میں اکثر سینے پر بلغم جم جاتا ہے۔ جو کہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے فرائی پین یا توے پر دو تین چمچے شہد کو اتنا گرم کریں جتنا آپ کی زبان برداشت کر سکتی ہے۔ رات کو سوتے وقت گرم گرم شہد چاٹ کر فوراً سو جائیں۔ پانی ہرگز نہ پئیں صبح بیدار ہونے کے بعد ہلکی سی کھانسی کے بعد بلغم منہ کے ذریعے خارج ہو جائے گا اور باقی پاخانے کے ذریعے خارج ہو جائے گا۔

☆ کھانے سے قبل اگر تھوڑا سا نمک چکھ لیا جائے تو فوراً لعاب پیدا کرنے والے زود ہاضم طعام طوبت کو مترشح کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے کھانے میں دل لگتا ہے، کھانا لذیذ لگتا ہے اور بھوک چمک اٹھتی ہے۔ اسی طرح کھانے کے بعد نمک چکھ لیا جائے تو خوراک کی نالی میں کھانے، گھی اور دیگر روغنیات کی جو تہ جم جاتی ہے نمک اس تہ کو ختم کر دیتا ہے۔

☆ پیٹ میں درد ہو تو گرم پانی کے ساتھ آدھا چمچہ اجوائن دو یا تین چٹکی نمک کے ساتھ لینا فائدے مند ہے۔

☆ قینچی پر زنگ لگ جائے تو ایک گلاس میں تھوڑا نمک، سرکہ اور بیکنگ سوڈا ملا کر تھوڑی دیر بھگو دو، قینچی نئی جیسی ہو جائے گی۔

☆ بچوں کے سفید موزے اسکول سے یا کھیل کود کے دوران اچھے خاصے میلے ہو جاتے ہیں ان پر کالے نیلے دھبے بھی ہوتے ہیں، یہ دھبے اکثر دھلائی کے دوران صاف نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ایک برتن میں گرم پانی لے کر اس میں موزے بھگو دیں اور لیموں کے دو تین ٹکڑے کاٹ کر ڈال دیں۔ تھوڑی دیر میں موزے نکھر کر بالکل صاف ہو جائیں گے۔

☆ اگر ناک بہتی رہتی ہے تو ادرک کی دھونی لینے سے ناک بہنی بند ہو جاتی ہے۔

☆ ماہواری میں روزانہ تین کھجوریں ضرور کھائیں۔

☆ پان کی پیک کا دھبا صاف کرنے کے لیے اس پر امرود رگڑیے۔

☆ کپڑوں پر اگر چائے گر جائے تو اس پر فوراً نمک چھڑک دیں، چائے کا رنگ اس پر نہیں جمے گا۔

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

القرآن

آپس کے معاملات سدھارنے کے لیے کتنی زبردست سورت الحجرات کی یہ نو باتیں، کاش ہم انہیں اپنے عمل میں لائیں۔

1۔ فتبینوا: کوئی بھی بات سن کر پھیلانے سے پہلے تحقیق کرلیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات سچ نہ ہو اور کسی کو انجانے میں نقصان پہنچ جائے۔

2۔ فاصلحوا: دو بھائیوں کے درمیان صلح کروادیا کرو، تمام ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

3۔ واقسطوا: ہر جھگڑے کو حل کرنے کی کوشش کرو اور دو گروہوں کے درمیان انصاف کرو۔ اللہ کریم انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

4۔ لا یسخر: کسی کا مذاق مت اڑاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک تم سے بہتر ہو۔

5۔ ولا تلمزوا: کسی کو بے عزت مت کرو۔

6۔ ولا تنابزوا: لوگوں کو برے القابات سے مت پکارو۔

7۔ اجتنبوا: کثیرا من الظن: برا گمان کرنے سے بچو کہ کچھ گمان گناہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

8۔ ولا تجسسوا: ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو۔

ولا یغتب بعضکم بعضا:
تم میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے کہ گناہ کبیرہ ہے اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔

آزمائش

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول، لوگوں میں سب سے زیادہ مصیبت اور آزمائش کا شکار کون ہوتا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء، پھر جو ان کے بعد مرتبہ میں ہیں، پھر جو ان کے بعد ہیں، بندے کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے، اگر وہ دین میں سخت اور پختہ ہے تو آزمائش بھی سخت ہوگی، اور اگر دین میں نرم اور ڈھیلا ہے تو مصیبت بھی اسی انداز سے نرم ہوگی، مصیبتوں سے بندے کے گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ بندہ روئے زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

(سنن ابی ماجہ حدیث: 4023)

شکر کی اہمیت

جنت میں کوئی عبادت بھی نہیں ہوگی ...... نماز ...... روزہ ...... زکوٰۃ ...... حج سب عبادتیں ختم ہوجائیں گی۔ صرف عیش و عشرت ہوگا ...... لیکن ایک عبادت وہاں بھی رہے گی یعنی شکر ...... حدیث میں آتا ہے کہ اہل جنت کے منہ سے ہر وقت حمد جاری رہے گی۔ جس طرح دنیا میں بغیر کسی ارادے اور محنت کے سانس جاری رہتا ہے ...... اس طرح جنت میں بلا اختیار حمد جاری رہے گی۔

دو تولے کی زبان

مغل شہزادے جہانگیر نے ایک دن اپنی نجی محفل میں ایک خواجہ سرا کو فارسی میں گدھا کہہ دیا۔ یہ بات اکبر بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے شہزادے کو طلب کرلیا۔ شہزادے نے غلطی کا اعتراف کرلیا۔

اکبر بادشاہ نے کہا: ''شیخو، کمہار اور بادشاہ کی زبان میں فرق ہونا چاہیے۔

شہزادے نے جواب دیا: ''ابا حضور، میری زبان پھسل گئی تھی۔''

بادشاہ نے کہا: ''بیٹا، جو شخص اپنی دو تولے کی زبان قابو پر نہیں رکھ سکتا وہ لاکھوں کوس کی سلطنت کیسے قابو میں رکھے گا؟ بادشاہت زبان سے شروع ہوتی ہے اور زبان پر ہی ختم ہوتی ہے۔ زبان کو لگام دینا سیکھو، سلطنت خود بخود لگام میں آجائے گی۔

تشویش

''میرے ڈاکٹر نے مجھے تم سے ملنے کے لیے مجبور کردیا......'' مریض نے نہایت بیزاری سے کے ساتھ ماہر نفسیات سے کہا۔'' خدا جانے کیوں، میری ازدواجی زندگی نہایت خوش گوار ہے۔ ایک شان دار ملازمت میرے مستقبل کی ضمانت ہے۔ بے شمار دوست میرے لیے خون بہانے کو تیار ہیں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''ہوں!'' ماہر نفسیات نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نوٹ بک پر جھک گیا۔'' اور تمہاری یہ حالت کب سے ہے؟''

انڈونیشیا

دنیا کا سب سے حیرت انگیز ملک انڈونیشیا ہے، جو 17500 جزائر پر مشتمل ہے۔ ان جزائر میں سے صرف 900 جزائر آباد، باقی سب غیر آباد ہیں...... یہ آبادی کے لحاظ سے ''مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ جکارتا اس کا دارالحکومت ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ جکارتا جس جزیرے پر واقع ہے اس کا نام جاوا ہے۔ اور جاوا تقریباً 130000 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے، اس جزیرے پر جتنے لوگ رہتے ہیں؟ اتنے لوگ پورے روس میں نہیں رہتے۔ جس کا رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ آتش فشاں پہاڑ انڈونیشیا میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ روزانہ انڈونیشیا کی کم از کم چار جگہوں پر زلزلہ برپا ہوتا رہتا ہے۔

برازیل کے ایمازون جنگلات کے بعد انڈونیشیا دنیا میں دوسری جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ مختلف قسم کے پرندے، کیڑے مکوڑے، جانور اور درخت پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ مختلف قبائلی لوگ اور کلچرز یہاں موجود ہیں۔

پانی کے مختلف روپ

1۔ اوپر اٹھے تو ''بھاپ''
2۔ اوپر سے گرے تو ''بارش''
3۔ جم کر گرے تو ''اولہ''
4۔ گر کر جمے تو ''برف''
5۔ پھول پر گرے تو ''شبنم''
6۔ پھول سے نکلے تو ''عرق''
7۔ قدم اسماعیل سے نکلے تو ''زم زم''
8۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی مبارک سے نکلے تو ''آب کوثر''

اختصاص

ایک زمانے میں چارلی چپلن اپنی شہرت کی انتہا پر تھا۔ دنیا اسے اس کی مخصوص مونچھوں، بوسیدہ سیاہ کوٹ، ہیٹ اور چھڑی کی وجہ سے پہنچانتی تھی۔ مگر مزے کی بات ہے کہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص ان چیزوں کے بغیر حقیقی زندگی میں کیسا دکھتا ہے۔ ایک دن وہ سڑک پر چل رہا تھا کہ ایک تھیٹر کے باہر اس نے ایک اشتہار دیکھا۔

''چارلی چپلن کی نقل کرنے کا مقابلہ!

اس نے سوچا کیوں نہ خود حصہ لیا جائے؟ اندر گیا۔ فرضی نام لکھوایا۔ اداکاری کے کپڑے پہنے اسٹیج پر چڑھ کر وہی مخصوص کردار ادا کیا اور نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ جب نتیجہ آیا تو پتا چلا کہ اصلی چارلی

چیپلن پانچویں نمبر پر آیا ہے۔
یہی تو زندگی ہے جب آپ گمنام ہوں، تو زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔

ہر مخلوق ایک نعمت

سائنس دانوں نے دو شیشے کے ٹینک لیے، دونوں میں ایک جیسا سمندری پانی بھرا...... دونوں ٹینکس میں پانی شروع میں گدلا اور غیر شفاف تھا۔ اس تجربے کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ سیپیاں (Oysters) سمندری پانی پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔

ایک ٹینک میں زندہ سیپیاں ڈالی گئیں، جبکہ دوسرے ٹینک کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی دیکھی گئی۔ جس ٹینک میں سیپیاں تھیں۔ اس کا پانی بالکل صاف اور شفاف ہو گیا، جبکہ دوسرا ٹینک بدستور گدلا ہی رہا۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ سیپیاں پانی میں موجود نقصان دہ ذرات اور جراثیم کو فلٹر کر کے اسے صاف کرتی ہیں۔ بے شک ہر مخلوق اپنی جگہ نعمت ہے۔

طالب عالم اس عہد کے

الیف اے کے ایگزام ہو رہے تھے اردو کے امتحانی پرچے میں ایک شعر دیا گیا۔ جس کی تشریح کرنی تھی۔ شعر کچھ یوں تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

ایک طالب علم جو کہ اپنی قومی زبان سے بالکل نابلد تھا اس نے اپنی فہم و فراست سے اس مشکل ترین شعر کی آخر تشریح کر ہی لی جو کچھ یوں تھی۔

"کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا محمود جس کا ایک غلام تھا ایاز ایک دفعہ بادشاہ محمود اپنے دشمن کے ساتھ جنگ کر رہا تھا لڑتے لڑتے عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ محمود نے اپنے دشمن سے درخواست کی کہ "ذرا ٹھہر جائیں ہمیں نماز ادا کر لینے دیں پھر باقی ماندہ لڑائیں لڑیں گے۔" دشمن نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

اس طرح مسلمانوں نے جلدی جلدی صفیں باندھیں اور نماز پڑھنے لگے۔ اتفاق سے جب صفیں باندھی جا رہی تھیں تو محمود اور ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے یہ بالکل لاشعوری طور پر ہوا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا۔

اب جبکہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ دشمن کو کسی نے یہ بتایا کہ اگر مسلمان نماز پڑھ رہے ہوں تو بالکل بے جان اور موم کے پتلے ہوتے ہیں۔ اگر ان کو اس حالت میں قتل کر سکو تو ٹھیک ورنہ یہ تم سب کو مار دیں گے۔ دشمن نے موقع پر بہتر جانا اور شروع سے لے کر آخر تک سب کا صفایا کر دیا۔ یوں وہاں۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز!

سنہرے اقوال

☆ زندگی کے ہر معاملے میں دو چیزیں اہم ہیں: کوشش اور نتیجہ۔ اور یاد رکھیں نتیجہ ہمیشہ اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنی مضبوط آپ کی کوشش ہے۔" (جیمز ایلن)

☆ زیادہ پروانہ کریں، نہ کسی کو ملامت کریں اور نہ ہی کسی کے پیچھے اس لیے بھاگیں کہ اسے اپنا وجود یاد دلائیں اور یہ اچھی طرح جان لیں کہ جو محبت کرتا ہے وہ نہ بھولتا ہے اور نہ بدلتا ہے۔ (گارشیا مارکیز)

☆ ناپختہ محبت کہتی ہے: میں تم سے محبت کرتا ہوں کیونکہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پختہ محبت کہتی ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ (ایرک فروم)

☆ میں ایسا شخص نہیں چاہتا جو میری خوبیوں کی وجہ سے مجھے چاہے، میں ایسا شخص چاہتا ہوں جو میری تمام خرابیاں جانتا ہو اور اس کے باوجود مجھے چاہے۔ (ارسطو سپاتو)

☆ جب کوئی عورت کتاب پڑھتی ہے تو جان لو کہ اس کے شوہر اور اولاد نے وہ کتاب پڑھ لی۔ (الامام ابن حزم)

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے

فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو پل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یاروں کے سبب یاد آئے

پھول کھلنے کا جو موسم مرے دل میں اترا
تیرے بخشے ہوئے کچھ زخم عجب، یاد آئے

اب تو آنکھوں میں فقط دھول ہے کچھ یادوں کی
ہم اسے یاد بھی آئے ہیں تو کب یاد آئے

بھول جانے میں وہ ظالم ہے بلا کا ماہر!
یاد آنے پر بھی آئے، تو غضب یاد آئے

یہ خنک رت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل کی خواہش ہے کہ محسن، کوئی اب یاد آئے

حریم سلمان کی ڈائری میں تحریر

صغیر احمد کی غزل

کبھی جو دیکھو گے ان کی لالی جناب عالی
ہماری آنکھیں جو ہیں سوالی جناب عالی

اب اور کیسا بتائیں خود کو جو بھائیں تم کو
کہ اب تو ہم نے انا بھی ڈھالی جناب عالی

عجب قرینہ، عجب مہارت ہے گفتگو میں
جو اتنے اچھے سے بات ٹالی جناب عالی

ہمارا بچپن کا یار تھا جو، وہ چاہتا ہے
ہم اس کو بولیں جناب عالی، جناب عالی

تمہاری ضد ہے تو نام بھی اب کے لیں تو کہنا
لو آج ہم نے قسم اٹھالی جناب عالی

وہ جس کی خاطر مری محبت کو رد کیا تھا
اب اس کے دل میں جگہ بنالی جناب عالی؟

جناب دنیا سے ڈر گئے نا؟ بدل گئے نا؟
ہمارے پیچھے بھی تھی یہ سالی جناب عالی

صغیر کیسے بتائیں اس کو بدن ہمارا
ہے بائیں جانب سے اب بھی خالی جناب عالی

صدف سمیع کی ڈائری میں تحریر

ایک خوب صورت غزل

خدا کے بعد میرا آخری سہارا تھا
وہ جس کو میں نے بھری بزم میں پکارا تھا

بس ایک موڑ غلط مڑ گئے تھے جیون میں
اور اس کے بعد خسارا تھا، بس خسارا تھا

فلک نے تاک کر بجلی گرائی تھی اس پر
اسی شجر پہ جہاں آشیاں ہمارا تھا

اس ایک پل کی اداسی نہیں گئی اب تک
وہ ایک پل جو تیرے ہجر میں گزارا تھا

کسی نے یونہی جو وعدہ کیا تھا آنے کا
تو راستوں کو دل وجاں سے سوارا تھا

نظر چرا کے وہ گزرے تو دل نے جان لیا
یہی تو اس سے جدائی کا استعارہ تھا

☆☆

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

موت کی ابتداء

میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ موت آتی ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں موت کہیں باہر سے وارد نہیں ہوتی وہ زندگی کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ جوں ہی کسی وجود میں زندگی ترتیب پاتی ہے۔ موت بھی اس میں پناہ حاصل کرلیتی ہے اور زندگی کو اس کے وجود سے باہر دھکیلنے کا عمل شروع کردیتی ہے۔ جس وجود کی زندگی جتنی طاقت ور ہوتی ہے وہ اتنے ہی طویل عرصے تک وہاں قدم جمائے رکھتی ہے مگر کب تک؟ آخری فتح تو موت ہی کی ہوتی ہے۔ یہ میری موت، جواب میری زندگی پر فتح پانے والی ہے، اس نے کوششوں کو آغاز اسی وقت کردیا تھا جب میں نے پہلا سانس لیا تھا۔ یوں میرا پہلا قدم بھی تھا۔ شاید میری موت کو ابھی پندرہ بیس سال مزید تگ ودو کرنا پڑتی لیکن میرے بیٹے نے نہ صرف اس کا کام آسان کردیا بلکہ ایک تہذیب کے انہدام میں اپنا حصہ ڈال دیا۔

(اختر رضا سلیمی...... جندر)

نظریے کی جگہ

نظریہ پاکستان اور مملکت پاکستان، دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق نہیں کرتے وہ ایک حادثے کے بعد کہنے لگے کہ ایک خطہ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ نظریہ بھی ختم ہوگیا۔ یہ لوگ قائداعظم اور ان کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت کی نقشے پر۔ سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ مگر یہ نظریہ تو ایک ایسی بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لیے بھری جاچکی ہے۔ اس پر آنے والے حسب توفیق عمارتیں بناتے رہتے ہیں۔ کبھی، چھوٹی، کبھی بڑی، کبھی بہت بڑی، یہی وجہ ہے کہ جب ملک نصف ہوگیا تو اس نظریے کی اہمت دوچند ہوگئی۔

(آواز دوست...... مختار مسعود)

"الحمدللہ" سے "ایکسکیوزمی" تک

ایک وقت تھا کہ بھری محفل میں اگر کسی کو چھینک آجاتی تو وہ اس شان سے چھینکتا تھا کہ درو دیوار ہل جاتے تھے اور اردگرد بیٹھی پبلک پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بلاخوف وخطر چھینکتا تھا بلکہ ایسے موقع پر وہ "الحمدللہ کہہ کر خدا کا شکر بھی ادا کرتا تھا اس کے جواب میں حاضرین جلسہ "یرحمکم اللہ" کہتے تھے یعنی اسے دعا دیتے تھے کہ خدا تم پر رحم کرے۔ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا تھا بلکہ اس کے جواب میں چھینکنے والا حاضرین مجلس کے لیے دعائیہ کلمے "یہدیکم اللہ و یصلح بالکم" ادا کرتا تھا یعنی اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کرے۔

مگر اب زمانہ بدل گیا ہے ان دنوں کیفیت یہ ہے کہ محفل میں اگر کسی کو چھینک محسوس ہو وہ کچھ اس طرح خفیف ہوتا ہے گویا اس نے الاسٹک والا پاجامہ پہنا ہوا اور یوں "اندیشہ ہائے دور دراز" میں مبتلا ہو۔ چنانچہ اس قسم کی صورت حال پیدا ہونے پر وہ چھینک کو روکنے کی کوشش میں مشغول ہوجاتا ہے۔ مگر جب چھینک، آکر رہتی ہے تو پشیماں شخص "الحمدللہ" کہنے کے بجائے ندامت بھرے انداز میں "ایکسکیوزمی" کہتا ہے۔ حاضرین مجلس "یرحمکم اللہ" کہنے کے بجائے اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔

(عطاالحق قاسمی...... روزن دیوار سے)

☆☆

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

عروہ ...... گوجرانوالہ

علم و تجربات سے مزین جو کرن کو پڑھنا شروع کیا تو پھر گرد و نواح سے بے خبر اسی سمندر میں غرق رہی۔ ماہا ملک اور مریم نور کو جاننے کا تجربہ خوش گوار رہا۔ افسانوں میں "دل آباد تم سے ہے۔ بارش میں بھیگے خط اور ریشم کے خواب" میں اچھی کاوش کی گئی ہے مگر مزید بہتر ہو سکتے تھے البتہ "غلط فہمی اور میٹھا زہر" پسند آئے۔ خصوصاً "میٹھا زہر" میں جو آج کل کی فضول تقریبات کو زیر تنقید لایا گیا اور بچوں کی ذہنی سطح پر قلم اٹھایا گیا وہ قابل توجہ ہے۔ حمیرا علی کا ناول "پیا من بھائے بھی" پسند آیا اور ساتھ ہی کچھ معاشرے کی کچھ تلخیوں نے دل کو زخمی بھی کیا کہ بہامین جیسی لڑکیاں اپنی عزت نفس کو بھی شوہر کی خاطر قربان کر دیتی ہیں اور شوہر ان کو حق دینے میں بھی اذیت سے دوچار کرتے ہیں، ناول کا اختتام اچھا رہا۔ "یادوں کے دریچے" میں محسن نقوی کی نظم "دسمبر مجھے راس نہیں آتا" نے چار چاند لگا دیے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" میں حقیقتاً موتی چنے گئے تھے جو کہ بے حد پسند آئے۔

ج: عروہ! آپ کیا سلسلہ وار کہانیاں نہیں پڑھتیں؟ ان پر آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

عشرہ مومن......ڈیرہ غازی خان

اس بار کرن ہاتھ میں تھامتے ہی ایک سرشاری سی وجود میں سرایت کر گئی (نازنین فردوس جی نے پیغام میں خوش خبری سنائی) کہ اس بار عشرہ مومن کا مکتوب چھپا تھا کرن میں، وہ بھی پہلی بار۔ اسی خوشی کو محسوس کرتے باقی بہنوں کے مکتوبات بھی پڑھے سب کے لمبے لمبے محبت اور خلوص سے گندھے جذبات الفاظ کا پیرہن اوڑھے جگمگا رہے تھے۔

مگر سب سے زیادہ دلچسپ خط قیوم فاطمہ کا تھا ان کا خط پختگی لیے ہوئے تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کا "حلال و حرام" والا اقتباس پڑھ کر شرم سی آئی کہ واقعی یہ حقیقت ہے۔ اب صفحات کا چکر پیچھے ہوا اور ماہا ملک کو پڑھا بہت ہی نفیس سی ہماری ماہا نے سچ کہا کہ پہلے دور کی بہوئیں خود کو بدلتی تھیں اور آج کی بہوئیں سسرال کو بدلنا چاہتی ہیں۔ بس ایک فرمائش ہے ماہا ملک سے کہ وہ پھر سے کوئی ناول لکھیں کرن کے لیے۔ اس کے بعد پڑھا حمیرا علی کا مکمل ناول "پیا من بھائے بھی" کمال است......

اس ناول سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ بہت خوب حمیرا علی! اب آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنا ہے میں نے۔ مزید ناول بھی کرن میں لکھتی رہیں۔ قانتہ رابعہ جی کا میکے پر لکھا افسانہ دل اداس کر گیا دل تو میکے سے ہی آباد بھی رہتا ہے اور اداس بھی آہ......

"میٹھا زہر" زہر قاتل ہیں یہ فضول رسومات۔ بہت شکریہ صدف عمر اس موضوع پر بہت کچھ لکھنا بھی چاہیے اور پڑھنے والوں کو عمل بھی کرنا ہوگا۔ "غلط فہمی" افسانہ بھی اچھا تھا۔ والدین کو اس عمر میں بہت سی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ افسانہ جس نے دل کو مٹھی میں لے لیا وہ ہے "بارش میں بھیگے خط" ماہ وش طالب نے بہت عمدگی کے ساتھ اس دکھ اور درد کو کاغذ پر اتارا جو ایک لڑکی کسی خوش فہمی کی صورت اپنے نازک سے دل میں پال لیتی ہے۔ "ریشم کے خواب" افسانہ بھی خوب صورت فلسفہ لیے ہوئے تھا۔ اور سما گل کا "جاگتا خواب" ہمیں بھی کچھ کرنے کے لیے تحریک دے گیا۔ اس بار بھی ایک سے بڑھ کر ایک افسانہ تھا دل جیت لیا ہے کرن کے افسانوں نے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن ہم ناچیز کے افسانے بھی کرن کی زینت بنیں گے۔

ج: عشرہ مومن !ان شاء اللہ...... آپ کے افسانے بھی کرن کی زینت بنیں گے۔ آپ "کرن" کے لیے لکھیں۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، حریم فاطمہ، آمنہ رئیس...... گجرات

سرورق تقریباً ٹھیک ہی لگا۔ ایویں نقص نکال کر ماڈل کا دل خراب کروں ہے ناں۔ کرن ڈائجسٹ کے مستقل سلسلے اچھے تھے ہمیشہ کی طرح۔ "اداریہ" کی باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں اور "محفل سرکارﷺ" دل و دماغ کو پر سکون کرتی ہے۔ شاہین جی انٹرویو بہت اچھے کر رہی ہیں آپ۔ ماہا ملک جی سے مل کر اچھا لگا۔ جناب بے شک آپ کے ناولز کی تعداد کم ہیں مگر آج بھی آپ کی تحریریں دل میں نقش ہیں۔ "میرے خواب ریزہ ریزہ" کی زینب کب بھولی ہے ہمیں۔ ہمارے گجرات کی عفت سحر پاشا کا بھی انٹرویو کیجیے گا اور وہ کرن میں کم رہی ہیں۔ یا میں خود ان کے گھر جا کر ریکویسٹ کروں "میری بھی سنیے" "مجھ کھاتے جیسی ایکٹرس اپنی ہے۔

"کوئے جاناں سے پرے" اچھی تحریر ہے۔ اف جناب بڑے کردار شامل ہیں۔ رائٹر جی کبھی گاؤں کے نظارے کروا رہی ہیں۔ اور کبھی ہم ایمن، اینڈی کے ساتھ لندن گھوم رہے ہوتے ہیں۔ خیر سب کرداروں کی کہانی اچھی لگ رہی ہیں۔

"قیس جنگل میں اکیلا ہے" سپرہٹ اینڈ، بہت مزا آیا پڑھ کر۔ قیس کو ایک تھپڑ لگنا چاہیے تھا۔ گھر کی انسان نے بے شرمی کی حدیں پار کر لیں۔ کمینگی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ منشاء جی نئے سال میں آپ کی بہترین تحریر کے انتظار میں رہیں گے۔ "محفلِ وفا" بہت بیسٹ جا رہا ہے لگتا ہے آئندہ دو تین اقساط میں ساری تحریر سمیٹ لی جائے گی۔ نوریا کا مجرم۔ العصر بے قصور ہے یا قصوروار اور یسمینہ تاج کی برات، وردہ کا مجرم۔ ان تمام باتوں کا شدت سے انتظار ہے "گنوا کر دل و جان ہم" ماضی کے پراسرار بھید سامنے آ رہے ہیں۔ فائزہ خاکوانی قاسم کی بیوی اور شہروز کی ماں ہیں۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ایک حیرت تو شہروز کے لیے بھی رکھ چھوڑی ہے رائٹر جی نے جب شہروز کو پتا چلے گا کہ سنہری اس کی لے پالک ماں ہے۔ اس کی حقیقی ماں سے جدائی کا سبب بھی سنہری ہے۔

"پیا من بھائے بھی" ہمیں تو لگا تھا ذوالکفل بگڑا ہیرو ہے مگر ہیرو کو چھوڑ کے آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ یہ عورتوں کی سیاست اچھے اچھوں رلا دیتی ہے۔ مجھے تو اب ڈائجسٹ کی تمام کہانیاں سچ لگتی ہیں۔ ان کے کردار لفظوں کے گھاؤ کچھ بھی حیران کن نہیں۔ "شکستہ دریچے" گل مہر کی موت کا افسوس ہوا ہر کہانی ہر قصہ کا کوئی ریزن ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔ بھاگ کے شادی کر لی۔ لوگ وجہ نہیں دیکھتے کہ اتنی بڑی بات کے پیچھے کیا کہانی ہے۔ زندگی اس پر کتنی تنگ ہو چکی ہوگی کہ اس نے یہ قدم اٹھا۔ خودکشی کر لی۔ بھاگ گئی۔ چلو مان لیا ہلکے کردار کی لڑکیاں کر بھی لیں۔ مگر اکثر ان کہانیوں میں صرف عشق معشوقی ہی نہیں ہوتی۔ حساس مرد، عورت دونوں کو اپنے اس فعل کا ہرجانہ دینا پڑتا ہے۔ اور یہ دنیا بے حسوں سے بھری پڑی ہے۔

اس بار کرن افسانے چھ لگے تھے۔ قانتہ رابعہ ہمیشہ کی طرح دل کو چھو لینے والی تحریر۔ مختصر مگر پر اثر۔ "میٹھا زہر" اچھا میسج ہے۔ "غلط فہمی" اے کاش ہر گھر میں ایک نادر، قادر جیسے فرماں بردار بیٹے ہوتے۔ خیر اب اس دنیا میں اتنا بھی اندھیر نہیں چھپا ہوا ہے اس دنیا میں ماں باپ کا نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ "ریشم کے خواب" پلوشہ بیگم کی طرح اکثریت ایسا ہی کرتی ہے۔ مگر اب تو ہم بھی زیادہ فینسی ڈریس چھوڑ کے باقی گھر میں پہن لیتے ہیں۔ اب کسی فیشن کے انتظار میں سوٹ کا ڈیزائن پرانا کر دے اور بھری محفل میں مذاق بن جائے۔ "اک جاگتا خواب بھی" اچھا تھا اب ہر کوئی اس دنیا میں سونے کا چمچہ لے کر تو پیدا نہیں ہوتا کہ ہاتھ لگاؤ تو مٹی سونا بن جائے۔ خیر محنت میں عظمت ہے۔ محنتوں کا پھل کھانا نصیبوں کی بات

ہے جناب۔

"کرن کتاب" بیوٹی باکس کی ٹپس میرے لیے بڑی فائدہ مند ہوتی ہیں۔ کرن کتاب کے ٹوٹکے بھی فائدہ والے لگے تھے۔ سبز الائچی کا پودا گھر میں لگانا چاہتی ہوں۔ بڑی مہنگی ہوگئی۔ "کرن کرن خوشبو" رجب اللہ پاک کا مہینہ ہے۔ اس حوالے سے احادیث دینی تھیں۔ "نجا مراثی کا بدلہ" اچھا تھا۔ یادوں کے دریچے دسمبر کے نسبت بہت اچھی ڈائری تھی۔ حلال اور حرام۔ بھئی پاکستانی تو پھر پاکستان ہے ناں! نور راجپوت کا "انسان" اقتباس پسند آیا۔

"نامے میرے نام" جاتے دسمبر میں آپ نے مجھے خوش کر دیا۔ بہت بہت شکریہ۔ اللہ پاک آپ سب کو خوشیوں سے نوازے۔ میں بڑی مشکلوں سے خط پوسٹ کرتی ہوں۔ اس بار آمنہ میر رئیس اور موسیٰ قادر کو اسکول چھٹی ہوئی تو ڈاک خانہ جا کر خط پوسٹ کیا۔ اور آمنہ ہر بار ٹوکتی ہے خالہ جان لفافہ نہیں کہتے انویلپ کہتے ہیں۔ لو جی پڑھائی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ اب کیا لفظوں کا رٹا ہے۔ اس بار ڈائجسٹ لینے گئی تو ایک لڑکا بائیک پر تھا۔ ڈائجسٹ لینے آیا تھا۔ "کرن" میں نے پوچھا کیا لکھتی ہیں۔ کہتا ہے پتا نہیں۔ پوچھا اس لیے تھا۔ شاید کوئی قاری بہن مل جائے! ہائے کاش! کوئی مجھے بھی پوچھے آپ کرن ڈائجسٹ میں لکھتی ہیں۔ چلو رائٹر نہ سہی۔ اس کے قدردان تو ہے ناں ہم جناب۔

اقصیٰ شہزاد میرے والدین سمیت آپ کے بھائی اور سب کے مرحومین کی بخشش و مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔ آمین

گوشی جمال ویلڈن! بہت اچھا تبصرہ کیا اور ساگ کی گھوٹتے میں دیسی کا راجا بھی گھونٹ دیا۔ ویسے یار قسمے گاؤں کے لوگ اور شہر کی اکثریت سردیاں شروع ہوتے ہی اس نمانے ساگ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے۔ جس دن ساگ پکانا ہے۔ آس پاس گھروں کو بھی یہ تبرک ضرور دینا ہوتا ہے۔ مجھے تو زہر لگتا ہے۔ ہاں پالک بہت پسند ہے ویسے گوشی جمال السی، تل، چاول کی پنیاں نہیں بنائی۔ کیا؟ اور کبھی ایسے ہی اپنے گاؤں کا تبصرہ لکھنا مزے دار کر کے جیسے گڈی آپا گھوٹتے ساگ پر دیسی گھی کا تڑ تڑ تڑ کا لگائے گئیں۔ بھئی اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ اب مجھے زہر لگتا ہے تو کیا سب کھانا چھوڑ دیں۔ اور بھٹہ پر تو میں جان دیتی ہوں۔ آدھی رات کو بھی مل جائے تو ناں نہیں کرتی ہے۔ قیوم فاطمہ ویلکم جناب خوش آمدید۔

لو جی زندگی عزیز کا ایک اور دسمبر اختتام کو پہنچ گیا کچھ کھٹا کچھ میٹھا دکھوں کو بھگتتے بھگتتے کہیں سے خوشیوں کی بارش ہو جاتی ہے۔ کم کو زیادہ جانتے ہوئے آتی جاتی سانسوں کی مالا سنبھالے ہوئے ہیں۔ زندگی چار دن ہے۔ سنا تھا اب جب کہ زندگی پونے چار کی رہ گئی ہیں تب فقرے کی سمجھ آئی ہے ہائے ہاہاہا۔ صد شکر اللہ پاک کا، رحمت کے دروازے کھولے ہیں اس نے۔ اپنا قرب اپنی سمجھ عطا فرمائی ہے۔

تمام ادارے کو اسٹاف کو کرن کی رائٹرز قارئین سب کو سال نو کی مبارک ماہ رجب کی مبارک۔

ج: فوزیہ! ہمیں اندازہ ہے کہ قارئین کتنی مشکل سے "کرن ڈائجسٹ" پر تبصرہ لکھ کر ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی خط دیر سے موصول ہوتا ہے تو اسے ہم اگلے ماہ کے شمارے میں شائع کر دیتے ہیں۔

اقصیٰ ناز......تلہ گنگ

کرن کی ماڈل اچھی لگی۔ کورین دیکھ دیکھ کے دل اوب گیا تھا۔ یہ ماڈل بھا گئی۔ آپی پہلے کی طرح ماڈل کا نام بھی بتایا کریں نا۔

"اداریہ" لفظ لفظ سچا...... ماہا ملک کا سفر بہت اچھا لگا۔ یہ لکھتی بھی اچھا ہیں۔ ان کا ناول "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ مریم نور سے مل کر اچھا لگا۔ نگہت سیما بلاشبہ بہت اچھی رائٹر ہیں۔ لیکن ان کا یہ ناول ابھی تک تو رکا ہوا لگتا ہے۔ چوتھی قسط ہوگئی لیکن ابھی تک لگتا ہے جیسے ابھی شروع ہوا ہے۔ "بارش میں بھیگے خط" منفرد سا یہ

افسانہ اچھا لگا۔ جس کے نام خط لکھے جا رہے تھے اسے کچھ پتا ہی نہیں ...... لیکن شکر ہے روزینہ نے بینا کی بات مان لی۔

ام اقصیٰ کا مکمل ناول "شکستہ در یچے" بہت پسند آئی کہانی۔ لیکن قیس نے مہر کو مار کے اچھا نہیں کیا۔ اور اگر ایسوں کا یہ انجام اچھا ہے تو جو ایسوں کو لائک اور فالو کرتے ہیں ان کا انجام تو اس سے بھی بھیانک ہونا چاہیے۔ ویسے لوگوں نے خود ہی تو "لائکس" اور "فالو" کر کے اسے اکسایا ایسا کرنے پر ورنہ اگر اس کے فالورز زیادہ نہ ہوتے تو وہ آگے بھی نہ بڑھتی۔

"دل آباد تم سے ہے" فاتحہ رابعہ کے افسانے بہت سبق آموز ہوتے ہیں۔ یہ بھی پسند آیا۔ جن چیزوں سے رومی کو چڑ تھی۔ شادی کے بعد انہی چیزوں سے گھر کو سجایا ہوا تھا۔ "قیس جنگل میں اکیلا ہے" منشا جی کہانی کا نام تو بہت اچھا رکھا۔ واقعی قیس تو اکیلا ہی رہ گیا حالانکہ بے چارے نے کوشش تو بہت کی کہ "عجی یا تہر" دونوں میں سے کوئی ایک ہاتھ آ جائے۔ لیکن بے چارے کی اپنی قسمت۔

"رومان" اور "عجی" کے ملنے کی خوشی ہوئی وہیں "مہر" اور "اطلس" کے ملنے کی ڈبل خوشی ہوئی۔ اور تیسری خوشی کہانی ختم ہونے کی ہوئی ...... آپی یہ ناولٹ تو ہو گیا ختم۔ اب اس کی جگہ کسی اچھا سا لکھنے والی رائٹرز کی کہانی لگائیے گا۔

"غلط فہمی" شکر ہے نادیہ کو غلط فہمی ہی ہوئی تھی جو بالآخر دور ہو گئی۔ "یاسمین بھائے بھی" حمیرا علی کا ناول ویسے تو اچھا لگا۔ لیکن ذوالکفل کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر بہامین سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ تو اسے اتنی اذیت کیوں دی؟ اور "بہامین" کچھ عجیب سا نام نہیں ہے۔ نہ ان دونوں کا کوئی سین ہوا۔ میں تو انتظار ہی کرتی رہی اور کہانی ختم ہو گئی، اینڈ پہ دو چار باتیں کیں دونوں نے "میٹھا زہر" صدف عمر کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ اور یہ بات ہے بھی سچ کہ کوئی بھی بات ہو تو بچوں کے سامنے کر دو کہ کیا ہوا بچے ہی

تو ہیں انہیں کیا سمجھ ...... آج کل کے بچے بہت ایڈوانس ہو گئے ہیں۔ اب باری آئی ہے میرے فیورٹ ناول کی ...... جس میں "میران" اور "زعنین" دونوں ہی میرے فیورٹ ہیں۔ لیکن دونوں کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے کہ پتا نہیں میران کو کیا کام ہو گا زعنین سے ...... پلیز فرح جی کچھ تھوڑا سا رومینس دکھا دیں۔

"ریشم کے خواب" بھئی پلوشہ بیگم عجیب تھیں۔ اتنے اچھے کپڑے ایسے ہی رکھے ہوئے تھے خاص موقعوں کے لیے۔ مجھ سے تو نہیں صبر ہوتا۔ نیا سوٹ پڑا ہو اور کوئی موقع نہ ہو تو گھر میں ہی پہن لیتی ہوں۔

ہاہاہا۔ "گنوا کر دل و جاں ہم" آپی مزے کی بات بتاؤں اس مہینے میں یعنی دسمبر میں ...... میں نے دو دن لگا کے یہ کہانی پوری پڑھ لی۔ اففف یقین کریں اتنا مزا آتا تھا جب ایک قسط ختم ہو جاتی تھی تو اگلی لے لیتی۔ اور جب سب ختم ہو گئیں تو اتنا افسوس ہوا کہ کچھ مہینے اور رک جاتی جب یہ ختم ہو جاتی کہانی ...... تب پڑھتی بہت مزے کی ہے یہ اسٹوری۔

سارے تجسس ختم ہو گئے لیکن دو ابھی باقی ہیں۔ سنہری نے کس کو قید کیا ہوا ہے ...... اور جب حویلی میں آگ لگی تھی تو قاسم نے کس کو بچایا تھا؟ آپی ام طیفور سنہری کا انجام اچھا نہیں ہونا چاہیے۔ بہت عیش کر لیے اس نے حسنات اور خانم دوبارہ روبرو آ گئے ہیں۔ پتا نہیں خانم حسنات کو معاف کرے گی کہ نہیں؟ یہ بھی اب لگتا ہے ختم ہونے کو ہے۔ "اک جاگتا خواب" پورا ہو گیا۔ کچھ کرنے کا جذبہ ہو تو راستے خود بخود ہی بنتے چلے جاتے ہیں۔

"کرن کے دستر خوان" سے گاجر اور سوجی کا حلوہ پسند آیا۔ حلوے سے یاد آیا ہم نے پیٹھے کا حلوہ بنایا ہے میں نے تو صرف چکھا ہی ہے کیونکہ مجھے حلوہ نہیں پسند جبکہ امی بتا رہی تھیں کہ تم لوگ (مطلب میں اور بھائی بجیل) چھوٹے ہوتے تھے۔ اور ہم نے پیٹھے کا حلوہ بنایا۔ تم دونوں باہر سے آتے تو حلوہ کھاتے ...... اور ہم نے جب دیکھا مطلب امی

لوگوں نے تو آگے سے حلوہ ہی ختم۔ ہاہاہاہا۔
"ٹوٹکے" ہر بار کی طرح اچھے تھے۔ "کرن کرن خوشبو" "مٹی پہ سونے والا شہنشاہ۔ بدلہ۔ نیلسن منڈیلا۔ اور شہد کی مکھی اچھے لگے۔ اقصیٰ ناصر کی غزل اچھی لگی۔ "کچھ موتی" "ایک موتی بھی نہیں پڑھا۔ "نامے میرے نام" سب بہنوں کو السلام علیکم پرانی سب کہاں گئی ہیں۔ اب تو نئے نئے نام دیکھنے ملتے ہیں۔ آپی آپ سب سے ایک بات شیئر کرنی ہے۔ میرا بڑا بھائی دوبارہ سے سعودیہ چلا گیا ہے چھ سال کے بعد پہلے بھی ادھر ہی ہوتا تھا اور آپی تھوڑی تھوڑی سردی آ گئی ہے۔ ان دنوں میں مونگ پھلی کھانے کو بہت دل کرتا ہے۔ کیا آپ کا بھی کرتا ہے؟ اور آپی آپ پاس ہوتیں تو میں آپ کی طرف ساگ اور مونگ پھلی بھیجتی۔ ہمارے گاؤں کی خاص سوغاتیں۔

ج: اقصیٰ شہزاد! اللہ آپ کے بھائی کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین سردیوں میں مونگ پھلی سب کو اچھی لگتی ہے۔ ہمیں بھی لگتی ہے۔ آپ نے بھیجنے کے لیے سوچا آپ کی یہ محبت ہی کافی ہے ہمارے لیے۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

نومبر کا شمارہ ملا کرن سب شماروں سے لیٹ ملتا ہے لیکن پھر بھی اس کا انتظار مزا دیتا ہے۔ "برکی کبوتری" کلرفل کپڑوں میں ماڈل اچھی لگی پہلے کئی شماروں میں آبشار کرائے ماڈل تھیں یہ تبدیلی اچھی لگی۔ "اداریہ" دل کو بھایا اپنے فیلڈ مارشل عاصم منیر اور شہباز شریف پر فخر محسوس ہوا۔ وطن عزیز کے برے حالات سن سن کر پریشان تھے اب یوں لگا کہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا "نعت" کا یہ شعر دل پر ٹھک گیا۔

یہ شان تمہاری ہے آقا تم عرش بریں پر پہنچے ہو
ذیشان بنی ہیں سب لیکن معراج کا دولہا کوئی نہیں

ریحانہ اعجاز کا سفر پڑھا۔ جتنی بھی سلجھی ہوئی لڑکی ہو سسرال تو پھر سسرال ہے۔ سب کو لف ٹائم دیتا ہے۔ نگہت سیما کی "کوئے جاناں کی سیر کی"۔ ماورا طلحہ کا "چراغ جلتا رہا" نمبرون کہانی تھی۔ معصوم لڑکیاں جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر مخلص رشتوں سے دور ہو جاتی ہیں۔ شکر ہے ملیحہ صاحبہ مار مور کھا کر منزل پا گئیں۔ "فرصت" عورت کے نصیب میں ہو...... ناممکن گھرداری میں پھنس کر اپنا واحد شوق رسالے پڑھنا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ "گنوا کر دل و جاں ہم" میں چلو جی زل صاحبہ دلہن بن گئیں۔ "ٹوٹی فروٹی محبت" یہ پیاری کہانی تھی میاں بیوی کی محبت تعاون روٹھنا منانا سب شامل تھا۔ سبق تھا کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔ جنگل والے قیس کی بیوی مر گئی یہ ظلم کیا ہے منشا محسن علی نے اب تو قیس اکیلا رہے ہی رہے کیونکہ عذرا رومان کی بن رہی ہے امر اور اطلس کے ملنے کا سبب بن رہا ہے خوشی ہوئی" عشق شہر کا شانی کہانی" پسند نہیں آئی۔ "خزاں کے بعد" کرنی ہی بھرنی کہانی تھی دوسروں کی بیٹی کو دکھ دو گے تو اپنی بیٹیوں کو بھی ملے گا۔

ج: زرینہ خانم! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ڈائجسٹ بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ کہانی ذرا سی اور بہتر کر کے لکھیے۔ ان شاء اللہ پھر ضرور لگائیں گے۔

کوثی جمال...... منڈی یزمان

فیروزی کلر سے سجا ٹائٹل کرن کی دلکشی میں خاطر خواہ اضافہ کر رہا تھا۔ لحاف اوڑھ کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے، سائیڈ دراز پہ زوبار یہ حسب روایت بڑا مگ چائے۔ بوائل انڈہ رکھ گئی۔ مطالعہ کا تڑکہ، دلچسپی کا سامان بڑھا رہا تھا۔ کھڑکی کے پردوں کی سنسناہٹ سے دھیان باہر کے موسم کی جانب لگا۔ شمارہ دراز پہ رکھا۔ خالی مگ اٹھا کر باہر تار پہ لٹکے کپڑے جلدی جلدی اتارے ورنہ صبح تک ان سے پانی ٹپکتا تھا۔ برآمدے میں بچھی چار پائیوں پہ بچھا دیے۔ فہرست کو اچھی طرح گھورا۔ "حمد و نعت" سے قلب کی بے چینی اور بے سکونی میں خاطر خواہ سکون میسر آیا۔ "اداریہ" کی بات سے

100 فیصد متفق ہوں۔فہرست میں پچھلی بار کی طرح اس بار بھی ایک کمی محسوس ہوئی جی ہاں! زیتون بیگم اس بار بھی غائب۔جو تحریر شمارہ میں شامل نہیں کرنی ہوتی اس کا جھانسہ جھلکیوں میں کیوں دیا جاتا ہے؟ کرن کی یہ خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں نامے میرے نام میں خط اپنی اصلی خدوخال سے شائع ہوتے ہیں اس لیے یہاں تفصیلاً تحریر کرنے کا مزا آتا ہے۔محنت وصول ہو جاتی ہے۔کبھی کبھی ایڈٹ کرنا ادارہ کی مجبوری سمجھ میں آجاتی ہے لیکن ہر بار ایڈٹ پھر اوپر سے حوصلہ شکنی۔خط کا مزا نہیں آیا۔یہ چیز کم تھی وہ کم تھی ہزار عیاں عیب گنوا دینا۔خیر کوئی گل نہیں اسی وی بڑے ڈھیٹ آں..... ماہا ملک کی قسط وار ملاقات نظر آئی۔"بہو سے ساس تک کے سفر" میں عمدگی سے 2023 سے ساس کے عہدے پر آن پہنچی ہیں اللہ دونوں بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔بہترین تحاریر کا کریڈٹ مضبوطی سے تھامے ہوئے۔میں نے ان کی پہلی تحریر "جو چلے تو جان سے گزر گئے" سے پائی فیض یابی۔ان سے نئے والا ڈرامہ بھی شوق سے دیکھا۔نعمان اعجاز،صبا قمر اور جاناں ملک نے اپنے کرداروں سے پورا پورا انصاف کیا۔"میرے خواب ریزہ ریزہ" نے بھی ملک گیر شہرت پائی۔ملاقات کا بقیہ حصہ نئے سال میں ملاحظہ ہوگا۔کچھ نام ہیں جنکی ادارہ سال میں ایک لازمی تینوں پرچوں میں سے ایک پرچے پہ لازمی سنواتا ہے۔ان کی قطار میں مریم نور پھر سے براجمان ہیں بہت سی باتیں ازبر ہیں باقی سرسری نظر گھمائی۔اچھی اداکارہ ہیں۔"بارش میں بھیگے خط" کافی عرصہ کے بعد ایسی بہترین تحریر پڑھنے کو ملی۔ماہ وش طلب ویلڈن۔"قیس جنگل میں اکیلا ہے" بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا۔دس ماہ کی مشقت کارگر ثابت ہوئی۔ہادی معصوم پہ ڈھیروں ڈھیر پیار آیا۔مہر کا بہترین فیصلہ اچھا لگا۔"گنوا کر دل و جان ہم" یہ قسط شاندار اور جاندار تھی۔"شکستہ دریچے" اچھی تحریر لیکن افسردہ کر گئی۔شاید ان دنوں میری طبیعت افسردہ ہے اس لیے دکھی تحاریر دل کو زیادہ لگتی ہیں۔

ج: گوشی جمال! جس وقت ہم اشتہار تیار کرتے ہیں ہمیں صفحات کا اندازہ نہیں ہوتا۔قسط وار کہانی ہو تو ایک صفحہ کم پڑ رہا ہے تو کم کر دیا۔اگلے ماہ لگ جائے گا۔مکمل کہانی مکمل ہی لگانی ہوتی ہے۔نہیں بچتے صفحات تو مجبوری ہے۔

فرخندہ سلیم فہمیدہ......ملتان

موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی زندگی میں ایک عجیب سی ٹھہراوٹ اور سکون اتر آتا ہے۔اگرچہ اب سردی زیادہ برداشت نہیں ہوتی، مگر پھر بھی سرد راتوں کا اپنا ایک الگ ہی مزا ہے۔ہلکی روشنی، کمرے کی خاموش فضا،اور ہاتھ میں گرم چائے کا کپ.....ایسے ماحول میں بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھنا دل کے سکون کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔مجھے ہمیشہ سے لگتا ہے کہ چاہے ٹیکنالوجی کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، کتابوں......خصوصاً ڈائجسٹوں......کا اپنا ایک لازوال جادو ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔یہی وہ سحر ہے جس نے ہر دور میں ہمارے دل کو راحت بخشی ہے۔ان کی تحریریں نہ جانے کتنی بار لبوں پر مسکراہٹ لے آئیں، کتنی بار ہماری سوچ کے زاویے بدلے، ہماری غلطیوں کی نشاندہی کی، اور ہمیں ایک بہتر انسان بننے میں مدد دی۔جب بھی دل پریشان ہو یا ذہن الجھا ہوا ہو، ڈائجسٹ کے سلسلے اور کہانیاں ایسی ٹھنڈی ہوا کی طرح لگتی ہیں جو دل کے اندر امید کا چراغ جلا دیتی ہیں۔کبھی کسی خوب صورت اقتباس پر آنکھ رک جاتی ہے، کبھی اداریہ میں مدیران کی سنجیدہ اور تعمیری باتیں دل کا حصہ بن جاتی ہیں۔قارئین کے خطوط ہوں، لکھاریوں کی پیاری باتیں، کرداروں کی ہنسی مذاق سے بھری گفتگو یا مصنفین کی منظر کشی...... ہر چیز دل کو زندگی کا دوسرا چہرہ دکھاتی ہے۔

ساس بہو کا سلسلہ بھی اچھا ہے، لیکن دل میں خواہش ہے کہ قارئین خود بھی اپنے پسندیدہ مصنفین

کے لیے سوالات بھیج سکیں اور ہر دو ماہ بعد ایک تفصیلی سوال نامہ شائع کیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر تاریخ کے موضوع پر بھی کوئی معلومات مگر دلکش سلسلہ شامل کیا جائے تو یہ بھی کرن ڈائجسٹ کی خوب صورتی میں اضافہ کرے گا۔

دو ماہ سے حاضر مصروفیت کی بنا پر نہیں ہو سکی اور اب سوچا تفصیل سے باتیں کرلوں تو اکتوبر کا سرورق تو مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا سنہری دلکش سا کرن کا ماڈل کا پیلے رنگ کا سوٹ بھرا ہوا سا اچھا تھا۔ ہاں سرورق تو نومبر کا بھی اچھا تھا ماڈل کا چنری کے اسٹائل کا لباس پر بال انگریز لڑکیوں کی طرح تھے جو اچھے نہیں لگے۔ پلیز اے آئی کو یوز کرتے ہوئے بھی اس بات کا خیال کیا کریں کہ مشرقی انداز کا سرورق ہو۔ دسمبر کا سرورق سال کا آخری بھی بہت حسین تھا جو بہت پسند آیا، کافی وقت سے دلہن والے سرورق نہیں دیے تو اب سال نو یا سالگرہ نمبر میں کوئی دلہن کا بے حد سجا ہوا سرورق دے دینا۔

نگہت آپا کا سلسلہ وار ناول تو آغاز سے ہی بہت پسند آرہا ہے کہ موضوع اس قدر اہم ہے اور کردار نگاری کے ساتھ منظر نگاری عمدہ ہے وہیں کردار زیادہ بھی ہیں مگر انداز آسان ہے۔

منشا محسن علی کو ناول کے اینڈ پر مبارک باد کہ کہانی ہر ماہ عرق ریزی سے چلتی رہی۔

"نخلِ وفا" ذرا سست روی سے چل رہا ہے اور شادیوں کا سیزن ہی ختم نہیں ہو رہا ہے میران اور اس کی بیوی کا بلاوجہ اترانا پن پڑھ کر اب اکتاہٹ ہوتی ہے۔ کیا نوپرا کی اولاد کا باپ انصر ہے؟ ضرور بتانا کہ وہ تو کسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی نا۔ فرح کہانی ذرا آگے بڑھالیں اب۔ ام طیفور کو دس میں سے دس نمبر دیتی ہوں۔ عرق ریزی سے کہانی چل رہی ہے اور اس قسط میں حسنات اور خانم کی ملاقات کا آخری سین پڑھ کر خوشی مگر اداسی بھی ہوئی کہ خانم نے کتنا انتظار کیا۔ رائٹر کے لکھنے کا انداز اور الفاظ کا چناؤ بہت ہی اچھا ہے۔

ام اقصیٰ کی کہانی کا موضوع بہت ہی اہم تھا جو حقیقت ہے گل مہر کی داستان پڑھ کر بہت دکھ ہوا مگر یہ سب معاشرے میں ہی ہوتا ہے رائٹر نے اس کہانی سے ایک بہت اہم پیغام کو اجاگر کیا ہے جو آج کی ضرورت ہے ورنہ یہ قتل و غارت کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ مجھے یہ تحریر بہت پسند آئی۔

حمیرا علی کی اس سے پہلے والی کہانی بھی مجھے پسند آئی تھی اور یہ کہانی بھی گھریلو سی تھی اس وجہ سے شوق سے پڑھی۔ بہامین کے ساتھ جو مشکل وقت گزرا۔ کرداروں کے نام بہت اچھے اور منفرد سے تھے اور پلاٹ بھی اچھا تھا پھر اینڈ بھی خوش گوار تھا تو پڑھ کر تسلی سی ہوگئی۔

"نامے میرے نام" میں عشرہ مومن، عرفانہ رحمان اور قیوم فاطمہ کو کرن میں آمد پر سب کی طرف سے خوش آمدید۔ اب آتے رہنا ہے۔ کوثی کے خط پڑھ کر خوشی ہوئی وہ بہت باہمت لڑکی ہے جو عزت دار طریقے سے روزگار بھی چلا رہی ہے ورنہ خواتین کے لیے دکان سنبھال لینا مشکل ہوتا ہے۔ دعا ہے کوثی ہمیشہ شاد رہے اور اس کو آنے والی زندگی میں بہت سی خوشیاں ملیں، پریشانیاں دور ہوں اور باقی بھی کرن کی ساری پڑھنے والیوں کے لیے یہ دعا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ کے طویل و دلچسپ تبصرے پڑھ کر مجھے لکھنے میں تحریک ملی ہے جو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اقصیٰ شہزاد بھی مستقل تبصرہ نگاری عرق ریزی سے کررہی ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ اب بھی نوجوان بچیاں ڈائجسٹ کو شوق سے پڑھتی اور سیکھتی ہیں، جیتی رہو۔

زرینہ خانم باجی شفیق سی طبیعت کی مالک ہیں جن کو عرصے سے ڈائجسٹوں کے توسط سے جانتی ہوں کہ گہرائی سے تبصرہ کرتی ہیں۔

ج: فرخندہ! آپ نے بہت اچھا لکھا۔ ایڈیٹنگ کرتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔ مگر وہی مجبوری صفحات کی کمی۔

☆☆